اِک بار ملو ہم سے
اقبال بانو

اقبال بانو کی تحریریں

اچھی تحریر پڑھنے والوں کے لئے اقبال بانو کا نام نیا نہیں۔ پاپولر فکشن کے میدان میں بانو نے اپنی بے شمار تحریروں کے ذریعے برسوں قارئین کے ذہن و دل کو خوب صورت تاثرات کے ساتھ چھوا ہے۔ ان کی تحریر کی خاص بات "محبت" کی سچائیوں پر کامل یقین ہے۔ بانو کے کردار محبتوں اور چاہتوں کے رس سے گندھے نظر آتے ہیں۔ بانو کے کردار محبت کی خاطر قربانیوں کی تاریخ میں اچھوتے باب رقم کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو یہ ماننے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ محبت کے جذبے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کُل عالم کو فتح کر سکے۔

بانو کو ہم نے ہمیشہ شوق سے پڑھا ہے اور ان کی تحریروں کو قابلِ مطالعہ پایا ہے۔ ان کا تحریری سفر جاری ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ پختگی اور شعور کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ جب تک بانو کا قلم اچھی تحریر تخلیق کرتا رہے گا، اچھے ادب کو پڑھنے والوں کو قابلِ مطالعہ کہانیاں اور ناول پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ خدا اقبال بانو کے قلم کو ہر دم رواں اور تر و تازہ رکھے۔ آمین!

عنیزہ سید

درد کے تنہا موسم میں

کالج کا ہال طالبات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج یہاں سالانہ کانووکیشن تھا، جس کی صدارت صوبائی وزیر سیف الرحمٰن نیازی کر رہے تھے۔ ایسی زنانہ تقریب میں ایک مرد کی آمد کسی کو بھی بری نہیں لگتی، جبکہ وہ وزیر بھی ہو۔ اور تقریب کا اہتمام کرنے کے سلسلہ میں ایک معقول رقم بھی ادارہ کے حوالے کی ہو تو ایسے "مرد" کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔

وزیر صاحب یقیناً عمر کی پچاس بہاریں تو دیکھ ہی چکے تھے۔ وزارت کا "ٹیکا" پھر جاگیرداری کا رعب۔ چہرے پر دولت کی چمک اور چمچماتی ہوئی وہ سیاہ ناگن جیسی کار بھی تھی، جس پر جھنڈا لگا ہوا تھا اور جھنڈے والی کار اُن کی وزارت کا ثبوت بھی تھی۔

موصوف خواتین کی محفلوں میں خاصے مشہور تھے اور محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ مگر آج تو تقریب خالصتاً "بچیوں" کی تھی، جس کی وہ صدارت کر رہے تھے۔

تقریب کا آغاز کرتے ہوئے فورتھ ایئر کی شوخ، خوب صورت، دھان پان سی نرگس جمال نے کمپیئرنگ کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے سب کو خوش آمدید کہا۔ اور پھر تلاوت کلام پاک ہوئی۔ اور اس کے بعد نرگس جمال نے مہمانِ گرامی کو اسٹیج پر آنے اور اپنی نشست سنبھالنے کی دعوت دی۔

نرگس جمال کا لہجہ، لہجے کی نرمی، لفظوں کا چناؤ، جملوں کی ترتیب، چہرے کی ملاحت، آنکھوں کی چمک نے سیف الرحمٰن نیازی کو نشست سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی سنبھالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

آج عرصے بعد ان کا دل اس قدر شدت سے دھڑکا تھا، جیسے محبت کا پہلا پہلا احساس پا کر بتیس برس پہلے پسلیوں کے درمیان اس دل نے واویلا مچایا تھا۔

انہیں لگا تھا، جیسے وہ ایک بار پھر جوان ہو گئے ہوں۔

وہی جذبے اور وہی ولولے دل میں اُمڈ آئے کہ جب آتش جوان تھا تو فرخندہ احمد کو دیکھ کر ان کے دل میں مچلتے تھے۔ اپنی کیفیت پر وہ حیران تھے۔

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے......؟

وہ نرگس جمال کی طرف نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر جونہی وہ مائیک پر پہنچتی، اُن کی نظریں بے ساختہ ہی اُس کی جانب اُٹھ جاتیں۔ لمبی سی سیاہ چوٹی، جو اس کی پشت پر ناگن کی طرح لہرا رہی تھی، وہ سیف الرحمٰن نیازی کو ڈسنے لگتی اور وہ پہلو بدل کر رہ جاتے۔

انہیں کچھ پتہ نہ چلا کہ کب سپاس نامہ پیش ہوا۔ کیا مسائل کالج کے بتائے گئے۔ ان سے کن کن چیزوں کی، کتنی گرانٹ کی فرمائش کی گئی۔ چونکے تو اس وقت جب انہیں نرگس جمال، طالبات سے خطاب کی دعوت دے رہی تھی۔

وہ اُٹھے اور ڈائس پر آ گئے۔ تالیاں گونجیں۔ تبھی ایک سفید پرچہ اُن کے سامنے آ گیا۔

اُن کے پی اے نے حسب سابق تقریر لکھ دی تھی اور اب وہ اُن کے سامنے پڑی تھی، جو انہوں نے پڑھ ڈالی۔ ہمیشہ کی طرح کوئی خوب صورت بات اور جملہ انہوں نے اس تقریر میں شامل نہ کیا تھا۔ بس آخر میں انہوں نے نرگس جمال کی کمپیئرنگ کی بہت تعریف کی اور اس کے لئے خصوصی انعام کے طور پر پانچ ہزار روپے کا اعلان کیا اور زبردست تالیوں کی گونج پر۔

نرگس جمال کہہ رہی تھی۔

"صدر محفل کا بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے میری کمپیئرنگ کو پسند کیا ہے۔ مگر اب آپ بیٹھیں نہیں، طالبات کو اسناد سے نوازیں۔"

سیف الرحمٰن نیازی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے رُک گئے اور پلٹ کر نرگس کے قریب آ کر آہستہ سے بولے۔

"آپ کا حکم نہیں ٹالا جا سکتا۔"

"تھینکس!" نرگس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو سیف الرحمٰن، جو اسی کو دیکھ رہے تھے، انہیں لگا جیسے نرگس کی ستواں خوب صورت ناک میں پڑی تھلی کے چاروں سفید اور گلابی نگ کھلکھلا پڑے ہوں۔

وہ نام پکارتی گئی اور پرنسپل صاحبہ کی مدد سے، سیف الرحمٰن نیازی، طالبات میں اسناد تقسیم کرتے گئے۔ فلش لائٹس کی تیز روشنیاں بار بار آنکھیں جھپکاتی رہیں۔

سیف الرحمٰن نیازی کی پشت پر نرگس جمال کی آواز اُبھرتی، وہ طالبہ کا نام پکارتی اور انہیں لگتا، جیسے شہد اُن کی سماعتوں میں اُترتا جا رہا ہو۔

تقریب ختم ہوئی اور نرگس جمال نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ریفریشمنٹ کی دعوت دی۔ ایک افراتفری سی پھیل گئی۔ وہ پرنسپل اور دیگر اسٹاف کے ساتھ اپنے لئے مخصوص میز کی طرف بڑھ گئے اور پھر اپنے پی اے سے سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"نرگس جمال کا ایڈریس لے لو۔"

"جی سر!" وہ سر ہلاتا ہوا نرگس جمال کو تلاش کرنے لگا۔ آخر وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں اسے نظر آ گئی۔ وہ لپک کر قریب پہنچا۔

"مِس جمال!"

"جی......" نرگس نے اسے دیکھا۔

"اپنا ایڈریس دے دیجئے۔" وہ منمنایا۔

"کیوں؟" اس نے اپنے کمان ابرو چڑھائے۔

"آپ کا انعام پوسٹ کیا جائے گا۔" حمید اللہ نے وضاحت کی۔

"اوہ......" نرگس مسکرائی۔ پھر بولی۔ "آپ کے وزیر موصوف نے تو اپنی وزارت میں خوب مال بنایا ہوگا۔ صرف پانچ ہزار بھی ان کی جیب میں نہیں ہیں؟"

نرگس کی بات پر ساری لڑکیوں نے قہقہہ لگایا اور بے چارہ حمید اللہ پی اے مسکرا بھی نہ سکا کہ وہ لڑکیوں کے سامنے ویسے بھی جھینپا رہتا تھا۔ آخر نرگس نے اسے اپنا ایڈریس دے دیا اور وہ پسینہ پونچھتا ہوا وہاں سے ہٹ آیا۔

⊕......⊕......⊕

"مامی جی!......سب ہی نے میری کمپیئرنگ کی تعریف کی ہے۔" نرگس کچن میں سیڑھی پر ذکیہ خاتون کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو بولتی بھی تو بہت اچھا ہے نا۔"

"بس یہ سارا آپ کی تربیت کا اثر ہے۔ ورنہ میں بھی گنوار ہوتی۔" نرگس کے لب مسکرا رہے تھے مگر آنکھوں کی چمک ایک دم ہی بجھ گئی تھی۔ اور ذکیہ خاتون اس کی عادات سے واقف تھیں کہ جب وہ بے تحاشا خوش ہوتی تھی تو ایک دم سے اُداس بھی ہو جاتی۔

پتہ نہیں، کون کون سی محرومیاں اسے یاد آ جاتی تھیں۔

"بھئی نئھی! چلنا ہے تم نے تو چلو، میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" حارث نے کچن کے دروازے پر آ کر ہانک لگائی۔

"کھانا تو کھانے دے اسے۔"

"اماں! یہ پیٹو کھا کھا کر موٹی ہو گئی نا تو پھر سارے شوق دھرے رہ جائیں گے۔" حارث نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مت ٹوکا کر، تجھے ہزار بار منع کیا ہے۔" ذکیہ خاتون نے بیٹے کو گھر کا۔

"کہنے دیں مامی جی!........ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" نرگس کے لبوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"اب یہ بتاؤ کہ تمہاری تیاری میں کتنی دیر ہے؟"

"صرف پانچ منٹ میں کپڑے بدلتی ہوں۔"

"یہی ٹھیک ہے۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔"

"مجھے تو ایسی ہی اچھی لگتی ہو۔"

"معلوم ہے کہ تمہیں میں گندی مندی ہی اچھی لگتی ہوں۔ پر میرا پروفیشن مجھے مجبور کرتا ہے۔" نرگس کمرے میں گھس گئی۔

"آپی! میں نے آپ کے لئے یہ سوٹ پریس کیا ہے۔"

"ہائے نیلو! یہ تو تیرا سوٹ ہے۔"

"آپ پہن لیں نا، سچ اسکرین پر بہت اچھا نظر آئے گا۔" نیلوفر نے محبت سے کہا۔

"نہیں........ میں نہیں پہنتی یہ۔"

نرگس نے انکار کر دیا اور شاکنگ پنک سوٹ، جس پر گرین ایمبرائیڈری تھی اور چوکور شیشے لگے ہوئے تھے، اسے اٹھا کر کرسی پر رکھ دیا۔ کل ہی تو انارکلی سے یہ ریڈی میڈ سوٹ نیلوفر کو دلا کر لائی تھی۔

نیلو ابھی فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ نرگس سے پورے تین برس چھوٹی تھی۔ مگر نرگس کو اُس کا لباس بالکل فٹ آتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیتی تھیں۔ اور یوں بھی سفید پوش طبقہ میں تو بہنوں میں یہ چلتا ہی ہے۔

نیلوفر اُس کی ماموں زاد تھی، مگر دونوں نے کبھی فرق نہ سمجھا تھا۔ نرگس صرف دو سال

ہی کی تھی، جب ذکیہ خاتون کی مہربان گود میں آ گئی تھی۔ ذکیہ جو اُس کی مامی بھی تھی اور پھوپھی بھی۔ نرگس کے والدین شادی کی ایک تقریب میں ساہیوال جا رہے تھے کہ بس ٹرالر سے ٹکرا گئی تھی اور کتنے ہی لوگوں کے ساتھ وہ بھی جاں بحق ہو گئے تھے۔ جمال اور ریحانہ کی لاشیں گاؤں آئیں تو کہرام مچ گیا تھا۔ جمال احمد کی بوڑھی ماں یہ صدمہ نہ جھیل سکی اور بدن سے روح کا رشتہ ہی ٹوٹ گیا۔ سکینہ مائی کو تو معصوم سی نرگس کا بھی خیال نہ رہا تھا، جسے اس کی بہو ریحانہ اس کے حوالے کر کے گئی تھی۔

پھر نرگس جمال اپنے ماما تنویر علی کے ساتھ شہر آ گئی کہ گاؤں میں اُس کا تھا ہی کون۔ یہاں اُس سے بڑا حارث تھا، جو کلاس دن میں پڑھتا تھا اور اس کی دلجوئی کرتا رہتا کہ تنویر علوی نے حارث کو اچھی طرح سمجھایا تھا کہ وہ نرگس سے کبھی نہ لڑے اور وہ اتنا اچھا تھا کہ اُس سے نہ لڑتا۔ اسکول سے آتا تو اس کے لئے ٹافیاں اور چپس بستے میں چھپائے پھرتا۔ پھر ایک سال بعد اس کی شریک نیلوفر آ گئی۔ پیاری سی، رُوئی کے گالوں جیسی نیلوفر دونوں کے لئے ہی کھلونا تھی۔

نیلو کی مصروفیت کے باوجود ذکیہ خاتون، نرگس کو ہی فوقیت دیتیں تا کہ اسے کبھی احساس نہ ہو کہ اس پر توجہ کم دی جا رہی ہے۔

وقت گزرتا رہا، نرگس اسکول جانے لگی۔ حارث اسے پڑھا دیتا تھا۔ ویسے بھی وہ اتنی ذہین تھی کہ اسے ضرورت نہ تھی ٹیوشن کی۔ جبکہ تنویر علوی نے حارث کو بھی ٹیوشن نہ رکھ کر دی تھی۔ ایم ڈی اے میں کلرک تو تھے، بھلا وہ کیسے یہ ٹیوشن جیسا "بوجھ" اُٹھاتے۔ مگر نرگس سے انہوں نے بارہا پوچھا۔

"بیٹا! اگر کسی مضمون میں دقت ہو تو مجھے بتانا، میں کوئی ٹیوٹر رکھ دوں گا۔" مگر نرگس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔

دونوں میاں بیوی نے اپنے بچوں سے بڑھ کر اسے چاہا تھا۔ نیلوفر، ماہ رخ اور حماد بھی اسے بے حد چاہتے تھے۔ تنویر علوی پہلے نرگس کی فرمائش پوری کرتے (جو وہ کم ہی کرتی تھی) ہر کام میں اُس سے مشورہ لیتے، اُس کی ہر خواہش کا احترام کرتے۔ ریڈیو پروگرام وہ کرتی تھی۔ ٹی وی پر نوجوانوں کا کوئز پروگرام نرگس جمال کی بے ساختہ اور خوب صورت کمپیئرنگ کی وجہ سے مشہور تھا۔ کبھی کبھار اسے اسٹیج پروگراموں کی کمپیئرنگ کے لئے بھی بلایا جاتا تھا۔ اور تنویر علوی نے اسے کبھی منع نہ کیا تھا۔ انہیں اپنی بھانجی پر بے تحاشا اعتماد تھا اور پھر نرگس نے بھی تو کبھی ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائی تھی۔ اور ایسا

کرنے کی اسے ضرورت ہی کیا تھی کہ نجانے کب سے حارث علوی اس کے دل کے مندر میں چپکے سے داخل ہو کر اُس کی رگ رگ میں سما گیا تھا۔ اور اب تو کسی اور کی گنجائش ہی نہ تھی۔

حارث علوی، نرگس جمال کی آنکھوں کا خواب اور دل کی دھڑکن تھا۔

حارث، پنجاب یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔اے کر رہا تھا۔ یہ اُس کا فائنل ایئر تھا۔ انتہائی ذہین و فطین لڑکا تھا وہ۔ شام کو ٹیوشنز کرتا تھا، تاکہ اپنی پڑھائی کا خرچ نکال سکے۔ اس کے علاوہ بھی بے تحاشا خرچ تھے۔ اپنی ٹیوشن کی کمائی سے اس نے موٹر سائیکل لی تھی۔ اس لئے بھی کہ نرگس کو دقت نہ ہو۔ کیونکہ اسے ریڈیو اور ٹی وی لے جانے کی ڈیوٹی وہی انجام دیتا تھا اور پھر لے کر بھی آتا کہ اسے اچھا نہ لگتا تھا کہ نرگس بسوں کے دھکے کھائے۔

آج بھی نرگس کی ریکارڈنگ تھی۔ پروگرام "جواں عزم" کی کمپیئر...... نرگس جمال اب عجیب مخمصے میں مبتلا تھی کہ بھلا وہ نیلوفر کا سوٹ کیسے پہن لے، جو ابھی اس نے اپنے جسم سے ٹچ بھی نہ کیا تھا اور نیلو کی ضد تھی کہ وہ وہی سوٹ پہنے۔

نیلوفر کی ضد اور محبت کے سامنے وہ پانی ہو گئی۔ آخر اسے اس کی بات ماننی ہی پڑی تھی۔

"آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔" نیلو کو اس نے وارننگ دی۔

"آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔" نیلو نے کندھے اچکائے اور وہ کپڑے بدلنے کے لئے باتھ روم میں گھس گئی۔

حارث نے حسب سابق "جلدی جلدی" کا شور مچایا ہوا تھا۔

"توبہ ہے، تمہیں ذرا بھی سکون ہے؟" وہ ہیئر پن، بالوں میں اُڑستی ہوئی باہر آئی۔

"سکون۔" وہ مسکرایا۔ "تجھے دیکھ کر ہر پل سکون سا محسوس ہوتا ہے۔"

"ڈائیلاگ مت مارا کرو۔" نرگس نے ادائے بے نیازی سے کہا، بیگ کندھے سے لٹکایا۔ "اب چلو بھی۔"

"حاضر سائیں! حاضر۔ ہم تو ہیں حکم کے غلام۔" وہ جلدی سے موٹر سائیکل پر بیٹھا اور کک لگائی۔ نرگس بھی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"اچھا، تو اُس بڈھے نے تمہارے لئے پانچ ہزار کے خصوصی انعام کا اعلان کیا ہے۔" حارث نے موضوع چھیڑا۔

"ہوں۔" نرگس ہنکارہ بھر کر رہ گئی۔

"مگر کیوں؟"

"یار! اُسے کمپیئرنگ پسند آئی تھی نا۔"

"کہیں تُو تو اُسے پسند نہیں آ گئی؟" حارث نے گردن ترچھی کر کے اس کی جانب دیکھنا چاہا۔

"باؤلے ہوئے ہو...... کہاں وہ اور کہاں میں۔"

"کیسے تم یہ کہہ سکتی ہو؟" حارث نے کریدا۔

"حارث! وہ خاصی عمر کا بندہ ہے اور میں تو غالباً اس کی بیٹیوں کے برابر ہوں۔ تم نے اتنی غلط بات کیوں سوچ لی؟" وہ خفا ہو گئی۔

"پتہ ہے تجھے، جب سے تُو نے بتایا ہے نا کہ اُس نے اتنی رقم کا اعلان کیا ہے، میرے دل کو خدشات نے گھیر لیا ہے۔" حارث نے کہا۔

"فضول ہیں تمہارے خدشے۔" نرگس نے برا سا منہ بنایا۔

"تُو نے انعام لینے سے انکار کر دینا تھا۔"

"کوئی انعام لینے سے بھی انکار کرتا ہے؟"

"لیکن منّی! یہ اتنی بڑی رقم۔"

"کیا حیثیت ہے پانچ ہزار کی؟"

"جان! تُو سمجھ نا۔ یہ دولت مند اتنی رقم نہیں دے سکتے۔ پانچ سو سے اوپر نہیں آتے۔"

"اپنی پبلسٹی کے لئے حارث! ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

نرگس نے کہا۔ جب کہ حارث کے خدشات پر اُس کا دل بھی واہموں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ مگر وہ حوصلہ نہ ہارنا چاہتی تھی۔

"خیر، گولی مارو۔ ہو سکتا ہے، میں غلط سوچ رہا ہوں۔ تُو ہے بھی تو اتنی پیاری نا کہ......"

"تمہیں لگتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"نہیں، سب کو لگ سکتی ہو۔" حارث نہایت سچائی سے بولا۔ "تمہاری ایک مسکراہٹ پر ہی سو زندگیاں قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔"

"ہر ایک کے سوچنے کا یہ انداز نہیں ہو سکتا۔"

”میرا جی چاہتا ہے، نمی! تجھے سب سے چھپا کر رکھوں۔ کوئی تیری جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔“

”یہ تو خود پسندی ہے نا۔“

”یہ خوش پسندی نہیں، میری محبت ہے، جو مجھے مجبور کرتی ہے۔ مگر کیا کریں، ہم جیسے سفید پوش طبقے کے لوگ، جن کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں، زمانے کی دوڑ میں ہم ہانپنے لگتے ہیں، پھر بھی دوڑ رہے ہیں۔ ہماری بھی خواہش ہے، تین مرلے کے مکان سے نکل کر کنال کی کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ اچھا پہنیں، اچھا کھائیں۔ ہم پتہ نہیں، قناعت پسند کیوں نہیں؟ اور اس زمانے کی ترقی کی وجہ سے گھر کی لڑکیوں کو ہم بخوشی جاب کی اجازت دے دیتے ہیں۔“ حارث کے لہجے میں دُکھ گھلا ہوا تھا۔

”ماما نے مجھے بخوشی اجازت نہیں دی، حارث!....... میرا شوق تھا کہ میں ریڈیو پر جاؤں۔ ٹی وی میرا اگلا قدم تھا۔“

”پھر فلم نہیں؟“ حارث نے کہا۔

”نہیں بھئی، اس سے آگے شوق نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”کیا یہ سب تمہیں پسند نہیں حارث؟“

”ریڈیو اور ٹی وی کے معمولی سے چیک سے تمہارا کیا خیال ہے، تمہاری ضروریات پوری ہو جاتی ہیں؟“ حارث نے پوچھا۔

”پھر بھی حارث! کچھ تو ہو ہی جاتا ہے۔ میں ماما پر بہت زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ مجھے پتہ ہے، کیا آمدنی ہے ان کی۔“

”تم غیریت برتتی ہو۔“ حارث بولا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ اس گھر اور اس کے مکینوں کے علاوہ میرا ہے ہی کون....... سب سے بڑھ کر تم ہی تو میرے اپنے ہو۔ میں چاہتی ہوں، گریجویشن کے بعد جاب کر لوں، کوئی مستقل سی۔“

”پتہ نہیں، منزل کتنی آگے ہے اور کتنی دُور..... ڈگری کا حصول آسان ہے اور نوکری... ہونہہ!“ زہر خند حارث کے لبوں پر پھیل گیا۔

”تم مایوس نہ ہو، اللہ بہتری کرے گا۔“ نرگس نے اُسے دلاسا دیا۔

”تمہارے یہ دلاسے مجھے بہت حوصلہ دیتے ہیں، نمی!“ حارث نے نہایت سچائی سے کہا۔ ”مجھے پتہ ہے، میں بہت کامیاب رہوں گا، اپنی آئندہ زندگی میں۔ اور کہتے

ہیں، ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے....... پتہ نہیں، میرے خواب پورے بھی ہوں گے یا.......“

”ان شاء اللہ! تمہارے سارے خواب پورے ہوں گے۔“ نرگس نے صدقِ دل سے کہا اور پھر جب لبرٹی چوک پر پیپسی کولا والوں کے بورڈ پر لگی گھڑی پر نظر پڑی تو بولی۔

”حارث! پونے چھ بج گئے ہیں۔ اور ریکارڈنگ کا وقت پورے چھ بجے ہے۔“

”تو دیر ہو گئی ہے۔“

”ہوں، تیزی سے چلاؤ۔ باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا۔“

”یار! یہی وقت تو ہوتا ہے، ہماری باتوں کا۔ گھر میں تو تم لفٹ ہی نہیں کراتیں۔“ حارث نے چھیڑا۔

”شرم کرو........ باتیں کرتی تو ہوں نا؟“

”ایسی باتیں تو نہیں ہوتیں نا؟“ حارث نے کہا اور موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی، پھر ایبٹ روڈ جانے تک دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ ٹریفک کے شور میں ایسا کب ممکن تھا۔

”آ جاؤ گی یا آؤں؟“ حارث نے پوچھا۔

”تم آ جانا........ ٹی وی کی گاڑی کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔“ نرگس نے کہا تو حارث سر جھکا کر بولا۔

”ہم تو غلام ہیں جناب کے۔“

اور وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

⊛......⊛......⊛

سیف الرحمٰن نیازی کو وہ صبیح چہرے اور چمکتی آنکھوں والی لڑکی بھلائے نہ بھول رہی تھی۔ کتنی بھی معروفیت ہوتی، وہ انہیں یاد آ جاتی، اپنی نرم اور لوچ دار آواز کے ساتھ۔ یہ لہجہ، یہ انداز تو فرخندہ احمد کا تھا۔ وہ فرخندہ احمد، جسے دیکھ کر اُن کا دل بے ساختہ دھڑکا تھا۔ وہ اُن کے دوست حسن احمد کی اکلوتی بہن تھی۔ انتہائی ضدی اور لاڈلی۔ پھر بے تحاشا حسین تھی۔ سیف الرحمٰن جو گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے اور ہاسٹل میں رہتے تھے کہ اُن کا گھر تو میانوالی میں تھا، اُن کے والد کندیاں کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ اٹھارہ کنال کی حویلی میں پیدا ہونے والے سیف الرحمٰن نیازی ہمیشہ پڑھائی کی وجہ سے بورڈنگ ہاؤس اور ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہنے پر مجبور تھے۔ حسن احمد اُن کا

کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ اکثر شام کو حسن احمد کے ہاں آ جاتے، وہ حسن احمد کے گھر کے فرد کی طرح ہی تھے۔ اور فرخندہ نے بھی کبھی اُن سے پردہ نہ کیا تھا۔ بلکہ وہ تو محسن احمد، حسن احمد، سیف الرحمٰن کے ساتھ کیرم کھیلتی تھی، ٹینس کھیلتی۔ اور بہت جلد ہی وہ سیف الرحمٰن کے دل میں اُتر گئی۔

وعدے وعید بھی ہو گئے۔

کہ محبت کا جواب محبت سے مل گیا تھا اور وہ بہت خوش تھے۔ خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرنے لگے تھے۔

یونہی بہت سا وقت گزر گیا اور بی۔اے فائنل کا ایگزام دے کر وہ رحمٰن پور آئے تو رحمٰن خان نیازی نے انہیں زمینداری سنبھالنے کا حکم سنا دیا۔

تب انہوں نے ماں کی گود میں سر رکھ کر فرخندہ احمد کے بارے میں بتا دیا۔ مگر حلیمہ بیگم کو تو بیٹے کی جسارت پر جس قدر غصہ آنا تھا، آیا مگر لبوں سے انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

''اماں! آپ فرخندہ کو دیکھیں تو یہی کہیں گی، واقعی یہ میرے ہی لئے ہے۔'' ماں کو خاموش دیکھ کر انہوں نے کہا۔

''ضروری نہیں، جو تم سوچ رہے ہو، میں بھی وہی سوچوں۔'' بہت ہی سپاٹ سا لہجہ تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے تو چونک سے گئے تھے۔

''اماں جی!''

''تمہیں پتہ ہے، ہم اپنی برادری سے باہر نہ لڑکیاں دیتے ہیں اور نہ ہی لیتے ہیں۔ پھر ہمارے ہاں یوں بھی بہت لڑکیاں ہیں۔ باہر سے بہوئیں لانے کی روایت ہم نے ڈال دی سیفو! تو پھر اپنے خاندان کی تو لڑکیاں بیٹھی رہ جائیں گی۔''

''اماں! یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ ٹھٹک کر بولے۔

''یہ وہ بات ہے، جو تم نہیں سمجھ سکتے۔ اور یوں بھی شاہدہ مجھے پسند ہے۔ پورے پنچ مربع زمین جہیز میں لائے گی۔ وہ فرخندہ کیا لائے گی؟''

حلیمہ بیگم کے لہجے میں امارت کا فخر نمایاں تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''تمہیں پتہ ہے، میں جہیز میں پورے گیارہ مربع اراضی لائی تھی۔''

''تو آپ میری شادی زمینوں سے کریں گی؟''

''یہ صدیوں کی ہماری روایات ہیں۔ اور ان سے انحراف ناممکن ہے۔''

اُن کا انداز حتمی تھا اور سیف الرحمٰن کچھ بھی نہ بول سکے، کوئی احتجاج نہ کر سکے۔ انتہائی بزدلی کا ثبوت دیا تھا انہوں نے۔ فرخندہ سے کئے گئے وعدے سراب ثابت ہوئے اور وہ شاہدہ نیازی کو بیاہ لائے۔ مگر دل کی کسک ہنوز جاری تھی۔ شادی کے بعد وہ فرخندہ سے ملنے گئے تھے۔ تنہا، اکیلے۔ اپنی مجبوریوں کی داستان اسے سنانا چاہتے تھے۔ مگر اُس نے کچھ بھی نہ سنا۔

''آئی ہیٹ یو، سیف الرحمٰن نیازی! تم......تم جیسا بزدل مرد کبھی بھی میری محبت نہیں ہو سکتا۔ میں شاید غلط راستے پر چلی گئی تھی۔''

''میں مجبور تھا، فرخندہ!......میں ماں سے کیسے لڑتا؟ اور......''

''ماں سے کیسے لڑتے؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔ ''میں نے کب کہا، ماں سے لڑو؟ خاندان سے لڑو؟...... انسان میں اتنی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی بات منوا سکے۔ تم میں تو کچھ نہیں۔ تم کھوکھلے ہو اور ایسے لوگ محبت نہیں کر سکتے، جو مصلحت کے تیر دیکھ کر چھپ جائیں۔ تم جا سکتے ہو سیف الرحمٰن نیازی! کہ بزدل مردوں سے مجھے نفرت ہے۔ تم کبھی کامیاب مرد نہیں بن سکتے، جب تک خوف کی بُکل مارے رہو گے۔ میری یہ بات یاد رکھنا، عورت بہادر مرد کو پسند کرتی ہے۔ ایسا مرد، جس میں جرأت نہ ہو، اپنی بات منوانے کا حوصلہ نہ ہو، عورت اُس کو دھتکار سکتی ہے، اس سے نفرت کر سکتی ہے مگر محبت نہیں کر سکتی۔''

فرخندہ کی آنکھوں میں آج محبت کی چمک کی جگہ نفرت کے انگاروں نے لے لی تھی اور سیف الرحمٰن نیازی اُس نفرت کی آگ کو نہ بجھا سکے۔ سر جھکا کر لوٹ آئے۔

کچھ نہ بتانے کے باوجود بھی تو وہ سب کچھ جان گئی تھی۔

بعض لڑکیاں کس قدر ذہین ہوتی ہیں۔ مرد کے انداز سے ساری کیفیات کا اندازہ لگا لیتی ہیں اور فرخندہ نے بھی سارے اندازے لگائے تھے اور وہ سب سچے تھے۔

سیف الرحمٰن نیازی واپس رحمٰن پور آ گئے، مگر ذہن و دل سے وہ چمٹی ہوئی جونک نہ اُتری، جس کا نام فرخندہ احمد تھا۔

وہ اُنہیں ہر پل، ہر ساعت یاد آتی رہی۔ اتنے نفرت انگیز انداز کے باوجود بھی وہ انہیں بھلائے نہ بھولتی تھی۔

اور اس روز جب ان کے ہاں پہلا بیٹا تابش پیدا ہوا تو اُسی روز انہیں فرخندہ احمد کی شادی کا کارڈ موصول ہوا تھا۔ کارڈ میں ایک چھوٹی سی پرچی بھی تھی، جس پر تحریر تھا۔

"تم نے تو مجھے اپنی شادی پر بلایا نہیں، مگر میرا حوصلہ اور میری جرأت دیکھو کہ تمہیں بلا رہی ہوں، نہایت صدقِ دل سے۔ میری خواہش ہے کہ تم ضرور شرکت کرو۔ پتہ نہیں، تم میں میری شادی میں شرکت کرنے کا حوصلہ اور جرأت ہے یا نہیں۔"

منتظر......فرخندہ

اور سیف الرحمٰن میں واقعی یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ فرخندہ کی شادی میں شریک ہوتے۔ وہ دل کہاں سے لاتے، جو اسے کسی اور کا ہوتے دیکھ کر نہ تڑپتا۔ اُن میں کہاں اتنا حوصلہ تھا کہ فرخندہ کو کسی اور کے ساتھ رخصت ہوتا دیکھتے۔ آنکھیں نہ بند ہو جاتیں۔ اس لئے وہ شادی میں نہ گئے، البتہ انہوں نے وہ شادی کارڈ اپنی نہایت اہم دستاویزات میں محفوظ کر کے رکھ لیا۔

وقت مہینوں اور سالوں کا سفر طے کرنے لگا۔

شاہدہ سے اُن کی اچھی بن رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے چار بیٹے اور دو بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود اُس میں غرور و طنطنہ پہلے دن جیسا تھا۔ اُسے اپنی پانچ مربع اراضی جہیز میں لانے کا بے حد غرور تھا۔ اور پھر جہاں محبت نہ ہو، وہاں یہ ساری اکڑ ثانوی سی لگتی ہے۔ سیف الرحمٰن کی ازدواجی زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔

رحمٰن نیازی کی وفات کے بعد سیف الرحمٰن ہی اپنے خاندان کے کرتا دھرتا بن گئے تو نہ جانے کہاں سے بے تحاشا جرأت اُن میں آ گئی۔ بلدیاتی انتخابات میں اُنہوں نے حصہ لیا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ سیاست کے اسرار و رموز اُن کی سمجھ میں آنے لگے۔ اب وہ آگے اور بہت آگے بڑھنے کے تمنائی تھے۔ انہیں فرخندہ احمد کا جملہ یاد تھا کہ... "تم کبھی کامیاب مرد نہیں بن سکتے، جب تک خوف کی بکل مارے رہو گے۔"

ایک دم ہی انہوں نے خوف کی بکل اُتار پھینکی تھی۔ کہ والد کی وفات کے بعد خاندان کے سربراہ وہی تھے۔ جو چاہتے سو کرتے۔ قومی الیکشن ہوئے، تب بھی اپنے علاقے کے وہ نمائندہ بن کر صوبائی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ البتہ وہ کوئی وزارت حاصل نہ کر سکے۔ مگر جب صوبائی کابینہ میں بیٹھے تو جوڑ توڑ اور دوسرے طریقے بھی سمجھنے میں انہیں آسانی ہوتی چلی گئی۔ بے تحاشا مصروفیات میں انہیں فرخندہ احمد واقعی یاد نہ آتی۔ یہ زندگی انہیں بہت اچھی لگتی کہ مصروفیت ہی مصروفیت تھی۔ اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ حیرت تو یہ تھی کہ لاہور میں رہتے ہوئے بھی انہیں فرخندہ یاد نہ آتی۔

دوبارہ الیکشن ہوئے تو انہوں نے صوبائی اور قومی اسمبلی کی نشستوں سے بیک وقت انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں سے کامیاب ہوئے کہ اپنے علاقے کے لوگوں کے کام وہ بہت کرواتے تھے۔ علاقے میں ترقیاتی کام بھی بے تحاشا ہوئے تھے تو بھلا لوگ ووٹ کی پرچی اُن کے حق میں کیوں نہ ڈالتے؟

پھر دوستوں کی خواہش پر انہوں نے قومی اسمبلی کی سیٹ چھوڑ دی اور صوبائی اسمبلی میں آ گئے اور یہاں انہیں اہم وزارت سونپ دی گئی۔ جس روز اُن سے گورنر نے اُن کے عہدے کا حلف لیا تو بار بار اُنہیں خیال آ رہا تھا کہ عرصہ بعد انہیں فرخندہ احمد کی یاد آئی تھی۔

"ایک بار فرخندہ میرے سامنے آ جائے تو اس سے پوچھوں، کیا واقعی اب میں کامیاب مرد ہوں یا ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے؟"

مگر وہ انہیں کبھی نظر نہ آئی تھی، لوگوں کے سمندر میں نجانے کہاں کھو گئی تھی، حالانکہ وہ اُسے تلاشتے ضرور تھے۔

اور آج اُن کی تلاش رنگ لے آئی تھی۔ نرگس جمال کی شکل میں انہیں فرخندہ احمد مل گئی تھی۔ انہیں حیرت تو یہ تھی کہ نرگس بالکل فرخندہ کی کاپی تھی۔ بس فرخندہ اور نرگس میں یہ فرق تھا کہ فرخندہ پر یقیناً گزرتے وقت نے کچھ اثر چھوڑا ہوگا اور نرگس عمر کے اس حصے میں تھی، جب چہرے پر صرف رونق ہی رونق ہوتی ہے۔ جب وہ فرخندہ سے آخری بار ملے تھے، بچھڑنے کے لئے ہی تو وہ نرگس جیسی ہی تھی۔ وہ اب تک نہ بھول سکے تھے، وہ نقشہ جو اُن کے ذہن و قلب پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

دوسرے روز حمید اللہ اُن سے چیک پر دستخط کرانے آیا۔ یہ نرگس جمال کے لئے تھا۔ دستخط کرتے ہوئے اُن کے لبوں پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی۔

"حمید اللہ! اس لڑکی کا پتہ چاہئے مجھے۔"

"جی!" وہ سر جھکا کر بولا۔

"میری پرسنل ڈائری میں اُس کا ایڈریس نوٹ کر دو کہ کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔"

"بہتر سر!" حمید اللہ تو حکم کا غلام تھا، سر ہلا کر رہ گیا۔ اور وہ نرگس جمال اُن کی آنکھوں میں اُتر آئی۔ مگر جلد ہی اُنہیں نرگس کا خیال جھٹکنا پڑا کہ کچھ لوگ اُن سے ملنے آ گئے تھے۔

اُس روز وہ بالکل فارغ ہی تھے کہ آج کسی تقریب میں جانا تھا اور انہوں نے یہ پروگرام کینسل کر دیا تھا۔ سر میں شدید درد کی وجہ سے وہ کہیں نہ گئے تھے اور اپنے بیڈ روم میں پردے گرا کر لیٹ گئے۔

عجیب سی قنوطیت طاری تھی۔ دل پر گھبراہٹ بھی نمایاں تھی۔

دل بہلانے کے لئے انہوں نے ٹی وی آن کر دیا۔ کوئی اسپرے کا اشتہار آ رہا تھا۔ اور وہ نہایت دلچسپی سے کھیت کھلیان دیکھتے رہے۔ پھر جب پروگرام "جواں عزم" شروع ہوا اور نرگس جمال اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اسکرین پر نمودار ہوئی تھی اور سیف الرحمٰن نیازی تو اُسے یک ٹک دیکھے گئے۔

کالج میں انہوں نے اُسے یونیفارم میں دیکھا تھا، جہاں اُس نے کس کر بالوں کی چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ جبکہ یہاں تو اُس کی چھب ہی نرالی تھی۔ گرین کڑھائی والا شاکنگ پنک سوٹ اور گرین دوپٹہ، جس پر شاکنگ پنک کڑھائی تھی۔ لمبے کھلے بال، جس نے اُس کی پشت کو ڈھکا ہوا تھا، بالکل ایسے جس طرح آبشار تواتر سے بہہ رہا ہو۔ وہ انہیں آج پہلے سے بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

جب بھی وہ اسکرین پر آتی، سیف الرحمٰن کا دل پسلیوں کے درمیان دھڑ دھڑانے لگتا۔ انہوں نے خود کو کتنی ہی بار سرزنش بھی کی۔ مگر مجال ہے، جو ذہن کی نصیحت قلب مان جاتا۔

اور اس پل انہوں نے ایک دم ہی بہت اہم فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس فیصلے پر انہیں کوئی ملال بھی نہ تھا۔

⊛......⊛......⊛

اُس چھوٹے سے گھر میں بھونچال ہی تو آ گیا تھا۔ جہاں تین روز قبل سب خوش تھے، جب نرگس جمال کے نام ٹی سی ایس کے ذریعے انعامی چیک آیا تھا۔ مای اور ماما خوش تھے، نیلو، ماہ رخ اور حماد نے کئی فرمائشیں کر دی تھیں۔ جب کہ حارث کے چہرے پر تختی کے آثار نرگس نے صاف محسوس کر لئے تھے۔

تبھی تو وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔

"حارث! تم نہیں چاہتے نا، تو میں یہ چیک لوٹا دیتی ہوں۔"

"تمہارا خود کا دل نہیں چاہتا؟" عجیب طرح کا شک اس کے لہجے میں تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ مجھے تو تمہاری خوشی ہی پیاری ہے۔" نرگس نے متانت سے

جواب دیا۔ اور پھر چیک اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"جو بھی سلوک کرو اس کے ساتھ، مجھے منظور ہے۔"

یہ اور بات کہ دوسرے روز حارث وہ چیک نرگس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا آیا تھا۔

اور آج یہ مسئلہ ہو گیا تھا۔ تنویر علوی پریشان تھے اور حارث غصے سے تنتناتا پھر رہا تھا۔

"آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی، آپ کو بلا کر بات کرنے کی؟"

"ابا جی! آپ نے کچھ بھی نہ کہا؟"

"میں اس پوزیشن میں نہیں تھا، بیٹا!"

"اُس نے اپنی عمر کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ اور کمینگی کی انتہا دیکھیں کہ آپ سے رشتہ مانگا ہے۔ اُسے شرم نہیں آئی۔"

"دولت مند لوگوں کے پاس شرم جیسی چیز نہیں ہوتی، بیٹا! وہ تو اُلٹا ہمیں شرمندہ کرتے ہیں۔ ہماری اوقات اور حیثیت بتا کر۔"

"جب ہماری حیثیت نہیں ہے تو پھر نرگس کا پروپوزل کیوں دیا ہے؟...... کیوں آخر؟" حارث کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سیف الرحمٰن کی گردن مروڑ دے۔

"بیٹا! ہم بولتے کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔"

"ہماری لڑکیاں اتنی ارزاں ہیں نا کہ جو چاہے، منہ پھاڑ کر اپنانے کا کہہ دے۔"

حارث نے ہاتھ پر مُکا مارا۔

"میں نے انہیں کہا ہے کہ سوچ کر جواب دوں گا۔" تنویر علوی نہایت ٹوٹے ہوئے تھے۔

"سوچ کر جواب جو دینا ہے۔ انکار ہی ہے نا؟" حارث نے پوچھا۔

"بالکل!" وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

"تو آپ نے پہلے انکار کیوں نہ کر دیا؟"

"وقت دیکھ کر بات کی جا سکتی ہے۔ دو روز بعد میں نے جانا ہے۔ اور کہہ دوں گا کہ سیف صاحب! مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ تم خود کو پریشان نہ کرو۔ میں بات سنبھال لوں گا۔"

تنویر علوی نے بیٹے کو سمجھایا کہ جوان خون تھا، جو اُبل رہا تھا اور وہ ذرا تحمل سے کام لینا چاہتے تھے۔ نرگس تو یہ سب سن کر سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کے تو سان و گمان میں بھی

نہ تھا کہ سیف الرحمٰن نیازی اُس کے ماما کو بلا کر رشتے کی بات کریں گے۔

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ میرا دل واہموں میں گھر گیا ہے۔" حارث اُس کے سر پر کھڑا کہہ رہا تھا۔

"بخدا حارث! میرا کوئی قصور نہیں۔" نرگس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں تمہاری غیر نصابی سرگرمیوں سے اسی لئے چڑتا تھا کہ لوگوں کی گندی گندی نظروں کو میں جانتا ہوں۔ جہاں خوب صورت چہرہ دیکھا اور اس کی طرف لپکے۔ خوب صورت لڑکی کے لئے اس معاشرے میں بے پردہ رہنا عذاب ہے۔ مگر تمہارے شوق بھی ریڈیو، ٹی وی۔"

"میں اب کہیں نہیں جاؤں گی حارث!" وہ رو دی۔

"اب کیا فائدہ؟"

"حارث!" نرگس کی آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

"مت رو ؤ اب......" حارث نے اس کا کندھا تھاما تو بس سہارا ملنے کی دیر تھی، وہ اُس کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رو دی اور حارث اُسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ اُس کے گرم گرم آنسو حارث کے دہکتے سینے میں جذب ہوتے رہے۔ اور حارث کا اندر کھولتا رہا۔

"اب میں کہیں نہیں جاؤں گی، حارث!...... ساری ایکٹیویٹیز چھوڑ دوں گی۔ میں...... میں کالج بھی نہیں جاؤں گی۔" وہ حارث کے سینے میں منہ گھسیڑے بے ربط سے جملے بول رہی تھی۔

اور حارث کو اس وقت اس پر بہت سارا پیار آ رہا تھا۔

کتنی معصومیت سے اپنے ناکردہ جرائم کا اعتراف وہ کر رہی تھی۔

اپنے سارے شوق وہ ایک دم ہی ختم کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔

"حارث! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔" آنسوؤں سے تر چہرہ اس نے اونچا کیا تو حارث کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ حارث نے بے اختیار ہی اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی آنسوؤں بھری سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"جانی! میں بھی تجھے نہیں کھونا چاہتا۔ تجھے نہیں پتہ کہ تُو حارث علوی کے لئے کیا ہے۔ تُو حارث کے روم روم میں بسی ہوئی ہے۔ دل کی تہوں میں اُتری ہوئی ہے۔ تجھے

کھو کر شاید حارث بھی نہ جی سکے۔"

یہ زندگی میں پہلا اعترافِ محبت تھا، جو دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے سے کیا تھا۔ ورنہ تو پہلے دونوں کے انداز و اطوار ہی بتاتے تھے کہ اُن کے دل ایک دوسرے کے لئے کس طرح دھڑکتے ہیں۔

اُن کی آنکھوں کی چمک ہی اُنہیں بتا دیتی تھی کہ کس طرح وہ آنکھیں پریتم پر نثار ہوتی ہیں۔

"میں اب کہیں نہیں جاؤں گی، حارث!......تم مجھے معاف کر دو۔" اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تیرا تو کوئی قصور نہیں ہے نا۔" حارث نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لئے۔

"لوگوں کی ذہنیت ہی خراب ہے۔ تُو دل چھوٹا نہ کر، کوئی تجھے مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

حارث اُسے دلاسے دے رہا تھا، مگر اُس کا دل تو اندر ہی اندر سہما جا رہا تھا کہ کچھ ہونے والا۔

چھٹی حِس بار بار خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ مگر وہ خود کو حارث کی پناہوں میں محفوظ سمجھ رہی تھی۔

اُسے لگ رہا تھا، جیسے واقعی اُسے حارث سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

پھر...... پھر یہ دل کیوں ڈوب رہا ہے؟

ذہن کیوں ماؤف ہو رہا ہے؟

اُسے لگ رہا تھا، جیسے وہ جہاں کھڑی ہے، وہاں سخت زمین کے بجائے ریت ہے۔ اور جو اُس کے قدموں تلے سے کھسکتی چلی جا رہی ہے۔

محبت میں دھڑکے بہت ہی تنگ کرتے ہیں اور انجانا سا دھڑکا اسے بھی سہمائے دے رہا تھا۔

نرگس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ نہ ریڈیو جائے گی، نہ ہی ٹی وی۔

ایک دم اور بالکل ہی اچانک اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اور پھر حارث کے ساتھ جا کر اس نے پبلک کال آفس سے پروگرام "جواں عزم" کے پروڈیوسر احمد شریف کو فون کر دیا۔

"آپ کسی اور کمپیئر کا بندوبست کر لیں۔ آئندہ ہفتہ میں ریکارڈنگ نہیں کروا سکتی۔"

احمد شریف وجہ پوچھتے رہے۔

"ذاتی وجوہ ہیں، جو بیان نہیں کی جاسکتیں۔"

نہایت سخت لہجہ تھا۔ احمد شریف کا اصرار اور نرگس کا مسلسل انکار تھا۔ نرگس کے فیصلے میں تو رتی بھر بھی ترمیم کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا تھا، اس سے ایک انچ بھی نہ ہٹ سکتی تھی۔ اور حارث خوش تھا کہ اُسے تردّد نہ کرنا پڑا تھا اور نرگس نے اپنے سارے شوق پسِ پشت ڈال دیئے تھے۔

⊛......⊛......⊛

ذکیہ خاتون کا دل بار بار بیٹھا جا رہا تھا۔ گھونٹ گھونٹ وہ پانی پیتیں تو ذرا سکون ملتا اور پھر وہی بے سکونی طاری ہو جاتی۔ نظریں مسلسل وال کلاک پر لگی ہوئی تھیں۔ جونہی وال کلاک ڈیڑھ بجاتا تھا تو وہ نرگس کا اور نیلو کا انتظار شروع کر دیتی تھیں۔

فلو کی وجہ سے آج نیلو کالج نہ گئی تھی، ورنہ دونوں اکٹھی جاتی تھیں اور ایک ساتھ ہی لوٹتی تھیں۔ آج حارث، نرگس کو کالج چھوڑنے گیا تھا اور وہاں سے حسب معمول اُس نے یونیورسٹی چلے جانا تھا۔ نرگس دو بجے تک گھر آجاتی تھی، مگر آج سوا تین بج گئے تھے اور نہ آئی تھی۔

"نیلو! تجھے تو کچھ نہیں کہہ گئی وہ؟" انہوں نے دسویں بار یہ سوال کیا تھا۔

"آپی نے مجھے تو کچھ نہیں کہا۔"

"یاد کر، کہیں جانا تو نہیں تھا؟"

"اب کہاں جائیں گی؟........ریڈیو، ٹی وی چھوڑ تو دیا ہے۔" نیلو منہ بنا کر بولی

"سچ، کتنی عزت تھی۔ لڑکیاں رشک کرتی تھیں۔ مگر کچھ لوگوں کو شہرت بغیر کوشش کے مل جائے تو قدر نہیں کرتے۔"

"بکواس نہ کیا کر........اچھا کیا ہے جو اُس نے کیا۔"

"ہاں، بڑا اچھا کیا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے گھر میں بیٹھ گئیں۔ اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیں گی۔"

"تجھے کیا پتہ کہ وجہ کیا ہے؟" ذکیہ خاتون کے دل کے گنبد میں یہ جملہ گونج کر رہ گیا، مگر انہوں نے نیلو کو نہ بتایا۔ یوں بھی سیف الرحمٰن نیازی نے جو کچھ کہا تھا، وہ تنویر علوی، ذکیہ خاتون، حارث اور نرگس ہی کے درمیان بات تھی، باقی گھر کے فرد اس بات سے لاعلم تھے کہ انجانے میں ہی سیف الرحمٰن نے کیسا تیر ان کے دل میں اتار دیا ہے۔

وقت گزر رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا، گھڑی کی سوئیاں دوڑ رہی ہوں۔

"الٰہی! خیر........" ذکیہ خاتون بار بار دل تھام لیتیں۔

ساڑھے چار بجے تنویر علوی آفس سے آئے تو ذکیہ خاتون کا چہرہ سرسوں کے پھول کی مانند پیلا تھا اور اُن سے فائل لیتے ہوئے اُن کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی، خیریت تو ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی........ بالکل خیریت ہے۔" وہ ہکلا کر بولیں۔

"بلڈ پریشر کا تو کوئی رولا نہیں؟" وہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے تو ذکیہ ان کے پیچھے پیچھے ہی چلی آئیں۔

"حارث کے ابا!........وہ نرگس اب تک کالج سے نہیں آئی۔" ذکیہ خاتون کی آواز بھرّا گئی تھی۔ جبکہ تنویر علوی جو واسکٹ کو کھونٹی پر ٹانگ رہے تھے، واسکٹ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ ایک دم پلٹے۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" انہوں نے کرسی کی پشت کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"صبح کالج گئی تھی، حارث کے ساتھ ہی۔" ذکیہ خاتون نے بتایا۔

"حارث آ گیا؟" تنویر علوی نے پوچھا۔

"وہ تو کہہ گیا تھا، یونیورسٹی ہی سے وہ اپنے دوست خاور کے ہاں چلا جائے گا کہ آج خاور کی منگنی ہے۔ رات گئے تک واپس آئے گا۔" ذکیہ خاتون نے تفصیل بتائی۔

"عابدہ سے پتہ کر لو۔ وہ بھی تو نرگس کی کلاس فیلو ہے۔" تنویر علوی نے برابر میں رہنے والے گل محمد کی بیٹی کا نام لیا۔

"دماغ تو قابو میں رکھیں۔ اگر وہ کہے کہ کالج تو نرگس آئی تھی۔ پھر بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ یوں بھی حامدہ بیگم کو تو موقع ملنا چاہئے، بات پھیلانے کا۔ شام تک پورے محلے میں یہ بات پھیل جائے گی کہ نرگس گھر نہیں آئی۔"

"اوہ....." تنویر علوی چارپائی پر ڈھینے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ "مجھے پانی تو دو۔"

"گھبرائیں مت آپ۔" ذکیہ خاتون کی تو حالت ہی خراب ہو گئی تھی۔ انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے آتے ہی شوہر کو کیوں ایسی بری خبر سنائی۔ لیکن وہ کیا کرتیں؟ وہ کب اپنے آپ میں تھیں۔

وہ جلدی سے پانی کا گلاس لے آئیں۔ تنویر علوی نے لرزتے ہاتھوں سے پانی پیا۔

مگر پھر بھی اُن کا حلق سوکھا جا رہا تھا۔

"کالج سے پتہ کرآؤں۔"

"اب وہ کالج میں کہاں ہوگی؟"

"کیا خبر، حارث کے ساتھ منگنی میں چلی گئی ہو؟"

"پر بتا کر تو جاتی۔ اور حارث بھی اتنا لاپروا نہیں ہے۔ وہ یقیناً پہلے بتانے آتا۔" وہ بولیں۔ خاموشی دونوں کو ہی ڈسنے لگی تھی۔ پھر کچھ بات کرتے ہوئے بولیں۔ "آپ کو خاور کا گھر پتہ ہے؟"

"مجھے کیا معلوم، گوالمنڈی میں رہتا ہے اور میں اتنے بڑے محلے میں کہاں اُسے تلاشتا پھروں۔" تنویر علوی کی آواز شدتِ کرب سے پھٹنے لگی تھی۔ "یاد کرو، شاید نرگس نے تمہیں بتایا ہو کہیں جانے کا۔" انہوں نے بیوی سے کہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ نیلو کو بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔"

"کہاں کہاں تلاشوں میں اُسے؟" وہ ڈھے سے گئے۔

"کہیں سیف الرحمٰن نے اُسے اغواء..." ذکیہ خاتون، دل کا خدشہ زبان پر لے آئیں۔

"مت بات کرو ایسی۔ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا اور.......اور میں نہیں چاہتا کہ یہ سچ ہو۔" انہوں نے بیوی کو جھڑک دیا۔

"اگر ایسا ہوا تو ہماری ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ہم غریب لوگوں کے پاس سوائے اس عزت کے ہوتا ہی کیا ہے۔" ذکیہ خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں پتہ کرتا ہوں۔"

"کیا پتہ کریں گے؟"

"ابھی آیا میں۔" نہ جانے کہاں سے اُن کے اندر طاقت آ گئی تھی، وہ تیزی سے کمرے سے نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔ مگر جب آدھ گھنٹے بعد واپس آئے تو وہی چہرے پر مردنی سی تھی۔ اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

"کچھ پتہ چلا؟" ذکیہ خاتون لپک کر اُن کے قریب گئیں۔

"نہیں......" ایک طویل سانس لے کر وہ کرسی میں دھنس گئے۔ "میں نے فون کیا تھا۔ سیف الرحمٰن تو تین روز سے اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ ملازم نے بتایا ہے، آج رات تک متوقع ہے ان کی آمد۔"

"تو ہمارا خیال غلط تھا۔" ذکیہ خاتون مطمئن نظر آنے لگیں۔

"ہاں، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔" تنویر علوی نے کنپٹیوں کو دبایا۔ انہیں تو کوئی بھی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔

"کہاں جائیں........؟"

کدھر اُسے تلاش کریں؟"

لگتا ہے، ہر طرف ہی دیواریں کھڑی ہیں۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور اب تو ذکیہ خاتون نے باقاعدہ رونا بھی شروع کر دیا تھا۔ نیلو بھی آنکھیں پونچھتی پھر رہی تھی۔ ماہ رخ بار بار سوال کرتی رہی۔

"نرگس آپا کیوں نہیں آئیں اب تک؟"

اور اُس کے سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

تقریباً ساڑھے نو بجے حارث گھر میں داخل ہوا تھا اور سب ہی دالان میں موجود تھے، سوائے نرگس کے۔

"خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں، سب خیریت ہے۔" ذکیہ خاتون بولیں۔

"پھر سب یہاں کیوں جمع ہیں؟ یہ ابھی تک سوئی نہیں۔" حارث نے ماہ رخ کے بال بگاڑ دیئے۔ اور آج وہ حسب معمول اپنا ہیئر اسٹائل "غرق" ہونے پر چیخی نہ تھی۔

"ذرا میرے ساتھ چلو، حارث!" تنویر علوی بولے۔

"کہاں ابا جی؟"

"نرگس کو تلاش کرنے۔" انہوں نے کرب سے ہونٹ کاٹے۔

"کیا.......کیا مطلب؟" اس کا تو دماغ گھوم گیا۔

"وہ کالج سے نہیں آئی۔"

"میں نے صبح اسے کالج ڈراپ کیا تھا۔" حارث نے بتایا۔

"معلوم ہے، یہی تو پریشانی ہے کہ وہ کہاں گئی۔"

"تو........تو......" حارث کا تو دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔

"سیف الرحمٰن تین روز سے اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" تنویر علوی نے حارث کا شک زبان پر آنے سے پہلے ہی رفع کر دیا۔

"چلئے میرے ساتھ۔" حارث ایڑی پر گھوما اور موٹر سائیکل باہر نکالی۔

اور چند لمحوں بعد موٹر سائیکل شاہراہ پر ہوا کی طرح دوڑ رہی تھی۔ مگر اُن کا دوڑنا بے سود ہی رہا تھا۔

حارث نے تو سارے ہاسپٹل دیکھ ڈالے تھے اور ہر ہاسپٹل میں ایمرجنسی وارڈ بھی دیکھے تھے کہ مبادا نرگس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو۔ مگر سب بے سود ہی ثابت ہوا تھا۔ جب رات کا آخری پہر تھا، وہ دونوں باپ بیٹا مایوس سے لوٹ آئے تھے۔

ذکیہ خاتون انہیں تنہا دیکھ کر ہی سمجھ گئیں کہ نرگس نہیں ملی۔ جو آس کا دھاگا تھا، وہ بھی ٹوٹ گیا اور ذکیہ خاتون لہرا کر گر پڑیں۔ یہ تو شکر ہے کہ حارث نے انہیں تھام لیا تھا۔ وہ انہیں اندر بیڈ تک لایا اور بستر پر لٹا دیا۔ نیلوفر اور ماہ رخ نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔

”ابا جی! آپ فکر نہ کریں، میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔ ہمت نہ چھوڑیے گا، ورنہ میں بھی ڈھے جاؤں گا۔“

حارث نے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر التجا کی تھی اور تنویر علوی، بیٹے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

⊛......⊛......⊛

چڑیوں کے چہچہانے کی آواز پر نرگس جمال نے اپنے گھٹنوں سے سر اُٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں دبیز پردوں کے پیچھے صبح کی سپیدی دستک دے رہی تھی۔

تو یہ پہاڑ سی رات کٹ ہی گئی۔

اور......اور سیف الرحمٰن نیازی! تم نے مجھ چڑیا کے پَر کاٹ ہی ڈالے......بغیر کسی قینچی کے۔

مگر نہیں، قینچی تو تم نے چلائی ہے۔

ظلم کی یہ تیز دھار، جس نے میرے وجود میں چھید کر دیے ہیں۔

میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔

اُسے یاد آیا، کل سہ پہر جب وہ برٹش لائبریری سے باہر آئی تھی تو ایک سفید ٹویوٹا کرولا اس کے پاس آ کر رُکی اور اُسے کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ شخص پستول کی نال اُس کی طرف کیے آگے بڑھا تھا اور نرگس نے چیخنا چاہا تھا۔ اس سے قبل کہ اس کے حلق سے آواز نکلتی، ایک رومال والا بھاری ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا گیا۔ پھر اُسے کوئی ہوش نہ رہا۔ فوراً ہی تو اُس کا ذہن ماؤف اور آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ حواس جاتے رہے تھے۔ اور جب وہ اپنے آپ میں لوٹی تھی تو ایک عالی شان کمرے میں موجود تھی۔ اور وہ

سمجھ گئی کہ یہ گھر کس کا ہے؟

وال ٹو وال کارپٹ......دیواروں پر خوب صورت سینریز، کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے۔ اور جس بیڈ پر وہ لیٹی تھی، وہ جہازی سائز تو تھا ہی۔ وہ تو ایک ہی کونے میں ٹِک گئی تھی۔

تو سیف الرحمٰن نیازی! تم نے یہ چال چلی ہے۔

ارے، تم مجھ سے تو پوچھ لیتے کہ میں تمہارے ساتھ رہنا بھی چاہتی ہوں کہ نہیں۔

تم اپنی اور میری عمر کا فرق تو دیکھو۔

تمہیں پتہ نہیں، حارث علوی میرے جسم و جان کا مالک ہے۔ وہ جو کہے، میں آنکھ بند کر کے اُس کے کہے پر عمل کرتی جاؤں۔

مگر تم نے یہ جو حرکت کی ہے نا، اب تو میں ختم ہو گئی ہوں۔

مار ڈالا ہے تم نے مجھے۔

میں نہ اپنے ماما کو کچھ کہوں گی اور نہ ہی حارث کو۔ بلکہ میں تو حارث سے نظریں ہی نہیں ملا پاؤں گی۔

میں اُس کے سامنے جاؤں گی نہیں کہ تم نے مجھے اُس تک جانے کے قابل کب چھوڑا تھا؟

کاش......کاش! دن دن ہی میں، میں گھر لوٹ جاتی۔

ہاں سیف الرحمٰن! یہ سیاہ بھیانک رات کل اور آج کے درمیان نہ آتی۔

بس یہی سوچ اُسے پریشان کر رہی تھی۔ باقی وہ کچھ بھی نہ سوچ رہی تھی۔ حارث علوی! تم جان لو کہ نرگس جمال مر گئی ہے۔ اُس کی تو قبر بھی نہیں ہے، جہاں تم پھول ہی چڑھا دو۔

ہاں حارث علوی!......میرے دل کے مالک!......شاید اب تم میرے جسم کے مالک کبھی نہ بن سکو۔

نرگس نے کرب سے ہونٹ کچلے اور سر بیڈ کی ٹیک سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اُس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بمشکل روکا کہ وہ رونا نہ چاہتی تھی۔

تبھی کھٹکا ہوا اور نرگس کی آنکھیں ایک دم کھل گئیں۔ دروازے کے پردے ہٹے اور نہایت کرّ و فر سے سیف الرحمٰن نیازی اندر آئے۔

سفید کُرتا شلوار میں اُن کا دراز قد نمایاں لگ رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اُنگلیوں میں سگار دبا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے بیڈ کے قریب آ کر رُک گئے۔

''صبح بخیر!''

نرگس کچھ بھی نہ بولی۔ مگر اُس کی نظریں سیف الرحمٰن پر جمی ہوئی تھیں۔

''سوری نرگس! میں اب شکست نہیں کھانا چاہتا تھا، اس لئے یہ اسٹیپ لینا پڑا۔ تمہارے ماما نے غلطی کی ہے انکار کر کے۔ حالانکہ اُسے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ......''

''نیازی صاحب! ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ اونٹوں سے دوستی کرو تو دروازے بھی اونچے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اس دوستی کا کیا بھروسہ۔ ہم تو اپنے جیسوں میں خوش رہتے ہیں۔ اور آپ جیسے لوگ ہمیں خوش ہی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ ظلم ہے۔'' نرگس نے احتجاج کیا۔

''میں نے تم پر کوئی ظلم نہیں کیا۔'' وہ بولے۔

''ظالم کبھی بھی نہیں کہتا کہ اُس نے کوئی ظلم کیا ہے۔ نہ مجرم اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے۔''

''نہ میں ظالم ہوں اور نہ ہی مجرم۔ پھر سچ تو یہ ہے کہ میں نے تو اپنے دوست شمروز خان سے یہ ذکر کیا تھا کہ میں تمہیں پانا چاہتا ہوں، وہ کوئی راستہ بتائے۔ اور شمروز خان نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ وہ تمہیں اُٹھوا سکتا ہے۔ مگر میں نے اُس کی تجویز نہیں مانی۔''

''پھر میں یہاں کیسے ہوں؟'' نرگس نے پوچھا۔

''شاید شمروز خان میری بے تابی اور پریشانی برداشت نہیں کر سکا اور مجھ سے مشورہ کئے بغیر یہ انتہائی قدم اُس نے اُٹھایا ہے۔ میں تو گاؤں گیا تھا۔ رات ہی لوٹا ہوں۔ پتہ چلا تم محفوظ ہو۔ یقین کرو، میں ساری رات خود کو تمہارے سامنے آنے کے لئے تیار کرتا رہا۔ سچ جانو، میں بہت شرمندہ ہوں، نرگس! لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔''

''ایک طرف آپ کہتے ہیں، آپ میرے اغوا میں شریک نہیں۔ اور دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔ تو مجھے بتائیں، سچ کیا ہے؟'' وہ تلخی سے بولی۔

''سچ واقعی یہی ہے کہ میں شمروز خان کے اس جرم میں شریک نہیں ہوں۔ اور رات میں اُس سے لڑا بھی ہوں۔ لیکن وہ بار بار مجھ سے یہی کہتا ہے کہ...... کہ تنویر علوی نہ

مانتے تو تم کیا کرتے؟ اور میں اُس کی بات پر قائل ہو گیا ہوں۔ یہ انتہائی قدم میں نے اُٹھانا تھا، پتہ نہیں دیر سے ایسا کرتا، مگر میں کرتا ضرور۔''

''نیازی صاحب! آپ نے یہ سوچا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟''

''مجھے پتہ ہے کہ میں عمر کے جس حصے میں ہوں، وہاں کسی جوان لڑکی کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا۔ اور اگر جگہ بنائی بھی تو یہ زبردستی کا سودا ہوگا۔ بس، میں یہ جانتا ہوں کہ میری پسند کیا ہے، مجھے تمہاری پسند سے کوئی سروکار نہیں۔'' سیف الرحمٰن نیازی کا لہجہ ایک دم ہی کرخت ہو گیا تھا۔ ''اور میں جو چاہوں گا، وہ تمہیں کرنا ہوگا۔''

''اگر میں نہ کروں، پھر؟''

''تو حالات کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے، پھر تمہارے ماما کے خاندان کی زندگی کی میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔''

''جی......'' وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''بالکل سچ ہے یہ۔ تمہیں میرے بندوں کی کارکردگی کا پتہ تو چل گیا ہے۔ شمروز خان میرا دوست ہی نہیں، اسے میرا رائٹ ہینڈ بھی سمجھ لو۔ وہ میرے کہے بغیر وہی کچھ کرے گا، جو میرے لئے بہتر ہوگا۔ اور مزے کی بات یہ کہ میرا نام بھی نہیں آئے گا۔ اگر تم نے خودکشی کی کوشش کی، تب بھی میرا یہی ردِعمل ہوگا۔''

''پہلے یہ باتیں میں نے سنی تھیں، پر اب دیکھ بھی لی ہیں۔ اور...... اور سیف الرحمٰن صاحب! انتہا ہے ظلم کی۔ اس کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ میں...... میں وہی کچھ کروں گی، جو آپ چاہیں گے۔'' نرگس نہایت بردباری سے کہہ رہی تھی۔ ''مجھے پتہ ہے، رونا، چیخنا، چلانا فضول ہے...... کیونکہ جہاں میں قید ہوں، یہاں کی دیواریں بے حد اونچی ہیں۔ جہاں سے میری آواز باہر نہیں جا سکتی۔ اور اگر چلی بھی جائے تو بھی سن کر کس نے میری مدد کو آنا ہے۔ آپ کے ظلم پر میں کسی عدالت میں جا کر احتجاج بھی نہیں کر سکتی کہ میری فریاد بھلا کس نے سُننی ہے۔'' نرگس کی آواز میں ذرا بھی لغزش نہ تھی۔

وہ بہت حقیقت پسند لڑکی تھی اور اس نے ذہنی طور پر یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ یہی نصیب ہے۔

اور شاید مقدر میں یہی لکھا تھا۔

"گڈ گرل۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے کہے پر عمل کرو گی تو سکھ سے رہو گی۔" سیف الرحمٰن بولے۔

"سکھ......" نرگس کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا۔ اب بھلا کب سکھ چین کے پنچھی دل کے مرغزار میں چہچہائیں گے؟...... کب خوشیوں کے گیت دل گائے گا؟...... آپ نے تو سیف الرحمٰن! میرے گیتوں کا گلا ہی گھونٹ دیا ہے۔

نرگس کی آنکھوں میں سنگریزے چبھنے لگے تھے۔

"اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نیازی صاحب! قیدیوں سے ارادے نہیں پوچھا کرتے، حکم دیتے ہیں۔ اور آپ جو حکم کریں گے، میں بجالاؤں گی۔"

"تم کو تو میں بہت بہادر سمجھتا تھا، نرگس جمال!"

"بہادر تھی میں۔ اگر آپ فیئر گیم کھیلتے میرے ساتھ تو میں آپ کو اپنی بہادری دکھاتی۔"

"اب دکھا دو۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے۔

"میرے کلیجے میں انی اُتار کر آپ کہتے ہیں، آپ کو بہادری دکھاؤں......؟" نرگس ہنس دی۔

"دیکھو ڈیئر! محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اور میں ہر وہ قدم اُٹھانے کو تیار ہوں، جو تمہیں میرا بنا دے۔ اس لئے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"محبت......" نرگس نے سر جھکا۔ "ایک دم بکواس بات ہے۔ ہم کسی کو دیکھتے ہی محبت میں مبتلا ہو جائیں، نہ اس کے بارے میں علم ہو، نہ اُس کا کردار جانتے ہوں اور محبت کریں۔"

"محبت ہے ہی بے ساختہ جذبہ۔ کب کسی نے سوچ سمجھ کر اس بحر میں قدم رکھا ہے۔ تم نے ایسا کیا ہے؟"

"میں نے محبت کی ہو تو مجھے پتہ ہو۔" اُس نے جھوٹ بولا۔

"تم نے محبت نہیں کی؟" وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

"ناں۔" نرگس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کا جی چاہا، کہہ دے، میں نے تو عشق کیا ہے، حارث علوی سے۔ عشق جس میں من و تو کا ہر فرق مٹ جاتا ہے۔ محبت تو اس عشق کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اب تک محبت کے جذبے سے ناآشنا ہو۔" سیف الرحمٰن نیازی کے لہجے میں شک بول رہا تھا۔

"اچھا...... فرض کریں کہ میں آپ سے کہہ دوں، میں نے محبت کی ہے، تو؟" نرگس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تو کا کیا مطلب"

"کیا مجھے پھر بھی اپنی محبت کہیں گے؟"

"آف کورس۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں خود کیا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی اور کیا چاہتا ہے۔ میں تمہیں بیوی بنانا چاہتا ہوں، نرگس جمال! اور اس معاملے میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"تبھی تو میں نے کہہ دیا ہے، جو آپ کہیں گے، میں وہی کروں گی کہ مجھے علم ہے، اب میں اس قید خانے سے کبھی رہا نہیں ہو سکتی۔"

"شمروز خان نے قاضی کا بھی انتظام کر لیا ہے۔ نکاح کے بعد تمہیں تمہارے ماما کے ہاں پہنچا دیا جائے گا۔"

"یہ ضروری ہے؟"

"بالکل...... اور کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ یہ اچھا نہ ہوگا۔" ان کا لہجہ ایک دم ہی پھر سخت ہو گیا تھا اور نرگس اُس پتھریلے لہجے پر خاموش ہو گئی تھی۔

کچھ کہنے کا کوئی بھی فائدہ نہ تھا۔ احتجاج وہاں کیا جاتا ہے، جہاں سنوائی ہو۔ اور یہاں تو سننے والوں نے ہی اپنے کان بہرے کر لئے تھے۔ وہ بھلا کس طرح کوئی احتجاج کرتی؟ سیف الرحمٰن نیازی تو اپنے احکام جاری کرتے چلے گئے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت آ گئی اور آتے ہی بولی۔

"بی بی جی! تُسی نہا دھو لو۔"

"بہتر۔" نرگس ایک معمول کی طرح اُٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ اور پھر وہاں اُس کا دل چاہا، اپنی بے بسی پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ مگر رونا بے سود تھا۔

سیف الرحمٰن نیازی نے تو کلیجے پر ہی ہاتھ ڈالا تھا اور وہ کسی صورت بھی اپنے ماما کا گھر اُجڑتے نہ دیکھ سکتی تھی۔

جس طرح انہوں نے اسے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا تھا، اُس کی ہر خواہش پوری کی تھی، وہ بھلا کیسے سیف الرحمٰن کے انتقام کی بھینٹ اُنہیں چڑھا دیتی۔ بلکہ وہ خود بھینٹ

چڑھ گئی۔ بس پتہ ہی نہ چلا تھا۔ چند گھنٹوں میں وہ نکاح کے تین بولوں کے عوض سیف الرحمٰن کی بن گئی۔

"میں چاہتا ہوں، تم اپنے ماما کے ہاں چلی جاؤ۔" نکاح کے بعد سیف الرحمٰن اُسے نکاح نامہ پکڑاتے ہوئے بولے۔ "انہیں یہ دکھا دو۔"

"ضروری نہیں ہے اس کا دکھانا۔ میری زبان پر وہ بھروسہ کریں گے۔" نرگس نے نکاح نامہ پرے کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے ماموں سے کہنا، مجھ سے فون پر بات کرلیں۔" وہ بولے۔

"کوئی نئی دھمکی انہیں دینی ہے؟" نرگس نے کہا۔

"میں نے انہیں کوئی دھمکی نہیں دی، نرگس! مجھے تم عزیز ہو تو تمہاری نسبت سے مجھے تنویر علوی کا احترام لازمی ہے۔ اور میں ہمیشہ اُن کا احترام کروں گا۔ اگر وہ میری بات مان لیتے تو آج یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔" سارا قصور انہوں نے تنویر علوی پر ڈال دیا تھا۔

نرگس کچھ بھی نہ بولی اور سر جھکا کر رہ گئی۔

⊛......⊛......⊛

دوپہر ڈھل چکی تھی، جب سیف الرحمٰن کا ڈرائیور، نرگس کو تنویر علوی کے گھر دروازے پر اُتار کر واپس گیا تھا۔ بلکہ نرگس نے اُسے بھیج دیا تھا۔ دروازے پر کھڑے کھڑے اُسے احساس ہوا کہ اس نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔

وہ جو ہزار ہا بار اس دروازے میں داخل ہوئی تھی، آج اُس میں سکت ہی نہ تھی کہ قدم آگے بڑھائے۔

نرگس کو لگ رہا تھا، جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ آس و نراش کا چکر بڑا ہی عجیب ہوتا ہے۔

کال بیل کی طرف وہ ہاتھ بڑھاتی مگر پھر ٹھٹک جاتی۔ اسے لگتا، جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔

اور آخر کار اُس نے ڈور بیل بجائے بغیر ہی دوازہ دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا.......

شاید دروازہ کھلا رکھا ہو؟

میرے لئے....... کہ میں آجاؤں تو دروازہ نہ کھٹکھٹانا پڑے۔

ایک روشنی کی چمک اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرا سی گئی۔

وہ کھلے دروازے میں داخل ہوگئی۔

آنگن سنسان پڑا تھا۔

لگتا ہی نہ تھا، جیسے یہاں کوئی ذی روح رہتا ہو۔

وہ برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہی تھی کہ حارث باہر آیا۔

نرگس کو لگا، جیسے زمین و آسمان گردش میں آگئے ہوں۔ ہر چیز اس کے سامنے گھومنے لگی تھی۔ حارث تیزی سے اُس کی طرف آیا اور اُسے تھام لیا۔

"تم........ تم کہاں چلی گئی تھیں؟........ کہاں تھیں تم؟"

حارث نہایت بے قرار لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اور وہ اُس سے اپنا آپ چھڑا کر اُس کمرے میں آئی، جہاں سے حارث ابھی ابھی باہر آیا تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ اور سب ہی موجود تھے۔ ذکیہ خاتون بستر پر دراز تھیں۔ ماہ رخ اور نیلو اُن کے پائتی پر بیٹھی تھیں، جبکہ تنویر علوی کرسی پر دراز تھے۔ نرگس کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تب وہ بھاگ کر اُن کے قدموں سے لپٹ گئی اور رو دی۔

لگتا تھا، اس کا پورا وجود ہی آنسوؤں میں بہہ جائے گا۔

"تو کہاں تھی بیٹا؟........ بہت تلاشا ہے تجھے۔" انہوں نے اسے بازوؤں میں تھام کر اوپر اٹھایا اور پھر سینے سے لگا لیا۔

"دیکھ تو تیری مامی کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ سنبھل ہی نہیں رہی۔ اب تُو آگئی ہے تو یہ ٹھیک ہو جائے گی۔" تنویر علوی، نرگس کے سر پر ہونٹ رکھے کہہ رہے تھے۔

"ماما جانی!........ قسمت بہت زور آور ہوتی ہے، ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مقدر کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تو مقدر کے کھیل ہیں، نا کہ........"

"تم بجھارتیں کیوں بجھا رہی ہو؟........ بتاؤ نا۔" حارث اُس کی بات کاٹ کر گرجا۔

"دھیرج حارث!........ تم پریشان مت کرو میری بچی کو۔" تنویر علوی تو اب سنبھل سے گئے تھے۔ انہوں نے حارث کو سرزنش کی۔

"ماما جانی! میں سیف الرحمٰن کے ہاں تھی۔" نرگس نے آہستہ سے بتایا۔

"مگر........ مگر وہ تو گاؤں گیا ہوا تھا۔"

"جی! آج صبح ہی وہ اس کمرے میں آئے، جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ اور یہ "کارنامہ" ان کے قریبی دوست رائٹ ہینڈ نے انجام دیا تھا۔"

نرگس نے مختصراً اپنے اغوا کی کہانی سنا دی۔

"میں......میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" حارث مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

"وہ کہتا ہے کہ اس نے میرے اغوا کا حکم نہیں دیا۔"

"پھر یہ سب کیسے ہوا؟"

"بابا جان! میں ابھی جاتا ہوں اور......"

"آپ نہیں جائیں گے، حارث!" نرگس پہلی بار حارث سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں......؟" وہ حیرت سے بولا۔

"اب سیف الرحمٰن میرے شوہر ہیں۔" وہ نہایت اطمینان سے بولی۔

"کیا......؟" حارث تڑخا۔

"ہاں! صبح میرا نکاح ہوا ہے۔ اور اب انہوں نے مجھے خود بھیجا ہے، تاکہ میں یہ اطلاع دے دوں۔"

"مگر یہ سب کیسے ہوا؟" حارث کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"میری مرضی سے ہوا ہے یہ سب۔" نرگس بولی۔

"نرگس......!" تنویر علوی حیران تھے۔

"جی ماما جانی!" نرگس کی آواز رندھ گئی۔ "مجھ سے کچھ مت پوچھیے گا۔ بے شک، نکاح نامہ پر دستخط کرتے ہوئے میرا دل ناں......ناں......کی تکرار کر رہا تھا، مگر ذہن نے اس "مجبوری" کو سمجھ لیا تھا، جان لیا تھا، جس کی وجہ سے میں نے یہ قدم اُٹھایا۔ حالانکہ مجھے پتہ تھا، سیف الرحمٰن جسے میری آزادی کا پروانہ کہہ رہے ہیں، یہ نکاح نامہ جس پر میں دستخط کر رہی ہوں، میری قید کا حکم نامہ ہے۔ پھر بھی......پھر بھی ماما جانی! میں نے ایسا کیا کہ یہ.... یہ میری مجبوری تھی۔"

"کیسی مجبوری؟" حارث نے کہا۔

"میں یہ نہیں بتاؤں گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"کیوں......؟" حارث سانپ کی طرح پھنکارا۔

"ماما جانی! میں مزید کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔" نرگس نے حارث کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اگر تم کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتیں اور نہ ہی وہ "سچ" بتانا چاہتی ہو، جسے تم نے مجبوری کا نام دیا ہے تو سنو نرگس جمال! تمہارا اس گھر سے، اس گھر کے مکینوں سے کوئی تعلق نہیں۔" حارث کا لہجہ پتھر پھینک رہا تھا۔

"یہ گھر میرے ماما کا ہے حارث علوی! اور آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ ہے نا، ماما جی؟"

نرگس نے نہایت آس سے تنویر علوی کی طرف دیکھا۔ اور اس سے پہلے کہ تنویر علوی کچھ کہتے، حارث نے نرگس کا ہاتھ تھاما اور تقریباً اُسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا اور گرج کر بولا۔

"نکل جاؤ یہاں سے......کوئی ضرورت نہیں ہمیں تمہاری۔"

"حا......ر......ث۔"

"مت لو میرا نام اپنی زبان سے......میرا تم سے کوئی تعلق نہیں......آئی ہیٹ یو، نرگس سیف!"

"حارث! آپ تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔" نرگس نے بڑی آس سے کہا۔

"مجھے نرگس جمال سے محبت تھی۔ نرگس سیف سے نہیں۔ آئی سمجھ؟......چلی جاؤ، یہاں سے۔" حارث نے اسے گھر سے نکال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ چند لمحے تو انتظار کرتی رہی کہ شاید ماما جی آ جائیں۔

نیلو بھاگی آئے۔

شاید حارث اُس پر ترس کھائے۔

مگر نہ ماما جی آئے۔

نہ نیلو کی محبت نے جوش مارا اور نہ ہی حارث نے اس پر ترس کھایا۔

اُسے لگ رہا تھا، جیسے وہ لق و دق صحرا میں تنہا کھڑی ہو، اور اسے کوئی راستہ ہی نہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہائے ربا! میں کہاں جاؤں؟

میرا بھلا قصور کیا ہے؟

میں......میں نے کون سا جرم کیا ہے؟

میں نے تو ماما کی عزت بچانے کی خاطر خود کو داؤ پر لگا دیا اور......اور حارث! تم سے مجھے یہ اُمید نہ تھی حارث!......دیکھو تو، میں سیف الرحمٰن کی ہونے کے باوجود بھی دل میں تمہاری محبت چھپائے ہوئے ہوں۔ میرا دل اب بھی تمہارے نام پر بدن کی عمارت میں دھڑ دھڑا رہا ہے۔

اب بھی تمہارا نام میرے لئے باعثِ تسکین ہے۔

میری روح کو قرار تمہارے نام سے ہی ملتا ہے۔

حارث!........حارث! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ مجھے یقین تھا، تم بن بتائے ہی میری ساری مجبوریاں جان لو گے۔ کہ تم تو میرے اندر اُترے ہوئے ہو اور میرے اندر کے سارے موسموں سے واقف ہو۔ تم سے تو مجھے پتھروں کی اُمید نہ تھی........ مجھے یقین تھا، تم میرے زخموں پر مرہم رکھو گے۔

میری مجبوری سمجھو گے اور پھر میری طرح تم بھی مجبور ہو جاؤ گے۔ مگر میرا سارا یقین، سب اُمیدیں صحرا کی ریت ثابت ہوئیں۔ جو تمہارے شک کی ہوا سے بکھر گئی ہیں۔

''حارث........!'' اس کے لب کانپے اور روح میں ماتم ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ تب اس نے دیوار کو تھام لیا، جیسے یہی آخری سہارا ہو۔ اسی وقت سیاہ چمچماتی ہوئی ہنڈا اکورڈ اُس کے قریب آ کر رکی، باوردی ڈرائیور نے اُتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور نرگس پنا کسی پس و پیش کے کار میں بیٹھ گئی۔ اسی کار میں تو وہ یہاں تک آئی تھی۔

''کہاں چلیں جی؟''

''گھر۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''صاحب نے کہا تھا کہ آپ واپسی پر شاپنگ بھی کریں گی۔''

''شاپنگ........؟'' نرگس نے حیرت سے کہا۔

''جی!'' ڈرائیور نے کہا۔

''زمان خان! تم یہیں موجود تھے کہیں؟'' وہ بات پلٹ کر بولی۔

''جی بیگم صاحبہ!........ یہ صاحب کا حکم تھا۔ میں گلی کی نکڑ پر کھڑا رہا ہوں، آپ باہر آئیں میں فوراً آ گیا۔''

''اوہ........!'' نرگس کے لبوں سے آہ زخمی پرندے کی مانند آزاد ہوئی۔

تو سیف الرحمٰن! تمہیں علم تھا کہ نرگس جمال کو اب اس کے اپنے بھی قبول نہ کریں گے۔

تمہارے اندازے کس قدر درست ثابت ہوئے۔ دیکھو نا!

جس پر مجھے بے تحاشا مان تھا، اُسی نے میری بانہہ پکڑ کر دروازے سے باہر دھکیل دیا۔

کسی نے بھی اُسے منع نہیں کیا۔

کچھ بھی تو نہ کہا........ کیا میرا تعلق اتنا کچا تھا؟........ نرگس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جنہیں اس نے کمالِ ضبط سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پی لیا۔

''بیگم صاحب! پھر بازار چلنا ہے؟'' زمان خان پوچھ رہا تھا۔

''نہیں زمان خان! گھر چلو۔'' نرگس نے گردن سیٹ کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

سرخ سنگِ مرمر والے فرش کے برآمدے سے گزر کر جب وہ راہداری میں پہنچی تو اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ اجنبی جگہ........ اور اَن دیکھا ماحول........ وہ تو قید تھی اور پھر اسی کمرے سے وہ ڈرائیور کے ہمراہ چلی گئی تھی۔ اب وہ گومگو کی سی کیفیت میں مبتلا تھی۔

تبھی ایک کمرے سے سیف الرحمٰن نکل آئے۔ ''ارے........ تم آ گئیں؟'' وہ حیرت سے بولے۔ نرگس کو اُن کی حیرت مصنوعی سی لگی۔

''آپ کو پتہ نہیں تھا کہ میں آ جاؤں گی؟'' نرگس کا لہجہ کٹیلا تھا۔

''پتہ تھا۔'' وہ مسکرائے۔

''پھر یہ سوال کرنے کی ضرورت کیا تھی؟''

''مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ تم اس قدر جلد آ جاؤ گی۔ شاپنگ نہیں کی تم نے؟'' وہ ایک دم ہی بات بدل کر بولے۔

''ضرورت نہیں سمجھی میں نے۔'' نرگس اسی کمرے کی طرف بڑھی، جہاں سے سیف الرحمٰن نکلے تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئے۔

نرگس جہازی سائز کے بیڈ کے ایک کونے پر ٹِک گئی۔

''ایزی نرگس!''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''کیا کہا تمہارے ماموں نے؟''

''جو ایک غیرت مند شخص کو کہنا چاہیے تھا۔''

''غیرت مند۔'' سیف الرحمٰن ہنسے۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''جسے تم غیرت کہہ رہی ہو، وہ بے وقوفی ہے۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔''

''ہاں، جشن منانا چاہیے کہ آپ نے اُن کی بھانجی کو اغوا کر کے نکاح کر لیا ہے۔''

"میرا یہ مطلب نہ تھا۔"

"نیازی صاحب! اگر ایسی سچویشن سے آپ گزرتے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوتا؟" نرگس نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"صاف سی بات ہے، اگر آپ کی بیٹی سے میرے ماما اسی طرح شادی......"

"شٹ اپ......!" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کلیجہ دُکھا آپ کا؟" نرگس نے اُن کی لہو آشام آنکھوں میں دیکھا۔

"ہماری لڑکیاں یوں ٹکے ٹکے کے لوگوں کے سامنے نہیں آتیں۔ ٹی وی پر ہر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز نہیں ہوتیں۔" وہ سانپ کی طرح پھنکارے۔ "ہمارے زنان خانے میں مرد ملازمین کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہماری حویلی کی دیواریں اتنی اونچی ہیں نرگس بیگم! کہ وہاں پنچھی بھی پر نہیں مار سکتا۔"

"مجھے پتہ ہے، ان اونچی دیواروں والی حویلیوں میں کیسے چور دروازے ہوتے ہیں۔" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

"نرگس......!" وہ گرجے۔

"سچ سہنے کا حوصلہ میں نے خود میں پیدا کیا ہے۔ آپ بھی سچ سننے کا حوصلہ خود میں پیدا کریں۔" نرگس ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے بولی۔

"اگر......اگر تم میری محبت نہ ہوتیں تو پتہ نہیں، میں تمہارا کیا حشر کرتا۔" سیف الرحمٰن کا لہجہ نہ جانے کیوں ایک دم ہی نرم ہو گیا تھا۔ انہوں نے نرگس کو شانوں سے تھام کر دوبارہ بیڈ پر بٹھا دیا اور پاس ہی خود بیٹھ گئے۔

"پہلے روز ہی شوہر سے تلخ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" وہ اسے سمجھانے لگے۔

"تم ابھی ناسمجھ ہو۔ ازدواجی زندگی کی باریکیاں آہستہ آہستہ ہی سمجھو گی۔ رہنا تم نے یہیں ہے، نرگس! اپنی زبان اور انداز کو قابو میں رکھا کرو۔"

"دوسرے لفظوں میں، میں اپنی زبان کاٹ دوں۔" نرگس نے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میری یہ منشا تو نہیں ہے۔ تُو تو چہکنے والی بلبل ہے۔ تُو بول۔ تیرا لہجہ تو میری سماعتوں میں سُر گھول دیتا ہے۔ مگر حق بات بول، میں تیری ہر بات برداشت کرلوں گا، غلط بات نہیں۔" سیف الرحمٰن کا انداز ملتجیانہ تھا۔ نرگس مسکرادی اور بولی۔

"اور حکم؟"

"میں بھلا حکم دے سکتا ہوں تجھے؟......تُو بتا۔"

"میری خواہش ہے کہ میں پڑھوں۔"

"ضرور......مگر......"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی، نیازی صاحب! میں سر جھکا کر کالج جاؤں گی اور واپس آؤں گی۔ کسی سے کوئی بات نہ کروں گی۔ وعدہ۔ میں وعدوں پر جان دینے والی لڑکی ہوں۔" نرگس نے کہنے کو تو کہہ دیا، مگر اس کے اندر نجانے کون چیخ پڑا۔

"کب تم نے وعدہ پورا کیا ہے؟

تم نے تو کہا تھا، حارث! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ اور پھر کھو دیا......اب کیا جان دو گی؟

اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ میری جان کے خاتمے سے میرے ماما کی فیملی محفوظ ہے، حارث پر کوئی آنچ نہیں آنی تو میں ایسا کر گزرتی۔ مگر سیف الرحمٰن نے تو اُس کا دماغ ہی شل کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ دل کو ذہن کی دلیلوں سے سمجھاتی رہی اور سیف الرحمٰن نیازی اسے معلوم نہیں، مستقبل کے کون کون سے سہانے سپنے دکھاتے رہے۔ وہ ماؤف ذہن اور بند ہوتے قلب کے ساتھ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

اُسی شام سیف الرحمٰن اُسے لے کر اسلام آباد پہنچ گئے۔ تین روز وہ مری میں رہے۔ یہ شاید ہنی مون پیریڈ تھا۔ پھر واپس آگئے تھے۔

⊛......⊛......⊛

دستکیں کب کی مر چکی ہیں
اب کہاں کھڑکیاں کھلیں گی!

اور ایک ہفتہ بعد نرگس کالج جانے لگی تھی۔ سیف الرحمٰن کی منت کر کے اس نے کالج آنے اور جانے کے لئے رکشہ لگوایا تھا۔ وہ لوگوں کی نگاہیں نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ پھر سیف الرحمٰن بھی نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو اُن کی شادی کی خبر ہو۔

پہلے روز ہی وہ نیلو کو پورے کالج میں ڈھونڈتی رہی۔ پھر اس کی کلاس فیلو عذرا نے بتایا، نیلو آج کل کالج نہیں آ رہی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ کتنے ہی روز اُس نے نیلو کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔ شاید حارث نے یا پھر ماما نے نیلو کو کالج سے اُٹھوا لیا تھا۔ وہ کسی

سے کچھ پوچھ بھی نہ سکتی تھی۔

نرگس بہت ہی کم گو ہو گئی تھی۔ اُس کی سہیلیاں حیران تھیں۔ کسی کو بھی تو اُس پر گزرے حادثے کی خبر نہ تھی کہ وہ ہر رات کون سے کرب ناک لمحوں سے گزرتی ہے۔

لڑکیاں اُسے روک روک کر پوچھتیں کہ اب وہ پروگرام "جواں عزم" کی کمپیئرنگ کیوں نہیں کرتی؟

تب وہ پڑھائی کی مصروفیات کا بہانہ کر کے ٹال جاتی۔

لڑکیاں کہتیں۔

"ہم آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔"

وہ محبتوں پر پگھل پگھل جاتی، پر کچھ نہ کر سکتی تھی۔

پھر امتحان ہو گئے اور سیف الرحمٰن کے ساتھ وہ ورلڈ ٹور پر نکل گئی۔ دو ماہ بعد وہ لوگ واپس لوٹے تھے۔ تب ایک روز اُسے احساس ہوا کہ قدرت اُسے ایک خوب صورت سا روپ بخشنے والی ہے۔ اُس روز کئی ماہ بعد خوشی کی کرن اُس کے دل کے اندھیرے ایوان میں لہرائی۔

وہ خوشی خوشی ننھے مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئی۔ سیف الرحمٰن اُس کا یہ نکھرا نکھرا اور بدلا بدلا روپ دیکھ کر حیران تھے اور خوش بھی کہ واقعی وہ انہیں بے حد، بے حساب پیاری تھی۔ تبھی تو وہ اس سے یہ نہ کہہ سکے کہ انہیں اولاد کی خواہش نہیں۔ وہ اس کی خوشی کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ پہلی بار تو انہوں نے اس کے لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھلتے دیکھے تھے۔ اور نرگس پہلی بار انہیں واقعی "اپنی" لگی تھی۔

دن یوں ہی گزرتے رہے اور آخر ایک سہ پہر زندگی و موت کی کشمکش سے گزرتے ہوئے نرگس نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔

ہاسپٹل کے پرائیویٹ وی آئی پی روم میں پہلو میں لیٹے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر وہ خوش ہوتی رہی۔

سیف الرحمٰن نیازی اس کے چہرے پر بکھرتے رنگوں اور روشنیوں کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"تم نے کوئی نام بھی سوچا ہے؟"

"جی...... آپ سوچیں ناں۔"

"بھئی، تم اپنی پسند کا نام بتا دو۔"

"حارث۔" ایک دم ہی نرگس کے لبوں سے یہ نام ادا ہونا چاہ رہا تھا، مگر اُس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اب بھلا یہ نام لبوں پر لا کر قیامت تو نہیں مچانی تھی۔

"تم نے نام نہیں بتایا؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"جو آپ کی مرضی۔" نرگس نے آنکھیں موند لیں۔ اور پھر دونوں کی باہمی رضامندی سے نومولود کا نام سلمان نیازی تجویز ہو گیا۔

نرگس کے لئے تو ایک کھلونا ہی ہاتھ آ گیا تھا۔ قدرت نے کتنا اُس پر ترس کھایا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں رحم کیا تھا۔ نرگس خود کو بہت خوش اور مطمئن پاتی تھی۔ سلمان کو پا کر تو وہ ساری اذیتیں اور کلفتوں کو بھول گئی تھی۔ وہ سو جاتا تو پھر وہ کچھ اسٹڈی بھی کر لیتی کہ پرائیویٹ ایم۔اے کرنا چاہتی تھی۔

ایم۔اے کرنا اس کا بہت پرانا خواب تھا۔

وقت کے تھال میں دن سکے بن کر گرتے رہے۔ سلمان اب پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ جس روز اس نے پہلی بار نرگس کو "ما...... ما" کہا تھا تو نرگس کو لگا تھا، جیسے دنیا جہان کی ساری خوشیاں اس پر مینہ بن کر برسنے لگی ہوں۔ اُس کا جی چاہا، سلمان بار بار اُسے ما..... ما کہے اور اُس کا رواں رواں جواب دے۔

اپنی گول گول آنکھیں گھما کر سلمان اُسے دیکھتا تو نرگس کے اندر تک ٹھنڈک اُتر جاتی۔

اب اُسے جذبۂ ممتا کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ اُسے لگتا تھا، جیسے وہ واقعی معتبر ہو گئی ہو۔ سیف الرحمٰن پر تو وہ پہلے بھی توجہ نہ دیتی تھی، اب تو وہ بالکل ہی انہیں نظر انداز کرنے لگی تھی۔ مگر سیف الرحمٰن نیازی کی محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ وہ نرگس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتے۔ وہ انہیں بتائے بغیر ہی سلمان کے ساتھ آؤٹنگ پر چلی جاتی تو وہ کبھی باز پرس نہ کرتے۔ انہیں نرگس پر حد درجہ اعتبار تھا۔

پھر نرگس نے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔اے بھی کر لیا تو انہی دنوں ایسا حادثہ ہوا، جس نے نرگس کے وجود کی عمارت ڈھا کر رکھ دیا۔ جب سیف الرحمٰن نیازی بائی پاس آپریشن کی غرض سے امریکہ گئے تھے۔ آپریشن بھی کامیاب رہا تھا، پھر بھی وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی لاش ہی دیارِ غیر سے آئی تھی۔ اور یہ خبر بھی اسے ٹی۔وی اور اخبارات سے ملی تھی۔ وہ تو سیف الرحمٰن نیازی کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکی۔ رات بھر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے اور وہ ننھے سلمان کو سینے سے لگائے آنسو بہاتی رہی۔ اُس کے

سامنے تو کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

کہاں جائے؟

کیا کرے؟

صرف ساڑھے تین سال بعد ہی بیوگی اُس کا نصیب ہوگئی تھی۔

بے شک اُسے سیف الرحمٰن سے محبت نہ تھی، مگر کچھ بھی تھا، وہ اُس کا شوہر تھا۔ اُس کے بیٹے کا باپ تھا۔ سب سے بڑھ کر اُس کا چھپر تھا۔ آج نرگس کو احساس ہوا تھا کہ سیف الرحمٰن اُس کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا۔

وہ واپس تنویر علوی کے پاس بھی نہ جاسکتی تھی اور نہ ہی جانا چاہتی تھی کہ گزرے ساڑھے تین سالوں میں کب انہوں نے نرگس کی خبر گیری کی تھی۔ کبھی انہیں شاید احساس بھی نہ ہوا تھا کہ ان کی کوئی بھانجی بھی ہے۔ حالانکہ نرگس نے بارہا چاہا تھا، ماما جانی کے ہاں جانا۔

سڑکوں پر، بازاروں میں وہ چہرے کھوجتے تھے، جو وہ چھوڑ آئی تھی، بلکہ چھڑوا دیئے گئے تھے۔

کبھی کبھی اُس کا دل چاہتا تھا، کہیں تو ماما جانی مل جائیں۔

کبھی تو نیلو ہی ٹکرا جائے۔

اور اگر کبھی کہیں حارث مل گیا تو........؟

یہ سوچ کر ہی اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔ محبتوں کی ہجرت تو کبھی گوارا نہیں ہوتی۔

نہیں، مجھے حارث نہ ملے۔ نہ ہی میرا اُس سے ٹکرا ہو........ میں اُس کی آنکھوں میں نفرت برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ کپکپا کر رہ جاتی۔ مگر اب اُس کی خواہش تھی، کوئی ”اپنا“ آئے جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ بے تحاشا روئے۔ خواہ وہ ”اپنا“ حارث ہی ہو۔

اُسے یقین تھا کہ ”بہت کچھ“ کہنے کے بعد وہ ضرور اُس کے آنسو پونچھے گا۔

مگر وہ کیسے آتا؟

کیوں آتا؟

نرگس اپنی تنہائیوں کو ہی گلے لگا کر روتی رہی۔ گڑلاتی رہی اور کوئی بھی اُس کے آنسو پونچھنے نہ آیا۔ البتہ سلمان نے بارہا اپنی چھوٹی سی ہتھیلی سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”مما! ٹوں لوتی ہیں؟........ (مما! کیوں روتی ہیں؟)

وہ بیٹے کو بھی نہ بتا سکی۔ بھلا کہتی تو کیا؟

سیف الرحمٰن نیازی کے ہاں سے کوئی بھی نہ آیا تھا۔ کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ کوئی ”اور“ بھی سیف الرحمٰن کی زندگی میں شامل ہے۔

نرگس کو تو طرح طرح کی فکریں کھائے جارہی تھیں۔ تب ایک روز شیراز لغاری ایڈووکیٹ رحمت کا فرشتہ بن کر آگئے۔ سیف الرحمٰن کو گزرے دس روز ہوچکے تھے۔

”بیگم نیازی! نہایت رازداری سے یہ سب کچھ آپ کے نام نیازی صاحب نے کر دیا ہے۔ اور یہ کاغذات ہیں۔“

”مگر کیا انہیں موت کا علم تھا؟“ نرگس حیران تھی۔

”شاید........ جب اُن پر پہلی بار ہارٹ اٹیک گزشتہ برس ہوا تو انہوں نے مجھے بلوا کر وصیت لکھوائی تھی، جس کی رو سے یہ گھر اور بنک میں پچیس لاکھ ڈیپازٹ آپ کا ہے، اور آپ اس فکس ڈیپازٹ کے منافع کی حق دار ہیں۔ جبکہ وہ پچیس لاکھ سلمان کے نام ہیں۔ آپ صرف منافع لے سکتی ہیں، جو کہ ماہانہ تقریباً پینتیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔“ شیراز لغاری نے مختصراً تفصیلات بتائیں۔

”سیف الرحمٰن کے گھرانے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“

”اُن کی زندگی میں تعلق نہ رہا تو موت کے بعد تعلق کی کیا ضرورت ہے؟“ نرگس کے لبوں پر زہرخند پھیل گیا۔

”اور اگر آپ نے دوسری شادی کرلی تو پھر سلمان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”مطلب یہ کہ میں نیازی صاحب کے وکیل کی حیثیت سے سلمان کا گارجین ہوں گا۔ یہ میری صوابدید پر ہے کہ سلمان صاحب کو آپ سے ملنے دوں یا نہیں۔ مگر میں اتنا ظالم انسان نہیں ہوں، بیگم نیازی! آپ جوان ہیں، آپ کو سہارے کی ضرورت ہے۔ اور میں یہاں اپنے مؤکل سے انحراف کرلوں گا، بشرطیکہ آپ کا شوہر سلمان کو تسلیم کرے، بالکل اپنے بچوں کی طرح چاہے، اور........“

”پلیز لغاری صاحب! ابھی وہ باتیں مت کریں، جن کے بارے میں، میں نے اتنے دنوں میں ایک بار بھی نہیں سوچا۔“ نرگس نے اُن کی بات کاٹ کر ذرا ترش لہجے میں

کہا۔

"میں پہلے آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔" شیراز لغاری نے کہا۔

"زندگی میری ہے اور مجھے یہ اختیار ہے کہ اسے میں کس طرح گزاروں۔ جو طریقہ میرے لئے بہتر ہوگا، میں اسی طرح رہوں گی۔ اور کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔"

"ایز یُو لائیک!" شیراز لغاری نے کندھے اچکائے اور بولے۔

"سلمان کو مری بھیجنا ہے نا؟"

"کیوں؟" نرگس نے حیرت سے پوچھا۔

"نیازی صاحب کی بھی خواہش تھی۔"

"میری خواہش کی بھی کوئی اہمیت ہے، لغاری صاحب! میں اور میرا بیٹا یہیں، اسی شہر میں میرے ساتھ رہے گا۔ یہیں پڑھے گا۔"

"ٹھیک ہے، جو آپ کی مرضی۔ میری مدد کی ضرورت پڑے تو آپ مجھے کال کرسکتی ہیں۔"

"شکریہ جی........ میں ممنون ہوں آپ کی........ اور مجھے کبھی ضرورت پڑی تو ضرور آپ کو مدد کے لئے بلاؤں گی۔ میرا ہے ہی کون؟" نرگس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو نجانے کیوں، شیراز لغاری کا دل دُکھ سے بھر گیا۔ بھری بہار میں جو اُجڑ جائیں تو دُکھ ہوتا ہی ہے۔"

شیراز لغاری کے جانے کے بعد وہ سیف الرحمٰن نیازی کی وصیت کے کاغذات پڑھتی رہی اور بے آواز روتی رہی۔

کچھ بھی تھا، سیف الرحمٰن نے اُس کا خیال تو رکھا تھا۔ انہیں شاید علم تھا کہ انہیں کچھ ہوگیا تو نرگس کیا کرے گی؟ ظاہر ہے، نرگس نے اپنوں میں تو جانا نہیں تھا۔

شکر ہے، اُسے ٹھوکروں میں رہنا نہیں پڑا۔

اب تو اُس کی ساری خواہشیں اور اُمنگیں سلمان کے دم سے تھیں۔

اُس نے سیف الرحمٰن کی موت کا سوگ ضرور منایا تھا۔ عدت کی مدت پوری کی تھی۔

اور پھر زندگی اپنی روٹین پہ آ گئی تھی۔

تنہا تو وہ پہلے بھی تھی۔ مگر اب تنہائی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر بھی وہ تھک جاتی۔

تب وقت گزارنے کے لئے اس نے ایک اسکول میں جاب کرلی۔ حالانکہ جاب کی

اُسے ضرورت تو نہ تھی، مگر اب وہ اپنی صلاحیتوں کو دوبارہ آزمانا چاہتی تھی۔

کبھی وہ "ضرورت" کے لئے جاب کرتی تھی۔ ریڈیو، ٹی وی کے چھوٹے چھوٹے چیک اُس کے خرچ میں معاون ثابت ہوتے تھے۔ اور اب اُسے پیسوں کی ضرورت نہ تھی۔ وقت گزاری کے لئے اُس نے صرف دو ہزار پر ملازمت قبول کرلی۔ اُسے بچوں کو پڑھا کر روحانی مسرت ہوتی، اب اُسے پڑھانا اچھا لگتا تھا۔

یوں ہی بہت سارے مہینے گزر گئے۔ سلمان کو اُس نے مونٹیسری اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ سلمان کو اسکول سے زمان خان ہی لے آتا تھا۔

انہی دنوں پی سی سی کی طرف سے آسامیاں نکلیں تو نرگس نے بھی اپلائی کردیا۔ محبت میں ناکامی کے بعد اور جگہ تو کامیابیاں ہی اُس کی منتظر تھیں۔ شاید اسی لئے تو اُسے گورنمنٹ کالج میں جاب مل گئی۔ اُسے کوئی سفارش نہ تلاشنی پڑی۔ نصیب اُس کا سفارش بن گیا تھا۔

اب وہ مطمئن تھی۔ جس روز اُس نے کالج جوائن کیا تو اُسے لگا، جیسے ادھورا خواب آج پورا ہوگیا ہو۔ بہت جلد وہ لڑکیوں کی پسندیدہ لیکچرار بن گئی۔ اُسے خوشی تھی کہ اُسے اب تک کسی نے نہ پہچانا تھا۔

حالانکہ جن دنوں وہ "جواں عزم" پروگرام کرتی تھی تو اُس کی دھوم تھی، سب جان لیتے تھے، پہچان لیتے تھے کہ وہ نرگس جمال ہے۔ لیکن شاید گزرے پانچ برسوں میں اس میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔

⊛......⊛......⊛

اگر کچھ پا نہیں سکتے تھے، کھونا چاہئے تھا
ہوا کچھ بھی نہیں ہے، کچھ تو ہونا چاہئے تھا
اب آنسو ہی نہیں آنکھوں میں لیکن غم بہت ہے
ہمیں اِک حادثے پہ کھل کے رونا چاہئے تھا

پریشانی سی کوئی پریشانی تھی بھلا۔ آج جب وہ کالج سے آئی تو سلمان گھر نہیں پہنچا تھا۔ جبکہ زمان خان بھی موجود نہ تھا۔

"سلمان کہاں ہے؟" نرگس نے ملازمہ سے پوچھا۔

"ابھی وہ نہیں آئے جی۔" فضلاں سعادت مندی سے بولی۔

"اب تک؟" نرگس نے وال کلاک کی جانب دیکھا، جو سہ پہر کے سوا تین بجا رہا تھا۔

"پتہ نہیں جی...... خدا خیر کرے۔" فضلاں نے دل پر ہاتھ رکھا تو نرگس کو لگا، جیسے کمرے میں سناٹا گونج رہا ہو۔ تھا بھی ایسا ہی۔ اُس کے وجود میں سوئیاں چبھنے لگیں۔

"یا اللہ! تیرے حوالے ہے میرا بیٹا۔" بے اختیار اُس کے لب کانپے۔ دل طرح طرح کے وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسکول فون کر کے پوچھنا فضول ہی تھا کہ اُسے پتہ تھا، اسکول بند ہو چکا ہوگا۔ پھر زمان خان بھی تو ساتھ ہے۔

نرگس نے خود کو تسلی دی۔ مگر ممتا تو کسی بھی تسلی کو نہیں مانتی۔ شاید گاڑی خراب ہو گئی ہو۔

چین نہ آیا تو اس نے ورکشاپ فون کر دیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ گاڑی نہیں آئی۔

تب نرگس کو لگا، جیسے لہر لہر کی صورت کوئی چیز اُس کے قدموں کے راستے نکلتی چلی جا رہی ہو۔

تبھی فضلاں اُس کے لئے چائے لے آئی۔

"زمان خان نے فون بھی نہیں کیا؟" اس نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں جی...... وہ تو ایک بجے گیا ہے، سلمان میاں کو لینے اپنے وقت پر۔" فضلاں نے دوبارہ وضاحت کی۔

"کہیں سلمان کو کسی نے اغوا نہ کر لیا ہو؟"

یہ خدشہ سانپ کی طرح سرسراتا ہوا اُس کے ذہن میں اُتر گیا۔

مگر میرا کون دشمن ہے؟

کسی کو کیا غرض کہ وہ سلمان کو اغوا کرے؟ خود کو اُس نے تسلی دی۔

وقت تھا کہ کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔

کیا کرے؟

کہاں جائے؟

کوئی راستہ بھی تو نظر نہ آ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

وقت کی طنابیں کھینچ لے۔

مگر ظالم وقت تو گزرتا ہی جا رہا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور نرگس کو لگ رہا تھا کہ جیسے اُس کی زندگی کی شام بھی ڈھل رہی ہو۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اُس سے تو سانس بھی مشکل سے لی

جا رہی تھی، پھر چائے کے سِپ بھلا وہ کس طرح لیتی؟ اُسے لگ رہا تھا کہ اگر سلمان نہ آیا تو اُس کی سانس ہی جسم کا ساتھ چھوڑ دے گی۔

تبھی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ نرگس کو لگا، جیسے کسی نے چیخ ماری ہو۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!" اُس کی تھرتھراتی ہوئی آواز نکلی۔

"مما! میں سلمان بول رہا ہوں۔"

"بیٹا! کہاں ہو تم؟" نرگس نے بے قراری سے پوچھا۔

تبھی کسی نے سلمان سے ریسیور چھین لیا اور اپنی کرخت آواز میں بولا۔

"بیٹے کی آواز آپ نے سن لی ہے، بیگم نیازی!...... اگر بیٹے سے ملنا چاہتی ہو تو کل تک پانچ لاکھ روپے نہر والے پُل پر رکھ جاؤ۔ خبردار! اگر کسی اور کو یا پولیس کو اطلاع دی۔ اور سنو، نوٹ پرانے ہونے چاہئیں۔"

"لیکن میں کہاں سے انتظام کروں؟ میرے پاس تو......" وہ گڑگڑائی۔ مگر وہ ظالم تو کوئی جواز سننے کو تیار نہ تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ تم سیف الرحمٰن نیازی کی بیوہ ہو۔ اور وہ اتنا کمینہ نہیں تھا کہ تمہیں کچھ نہ دے گیا ہو۔" وہ سفاکی سے ہنسا۔ "کل شام ڈھلے نہر والے پُل پر...... یاد سے۔"

پھر سلسلہ منقطع ہو گیا اور نرگس کے تو حواس ہی جاتے رہے تھے۔

پانچ لاکھ، اتنی بڑی رقم۔

میں کہاں سے دوں......؟

گھر میں اتنی بڑی رقم تو نہ تھی۔ اور بنک میں جو فکس ڈپازٹ تھا، وہ سلمان کے نام تھا۔ اس کے تو صرف منافع کی وہ حق دار تھی۔

"شیراز لغاری۔"

اس کے ذہن میں اس کا نام کوندا۔

مگر "مجرم" نے کہا تھا، کسی کو بھی اطلاع نہیں دینی۔

پھر تمہاری مدد کیسے ہوگی؟

ذہن نے دلیل دی۔

نرگس کو لگ رہا تھا، جیسے کسی نے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے پھینک دیا ہو۔

زمان خان کہاں گیا......؟

سلمان اگر اغوا ہو گیا ہے تو پھر۔

کہیں زمان بھی تو اُن سے نہیں مل گیا......؟

نہیں، نہیں...... وہ بہت وفادار ہے۔ سلمان کو اس نے گودوں کھلایا ہے۔ ذرا سلمان کو کچھ ہو جائے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ابھی پچھلے سال ہی تو لان میں فضلاں کے نواسے کے ساتھ کرکٹ کھیلتے ہوئے سلمان کے کندھے پر گیند لگ گئی تھی تو زمان خان اُسے بازوؤں پر اُٹھا کر بھاگا بھاگا ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ پھر رات کو اُٹھ اُٹھ کر بار بار طبیعت پوچھتا رہا تھا۔ اُس روز زمان خان نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

یہ تو ممکن ہی نہیں۔ اس نے ذہن کے خیال کو جھٹکا۔

پھر زمان خان کہاں ہے؟

سوالیہ نشان تھا، جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ حواسوں کو اس نے قابو میں ہی رکھا تھا۔

”حارث علوی!...... میں نے کبھی تمہیں اپنی مدد کے لئے نہیں پکارا...... مگر...... مگر اب مجھے ضرورت ہے۔ اپنے لئے نہیں، اپنے بچے کے لئے، جو میری کُل کائنات ہے۔ میں بہر طور اُسے پانا چاہتی ہوں۔ اور میرے دل پر جس نے وار کیا ہے، اُسے بھی کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ تاکہ وہ مجرم آئندہ کسی ماں کے دل پر وار نہ کر سکے۔

دو ماہ قبل ہی تو حارث علوی کا شہر میں بطور ایس ایس پی تقرر ہوا تھا۔ اور یہ خبر اُسے اخبارات کے ذریعے ملی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ وردی میں حارث علوی کی تصویر دیکھتی رہی تھی۔

تو...... تم نے اپنے خوابوں کی تعبیر پا لی۔

انجانا سا خوشی کا احساس رگ و پے میں سما گیا تھا۔

ماما جانی کس قدر خوش ہوں گے۔

مامی جی بھی۔ پتہ نہیں مجھے بھی کسی نے یاد کیا ہو گا، یا نہیں......؟

تو حارث علوی! کتنا وقت لگا تمہیں یہاں تک پہنچنے میں۔ اتنی عمر تو نہیں گزری......؟

اُس نے ڈائریکٹری میں ایس۔ ایس۔ پی ہاؤس کا نمبر تلاشا اور پھر فون پر نمبر پش کئے۔ اسے واقعی مدد کی ضرورت تھی۔ سلمان کو وہ زندہ پانا چاہتی تھی اور مجرموں کی صرف نشاندہی کرنا مقصود تھا۔

بعض مرتبہ مجرم اپنی ڈیمانڈ پوری ہونے کے باوجود اغوا کنندہ کو واپس نہیں کرتے۔ ایسی کئی مثالیں تھیں۔

دوسری ہی بیل پر ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

”ہیلو......!“ نسوانی آواز ایئر پیس میں اُبھری اور نرگس کا دل چاہا، یہ آواز سنتی رہے۔ کتنے عرصے بعد اُس نے ماہ رُخ کی آواز سنی تھی اور پہچان لیا تھا۔ آٹھ سال کوئی کم مدت تو نہیں ہوتی۔

”جی، آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”یہ ایس۔ ایس۔ پی ہاؤس کا نمبر ہے نا؟“

”ہاں جی۔“

”ایس۔ ایس۔ پی صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”ہولڈ رکھئے۔ میں دیکھتی ہوں۔“

”کیا وہ......“

”ابھی ابھی آئے ہیں کہیں باہر سے۔“ ماہ رخ نے جلدی سے وضاحت کی اور کریڈل پر ہاتھ مار کر شاید وہ ایکسٹینشن پر حارث کو اطلاع دے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ لائن پر تھا۔

”بھائی! کوئی خاتون آپ سے بات کریں گی۔“ ماہ رخ نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

”جی...... السلام علیکم!“ حارث کی بھاری اور ایک دم چھا جانے والی آواز ایئر پیس کے ذریعے اُس کی سماعتوں میں اُتری۔

”وعلیکم السلام......!“ نہایت آہستگی سے اُس نے کہا اور پھر بولی۔ ”سر! مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ شہر کے راکھے ہیں نا؟“

”آپ کون ہیں؟“ حارث جان کر انجان بن گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا، دوسری جانب کون ہے۔ یوں ہی تو عرصے بعد اس کا دل نہ دھڑکا تھا۔ ایسے ہی تو ہاتھ نہ کانپے تھے۔

”میں ایک شہری ہوں، جس کی عزت، جان و مال اور اولاد کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے۔“

"وائے ناٹ....... میں نے کب انکار کیا ہے؟ لیکن اب آپ کا کیا مسئلہ ہے؟" وہ نہایت متانت سے بولا۔

تب مختصراً نرگس نے تمام صورتِ حال بتا دی۔

"آپ کو انہوں نے منع نہیں کیا کہ پولیس کو اطلاع نہ دیں۔"

"ضروری ہے کہ میں ان کے کہنے پر عمل کروں؟ اور یوں بھی جناب! میں کوئی نشانی بتانا چاہتی ہوں، تاکہ آئندہ کسی ماں کا دل نہ کچلا جا سکے۔ اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔"

نرگس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ حارث علوی تو بس ریسیور کو دیکھتا رہ گیا۔

تو....... تو نرگس! آج تمہیں کسی اپنے کی مدد کی ضرورت تھی تو تم نے مجھے ہی پکارا۔" وہ اُسے جتا نہ سکا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

میں نے تو کبھی نہیں چاہا، تم میرے سامنے آؤ....... میں اپنی شکست کا نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور تم میری شکست کا نشان ہو۔

"کس کا فون تھا بھائی؟" ماہ رخ چائے کا مگ لئے آ گئی۔

"کام تھا خاتون کو۔" حارث نے نہ کام بتایا اور نہ ہی خاتون کا نام۔ لیکن اس کے دل میں تو جوار بھاٹا آ ہی گیا تھا۔

کتنی پریشان ہو گی وہ۔

یہی احساس، حارث کو بے چین کئے دے رہا تھا۔

⊛......⊛......⊛

بڑی مشکل سے رات کی سحر ہوئی تھی۔ ساری رات ہی نرگس کی آنکھوں میں کٹی تھی۔

وہ نماز پڑھ کر جاء نماز تہہ کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ لپک کر اس نے فون اٹھایا۔

دوسری طرف وہی کرخت آواز تھی۔

"ہاں، بیگم نیازی! انتظام کیا.......؟"

"انتظام تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور میرے پاس جو کچھ ہے، میرے بیٹے کا ہے۔"

"ہمیں صرف پانچ لاکھ چاہئے۔"

"دیکھیں بھائی!" نرگس کی آواز بھرا گئی۔

"کیا.......؟"

"آپ کو پتہ ہی ہوگا، میں بیوہ عورت ہوں۔ اتنی رقم تو نہیں ہے۔ میرا زیور ہے، جو میں سارا کا سارا لے آؤں گی۔ وہ پانچ لاکھ سے زائد کا ہی ہے۔ اور نقد رقم صرف سوا لاکھ

ہے۔"

"مگر ہمیں رقم چاہئے۔ زیور ہم نے کیا کرنے ہیں؟"

"میں کہاں سے لاؤں رقم؟"

"زیور بیچ دو۔" مشورہ دیا گیا۔

"مگر بھائی.......!" اس نے کہنا چاہا۔

"ہم دو روز بعد رابطہ قائم کر لیں گے۔"

"آپ سمجھیں تو میں....... میں......." نرگس کی آواز بھرا گئی اور دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

دو روز اور مجھے پل صراط پر چلنا ہوگا۔

نہیں، نہیں میرے رب! یہ میرے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔

مجھے نہ ڈال اس آزمائش میں....... میں بہت بزدل عورت ہوں۔

پلنگ کی ٹیک سے سر ٹکا کر وہ بے حساب رو دی۔ کوئی بھی تو اس کے آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔

زمان خان بھی اب تک نہ آیا تھا۔ یقیناً اسے بھی ان ظالموں نے نقصان پہنچایا تھا۔

کوئی نہ کوئی بات تو ضرور تھی۔

اور بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اسے اپنا زیور اونے پونے فروخت کر دینا چاہئے کہ اس کے بغیر چارا بھی نہ تھا۔

انہوں نے اب دو روز بعد رابطہ قائم کرنے کو کہا تھا اور نرگس کے لئے تو ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔

کوئی بھی تو نہ تھا، جس کے گلے لگ کر اشک بہا لیتی، اپنے دل کا بوجھ ہی ہلکا کر لیتی۔

بازار بھی دس بجے کے بعد ہی کھلتے تھے۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا، گھڑی کی سوئیوں کو گھما کر رکھ دیتی۔

فضلاں اُس کے لئے ناشتہ لے آئی تھی۔

"میں....... میں ناشتہ کروں گی، فضلاں؟"

"بیگم صاحبہ! سلمان میاں ٹھیک ہی ہوں گے۔ آپ کچھ کھا پی لیں ناں۔" فضلاں رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اُس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ وہ بھی ساری رات

نرگس کے ساتھ جاگی تھی۔ نہ دلاسا دیا تھا، نہ ہی وہ خود اس پوزیشن میں تھی۔

''فضلاں! صرافہ بازار چلنا ہے۔'' نرگس نے آہستہ سے کہا۔

''بہتر جی۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

پھر فضلاں کے مجبور کرنے پر نرگس نے آدھا گلاس دودھ لیا تھا۔ وہ بھی بہت مشکل سے اس کے اندر اُترا تھا۔

اس وقت تو وہ سلمان کے ساتھ ناشتہ کرتی تھی۔ وہ نہ تھا تو نرگس کو لگ رہا تھا، جیسے پوری کائنات ہی سُونی ہو کر رہ گئی ہو۔

اور اس وقت وہ فضلاں کے ساتھ بازار جا رہی تھی کہ پھر فون کی گھنٹی بجی اور نرگس کا دل بھی دھڑک اُٹھا۔

''جی........'' اُس کی کپکپائی ہوئی آواز ماؤتھ پیس میں داخل ہوئی۔

''سنیں بیگم نیازی! ہمیں زیور ہی دے دیں۔ ہم کہاں تک آپ کے بیٹے کی حفاظت کریں۔''

''جیسے تمہاری مرضی بھائی!'' نرگس تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

''بس دھوکا نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے سوچا، تم عورت ذات ہو، کہاں گھومتی رہو گی۔ کتنا زیور ہے؟''

''تقریباً ڈیڑھ سو تولہ۔''

''بس ٹھیک ہے، تم شام کو لے کر آ جاؤ۔''

''سنو! میرا بیٹا مل جائے گا نا؟''

''ہماری ڈیمانڈ پوری ہونے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد۔''

''فوراً کیوں نہیں؟''

''ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں، بیگم نیازی! کہ ایک ہاتھ دو اور دوسرے ہاتھ لو والا معاملہ کریں۔ ہم رقم اور زیور دیکھیں گے، پرکھیں گے، پھر تمہارا بیٹا تمہارے پاس ہو گا۔ فکر مت کرو، ہم وعدے کے پابند ہیں۔'' کرخت آواز والے نے کہا اور سلسلہ پھر منقطع ہو گیا۔ نرگس کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

اُسے اطمینان تھا کہ اُس کا بیٹا محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ اُسے کچھ بھی نہ چاہئے تھا۔

گیارہ بجے کا وقت تھا، جب زمان خان زخمی حالت میں گھر داخل ہوا اور نرگس کے قدموں میں گر گیا۔

''بیگم صاحبہ! میں نے اپنے ہوش میں بہت کوشش کی کہ سلمان صاحب تک ان کا ہاتھ بھی نہ پہنچے۔ مگر ظالموں نے مجھے زخمی کر کے بے ہوش کر دیا۔''

''مگر اغوا کہاں کیا گیا؟''

''اسکول سے واپسی پر سلمان میاں ضد کرنے لگے کہ وہ سرسوں کے کھیت دیکھیں گے۔ میں انہیں شیخوپورہ سے باہر لے گیا تھا اور وہیں........''

''زمان خان! تم نے اُسے منع نہیں کیا؟''

''بیگم صاحبہ! وہ کسی کی مانتے ہیں بھلا؟ وہاں بس سنسان سڑک پر یہ حادثہ ہو گیا۔ تین کاروں میں آدمی تھے۔ کلاشنکوف ان کے ہاتھوں میں تھیں۔''

''تم رات بھر کہاں رہے؟''

''مجھے ان لوگوں نے ہاسپٹل پہنچا دیا تھا۔ اور اب میں زبردستی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ سر میں سخت تکلیف ہے۔'' زمان خان کے سر پر واقعی پٹی بندھی ہوئی تھی اور غالباً اس کا بازو بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ پلستر چڑھا ہوا تھا۔

''گاڑی کہاں ہے؟''

''وہ جی........ شاید وہیں ہو گی۔ میں تو رکشہ پر آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' نرگس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور پھر اُسے تاوان کے بارے میں بتانے لگی۔

''تم آرام کرو۔''

''آپ اکیلی جائیں گی؟''

''ہاں........ اب تم بھی تو ٹھیک نہیں ہو۔''

''پھر بھی بیگم صاحبہ!''

''فکر نہ کرو۔ میں تنہا ہی جاؤں گی۔'' نرگس نے ہاتھ اٹھا کر اُس کی بات کاٹ دی۔

اور پھر شام ڈھلے اُس کی سرخ ہنڈا اسوک نہر کی طرف دوڑی جا رہی تھی، جسے نرگس خود ڈرائیو کر رہی تھی۔

وہ جگہ نہایت سنسان تھی، جہاں اسے بلایا گیا تھا۔

نرگس مخصوص جگہ جا کر رک گئی۔ تبھی ایک فقیر اُس کے قریب آ گیا۔

''اللہ کے نام پر جی۔''

''اب نرگس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہی وہ شخص ہے، جسے بریف کیس دینا ہے یا کسی

اور کو۔

”بی بی! پانچ روپے دے دو۔ میں نے روٹی کھانی ہے۔“

”بریف کیس اُٹھالو، میری گاڑی سے۔“

”مجھے آپ پیسے ہی دیں۔ میں پولیس.........“

”اوہ.......“ نرگس نے جلدی سے پرس میں سے پانچ کا نوٹ نکال کر اُسے تھما دیا اور وہ دعائیں دیتا آگے بڑھ گیا اور درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ مطلوبہ مجرموں کا پتہ ہی نہ تھا۔

اندھیرا پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ پھر دُور ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس محسوس ہوئیں۔ اور پھر وہ گاڑی اُس کے قریب ہی آ کر رُکی۔ نقاب پوش اُس کی طرف بڑھا۔

”لائی ہو رقم؟“ وہی آواز جو فون پر وہ سنتی تھی۔

”ہاں......کار کی فرنٹ سیٹ پر بریف کیس رکھا ہے۔“ نرگس نہایت اعتماد سے بولی۔

”تمہارا بیٹا ایک گھنٹہ بعد آ جائے گا۔“ اس نے کہا۔ اُس کے ساتھی نے، جو کار ڈرائیو کر رہا تھا، بریف کیس اٹھالیا اور پھر وہ دونوں فوراً چلے گئے۔

نرگس پلٹ آئی۔ اب اُسے سلمان کا انتظار تھا۔ اور واقعی وہ ایک گھنٹے بعد آ گیا تھا۔ نرگس کو لگا، جیسے اُس کے سُونے گھر میں بہار آ گئی ہو۔ اغوا کی کہانی اُس نے بھی وہی سنائی تھی، جو اُسے زمان خان سنا چکا تھا۔ نہایت سکون سے وہ سلمان کو لپٹا کر سوئی تھی۔ کسی کو پتہ نہ چلا تھا، کتنا بڑا سانحہ اُس پر گزر گیا تھا۔

⊛......⊛......⊛

مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر فضلاں نے نرگس کو اطلاع دی۔

”کون ملنے آیا ہے مجھ سے؟“ وہ حیران تھی۔ گزرے آٹھ برسوں میں کبھی بھی کوئی نہ آیا تھا۔

نرگس سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئی اور پھر ٹھٹک کر رہ گئی۔

سامنے ہی حارث علوی کھڑا تھا اور میز پر وہی بریف کیس رکھا تھا، جو رات کو وہ برائے تاوان دے کر آئی تھی۔

”یہ آپ کی امانت ہے، بیگم نرگس!“ وہ نہایت متانت سے بولا۔

”میں مشکور ہوں آپ کا کہ آپ خوف زدہ نہیں ہوئیں اور بروقت مجھے اطلاع دے دی۔ ہم نے بھی بس اتنا انتظار کیا کہ آپ کا بیٹا بحفاظت پہنچ جائے، پھر کارروائی کی

جائے۔ خدا کا شکر ہے، رات ہمارا چھاپہ کامیاب رہا اور پورا گروہ گرفتار ہو گیا ہے۔ آپ اپنا سامان دیکھ لیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ سامان پورا ہی ہو گا۔ میری دولت تو میرا بیٹا ہے۔ مجھے ان زیورات کی ضرورت نہیں ہے۔“

”حیرت ہے۔“

”حیرت کی اس میں کیا بات ہے؟“

”میں تو سمجھا تھا، آپ کو ان کی ضرورت ہو گی۔“ لہجہ کٹیلا تھا۔

”بعض مرتبہ سمجھ غلط بھی ہوتی ہے۔ وہ نہیں ہوتا، جو ہم سمجھتے ہیں۔“ نرگس نے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی، وہ اب تک اُسے زر پرست سمجھتا رہا ہے۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ وہ کندھے اُچکا کر بولا۔ پھر قدم جانے کے لئے بڑھائے تو بے ساختہ ہی نرگس کے لبوں سے نکلا۔

”ماما کا کیا حال ہے؟........ ماں جی کیسی ہیں؟“

”بھلائے نہیں پرانے رشتے؟“ وہ بولا۔

”بھلا رشتے بھلائے جاتے ہیں؟“

”توڑے تو جاتے ہیں نا۔“

”اب تک میری طرف سے آپ کا دل صاف نہیں ہوا۔“

”جو لوگ خوابوں کے تاج محل توڑ دیں تو جب تک وہ کرچیاں چبھتی رہتی ہیں، تکلیف ہوتی رہتی ہے۔ نفرتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔“

”آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، حارث؟“ کتنی آس سے اس نے پوچھا تھا۔

”شاید۔“

”یقیناً کیوں نہیں؟“

”جب خود پہ اعتماد نہ ہو تو ہم ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔“ حارث نے کہا اور پھر باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ اسے روک بھی نہ سکی۔

حیرت ہی تو تھی کہ اسی شام ماما اور ماں اسے لینے آ گئے۔

”کچھ نہیں سنتا۔ آخر کب تک تنہا رہو گی؟ ساری عمر پڑی ہے۔“ ذکیہ خاتون نے کہا۔ ”میں اگر بے ہوش نہ پڑی ہوتی تو دیکھتی، کون تجھے اس گھر میں آنے سے منع کرتا۔“

"مامی جی! میرا تو بازو پکڑ کر گھر سے نکالا تھا، حارث نے۔" لبوں پر شکوہ مچلا تو آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔

"اب نکال کے دیکھے۔ اُس گھر میں تُو رہے گی اور وہ بھی جلدی آیا کرے گا۔ کہ تُو اس کا انتظار کرے گی نا۔"

"لیکن مامی!"

"اب کچھ نہیں۔ بہت اکیلی رہ لی۔ پہلے مدد کے لئے بلاتی تو ہم آ جاتے۔ آخر ناخنوں سے گوشت جدا ہوتا ہے کبھی؟" تنویر علوی نے پیار سے کہا۔

"ہم جائیں گے نانا، نانی کے ساتھ۔" سلمان نے ایک دم ہی فیصلہ سنا دیا تو وہ بھلا کب انکار کر سکتی تھی۔

اور صرف ایک ماہ بعد ہی وہ حجلہ عروسی میں حارث علوی کا انتظار کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

یا خدا! یہ آٹھ سال کا بن باس کیوں میرے مقدر میں لکھا تھا؟....... اگر ہم دونوں کو ایک ہی کرنا تھا تو اتنی لمبی جدائی کیوں ڈالی تھی؟....... یوں ہی ہونا تھا تو اتنا سفر طے کیوں کرایا تھا؟

پھر حارث آیا اور اُس کا گھونگھٹ اُلٹ کر بولا۔

"نرگس! جذبوں اور چاہتوں کی شدتوں پر اب مجھے اعتبار آیا ہے۔ میں تیری چاہتوں کا محافظ رہا ہوں، میرا خدا گواہ ہے، میں نے اپنا کوئی جذبہ کسی پر نچھاور نہیں کیا کہ یہ تیری امانت تھے۔ اب تُو بتا، کیا چاہتی ہے؟"

"جو آپ چاہتے ہیں، حارث!" وہ آہستہ سے بولی۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ........

آؤ مل جل کے بانٹ لیں دونوں
اِک اِک عکس اپنے خوابوں کا"

"یونہی ہوگا۔" نرگس نے اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا تو حارث نے اس کا ہاتھ تھام کر دبا لیا۔ نرگس کو لگا، جیسے وہ تپتے صحرا میں چلتے چلتے ایک دم ہی ٹھنڈی چھاؤں میں آ گئی ہو۔ اُس نے حارث کے کندھے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

❀......❀......❀

ایک بار ملو ہم سے

ٹرین اپنی پوری رفتار سے کراچی کی سمت بھاگی جا رہی تھی۔

ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

زمان احمد ٹرین کی کھڑکی پر بازو رکھے، مشرق سے اُبھرتے سرخ سورج کو دیکھ رہا تھا۔ صبح کاذب کا اُجالا پھیلا ہوا تھا اور پورا آسمان اس وقت لہو جیسی سرخی میں ڈوبا ہوا تھا اور اس سرخی میں سورج ایک بڑے سے، دہکتے ہوئے انگارے کی صورت اُبھر رہا تھا۔ پھر اُس کی نظریں تیزی سے دوڑتے بھاگتے درختوں اور بجلی کے کھمبوں میں اٹک جاتیں۔ وہ یہ سب اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے کہ کوئی ننھا بچہ ہو اور یہ سب پہلی بار دیکھا ہو۔ اُس کی نظریں کبھی سورج پر جم جاتیں اور کبھی درختوں میں اُلجھنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ مگر ذہن کے اُفق پر ثمینہ عثمان اپنی تمام تر شرارتوں کے ساتھ اُبھر رہی تھی۔

ثمینہ عثمان کراچی یونیورسٹی میں ایم اے فائنل کی طالبہ تھی اور زمان کے سب سے بڑے بھائی عثمان احمد کی بڑی اور لاڈلی بیٹی تھی اور زمان احمد سے چار سال چھوٹی تھی۔

رشتے کے لحاظ سے زمان احمد کی وہ بھتیجی لگتی تھی، مگر اس شریر لڑکی نے اسے کبھی بھی چاچا نہ سمجھا تھا اور نہ ہی کہتی۔ اپنی طرف سے ہی اُسے زمان بھائی کہتی اور بھائی کے رشتے کے علاوہ اُس سے دوستی کا بھی اٹوٹ رشتہ جوڑ لیا تھا۔ بس کبھی موڈ ہوتا یا اپنی کوئی بات منوانی ہوتی تو "چاچو" کہہ دیتی۔ ورنہ ہر بات میں زمان بھائی یہ ہوا، زمان بھائی، فلاں جگہ چلیں۔ زمان بھائی یوں کریں، وہ کریں۔

اُس نے کبھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ زمان اس سے بڑا ہے۔ پھر اُس کے پپا کا بھائی بھی۔ ایک احترام کا مقدس رشتہ دونوں کے درمیان قدرت نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر وہ تو اُس کے ساتھ اس طرح لڑتی جھگڑتی جیسے کہ اوپر تلے کے بھائی بہنوں میں ہاتھا پائی ہوتی

ہے، اور کہتی تھی۔

"زمان بھائی! اگر میرا کوئی بڑا بھائی ہوتا تو بالکل آپ ہی جیسا ہوتا۔"

اور زمان بھی تو اسے بہنوں کی طرح چاہتا، دوستوں کی طرح پیار کرتا۔ اپنا ہر راز وہ جب تک ثمینہ کو نہ بتا دیتا، اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں زمان کے جتنے بھی افیئر چلے تھے، اُن سب کے بارے میں تفصیلاً اُس نے ثمینہ کو بتا دیا تھا۔ طویل طویل خط لکھتا تھا، فون پر دیر تک باتیں کرتا اور جب کراچی آتا یا ثمینہ علی پور چلی جاتی تو پھر رات گئے تک وہ دونوں باتیں کرتے رہتے۔ دنیا جہاں کی باتیں، جن کا کوئی سر پیر نہ ہوتا۔ اس عرصے میں وہ کئی بار لڑتے اور پھر تھوڑی دیر میں مان بھی جاتے۔

کبھی کبھی ثمینہ ترنگ میں ہوتی تو کہہ دیتی۔

"یار چاچو! تم لڑکیوں کو بے وقوف کیسے بناتے ہو؟"

تو زمان احمد ہنس دیتا، ٹال جاتا۔ اُس نے کئی بار کئے گئے ثمینہ کے اس سوال کا جواب نہ دیا تھا۔ اب وہ اپنی بھولی بھتیجی کو کیا بتاتا کہ ہر مرد آنکھوں میں رنگین جال چھپائے پھرتا ہے، جسے وہ اپنے احساس، خوابوں، اُمنگوں کے رنگوں کے دھاگوں سے ذہن کی کھڈی پر بنتا ہے اور جب چاہے اس رنگین جال میں بھولی بھالی لڑکیوں کو جکڑ سکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی اندازے غلط ہو جائیں تو اس خوف سے کہ جوتے نہ پڑ جائیں، بھاگنا بھی پڑتا ہے۔

دو روز قبل ہی ثمینہ نے اُسے فون کر کے کہا تھا۔

"زمان بھائی! آپ کراچی آ جائیں۔"

"کیوں بھئی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں بہت اُداس ہوں اور سخت بور ہو رہی ہوں۔"

"وہاں آ کر میں بور ہوں گا۔"

"کیوں؟"

"یار! صبح سے سہ پہر تک تم یونیورسٹی چلی جایا کرو گی، میں مکھیاں ماروں گا۔"

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ آ جائیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا کراچی میں مکھیاں بہت ہو گئی ہیں؟" زمان نے اسے چھیڑا۔

"ایک تو میں آپ سے بڑی تنگ ہوں۔ بات سمجھتے نہیں...... ہنگاموں کی وجہ سے

یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لئے بند ہے اور میں اُداس ہوں۔" اُس نے وجہ بتائی کہ کیوں بلا رہی ہے۔

"مگر میں نہیں آ سکتا۔" زمان نے میز پر رکھی ڈھیر ساری فائلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں......؟" وہ چیخ پڑی۔

"بہت کام ہے یار!"

"میں کچھ نہیں جانتی......آپ کو آنا ہوگا۔" ثمینہ نے ضدی لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

زمان کو علم تھا کہ جو بات وہ کہہ دے، چاہتی ہے کہ فوراً اس کا کہا مانا جائے۔ اُسی وقت اُس نے دس روز کی فوری چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ وہ کسی صورت بھی ثمینہ کا حکم نہ ٹال سکتا تھا۔ وہ واپڈا میں اعلیٰ پوسٹ پر فائز تھا۔ یوں بھی آج کل کام بہت زیادہ تھا۔ دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کی وجہ سے کام بڑھ گیا تھا۔ مگر وہ بھلا کب کسی کی سنتی تھی۔ زمان نے بھی اسے تنگ کرنے کے لئے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ اچانک دیکھے گی تو خوش ہو جائے گی۔ اُس کی خوشی کا تصور کر کے زمان کے لب مسکرائے۔

"سنیئے صاحب! آپ چائے پئیں گے؟" زمان کے برابر بیٹھے ادھیڑ عمر کے شخص نے اسے مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ٹہوکا دیا تو اُس کے خیالوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔

"نو، تھینکس۔" زمان نے کہا۔

"ارے بھئی، پی لیں۔ سفر میں سب ایک ہی گھر کے فرد ہوتے ہیں۔" اس نے تھرماس میں سے چائے، کپ میں اُنڈیل کر اُس کی طرف بڑھائی۔ حالانکہ اس وقت اُسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی، مگر اُسے اچھا نہ لگا کہ رات پوری سفر میں گزر گئی اور اس نے اپنے ہم سفر سے کوئی بات بھی نہ کی تھی۔ آرام سے اوپر برتھ پر سو رہا تھا اور اُٹھنے کے بعد سیٹ پر بیٹھ کر باہر کے نظاروں میں گم ہو گیا تھا۔ اب کتنی غلط بات تھی کہ اپنی خواہش پوری کر لیتا۔

"تکلف مت کریں...... چائے پی لیں جی۔" اس نے اتنی محبت سے کہا کہ زمان نے کپ تھام لیا۔

"مجھے سرور اعظم کہتے ہیں۔ میرا کراچی میں اسٹین لیس سٹیل کے برتن بنانے کا کارخانہ ہے۔" انہوں نے بمعہ اپنے پیشے کے تعارف کروایا۔

"میں زمان احمد ہوں جی۔" زمان نے کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کرتے کیا ہو برخوردار!....... پڑھتے وڑھتے ہو؟"

"نہیں جی، پڑھائی تو عرصہ ہوا چھوڑ دی، بلکہ مکمل کر لی۔ ان دنوں واپڈا میں ایگزیکٹو آفیسر ہوں۔"

"بہت کم عمری میں اتنی اچھی پوسٹ لے لی۔"

"خدا کی مہربانی ہے جی۔" وہ انکساری سے بولا۔

"اب آپ سوئیں گے؟" سرور اعظم نے زمان کی خالی برتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی۔ دن کو سونے کی عادت نہیں۔"

"اگر آپ برا نہ منائیں تو میں کمر سیدھی کر لوں؟"

"وائے ناٹ!" زمان جلدی سے بولا۔

"اصل میں ساری رات بیٹھے بیٹھے کمر تختہ ہو گئی ہے۔ لمبے سفر کے لئے برتھ بہت ضروری ہے۔"

"آپ بکنگ کروا لیتے۔" زمان نے کہا۔

"بس زمان صاحب! بکنگ کروائی تو صرف سیٹ ہی ملی اور میرا آج کراچی پہنچنا بہت ضروری ہے، ورنہ میں اس تنگی میں کبھی نہ آتا۔"

"آپ اطمینان سے سو جائیں۔ کراچی میں آپ کو جگا دوں گا۔" زمان نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے برتھ پر چڑھ کر سو گئے۔ زمان نے ہنس کر سوچا۔

"ہاں تو سرور اعظم صاحب! ایک کپ چائے میں یہ سودا برا نہیں۔"

"سانوں سجناں دے ملنے دی تانگ اے"

شاید کمپارٹمنٹ میں کسی نے ٹیپ ریکارڈر لگا دیا تھا اور عنایت حسین بھٹی نہایت پُرسوز اور دُکھی لہجے میں گا رہا تھا۔ زمان نے سوچا۔

سبھی کو اپنے سجنوں ہی سے ملنے کی خواہش نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ہر کوئی اپنے پیاروں سے ملنے کی آس پر جیتا ہے۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ کوئی اسٹیشن تھا۔

زمان احمد بھی نیچے اُتر آیا۔ بک اسٹال سے اُس نے وقت گزاری کے لئے رسالہ خریدا۔ ورنہ وہ رسالے پڑھنے کا شوقین نہ تھا۔ اوّل تو فرصت ہی نہ ملتی تھی اور اخبار پر بھی ناشتہ کرتے ہوئے جلدی جلدی نظریں دوڑا لیتا تھا۔ وہ اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا

کہ ایک نسوانی آواز نے اُس کے قدم روک لئے۔

"سنیے ذرا۔"

"جی!" زمان نے چونک کر کھڑکی میں جھکی لڑکی کی طرف دیکھا۔

"پلیز، ہمارے کولر میں پانی بھر کر لا دیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"لائیے۔" زمان نے اُس سے کولر لے لیا۔ مگر اُس کے ذہن پر لڑکی کی مسکراہٹ جم کر رہ گئی۔ اُسے لگ رہا تھا، جیسے کہ پہلے بھی اس لڑکی کو کہیں دیکھا تھا۔

یہ مسکراہٹ جانی پہچانی ہے۔

آنکھوں کی چمک بھی شناسا لگتی ہے۔

کہاں دیکھا ہے اسے؟

یا پھر سب لڑکیوں کی مسکراہٹ ایک سی ہوتی ہے۔

کیا اُن کی آنکھوں میں ایک ہی طرح کے جگنو جھلملاتے ہیں؟

زمان کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ کولر لے کر آیا تو وہی لڑکی کھڑکی ہی میں موجود تھی۔

"بہت شکریہ آپ کا۔" لڑکی کی آنکھوں میں مشعلِ شناسائی کی لو تیز ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں۔"

"اصل میں ہمارے ساتھ کوئی مرد نہیں، اس لئے۔" اس نے کہا۔

"آپ شرمندہ مت کریں۔ کوئی اور کام ہو تو بتا دیجئے گا۔ ساتھ ہی کا کمپارٹمنٹ ہے میرا۔" زمان نے کہا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی کوئی اور بات کرے، گاڑی نے وسل دی تو وہ جلدی سے اس میں چڑھ گیا۔

زمان سے یہ گتھی نہ سلجھ رہی تھی۔

"آخر میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے؟"

یہ خیال بچھو کی طرح اُس کے ذہن کو ڈنک مار رہا تھا۔

"کیوں پریشان ہوتے ہو؟ اگلے اسٹیشن پر پوچھ لینا۔" اس کے ذہن نے راہ دکھائی تو کچھ سکون ملا اور وہ رسالہ دیکھنے لگا۔ مگر ہر صفحے پر وہی شناسا آنکھیں اور مسکراتے لب اُبھر آئے تھے۔ ہر لفظ میں سے وہی جھانک رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ لڑکی زندگی کی شاہراہ پر کہیں نہ کہیں اس سے ٹکرائی ضرور ہے۔ مگر کہاں؟ یہ یاد نہ آ رہا تھا۔ اور جب یادداشت پر بہت زور ڈالا جائے اور کوئی بات یا واقعہ یاد نہ آئے تو بہت کوفت ہوتی ہے۔

یہی حال زمان کا بھی تھا۔

اُس کا ذہن اُسی لڑکی کی مسکراہٹ کے بھنور میں ڈوب گیا تھا اور نظروں کے سامنے پھر دوڑتے بھاگتے درخت تھے۔

یونہی اچانک زمان نے کھڑکی سے گردن نکال کر ساتھ والے کمپارٹمنٹ کی طرف دیکھا تو اسی وقت اس لڑکی نے بھی جھانکا۔ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ لڑکی کی آنکھوں میں وہی شناسا سی چمک تھی اور وہ نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہی تھی۔

''پہچانا؟''

زمان نظروں کے پیغام بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ بہت پیغام دیئے اور لئے تھے۔ وہ بھی جان گیا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا پوچھ رہی ہے۔ تب اُس نے سر کو منفی جنبش دی تو اُس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ لڑکی کے لب بھینچ گئے تھے اور آنکھوں میں مایوسی کے سائے تیرنے لگے تھے۔ اور پھر وہ ہٹ گئی۔ زمان کا ذہن پھر ریشم کے لچھوں کے مانند ہو گیا۔ یونہی کئی گھنٹے گزر گئے۔

حیدر آباد اسٹیشن پر گاڑی رکی تو وہ جلدی سے اُترا۔ بہت تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، مگر اچھی لگ رہی تھی۔ زمان پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ گاہے گاہے اُس کی نظریں اُس لڑکی پر بھی پڑ جاتی تھیں اور وہ بھی ترچھی نظروں سے اُسے دیکھ لیتی۔ زمان کو پتہ تھا کہ وہ اُس کی نظروں کی زد میں ہے۔ تب اس نے دیکھا کہ وہ ٹھیلے والے سے کیلے اور سیب خرید رہی ہے۔ زمان بھی وہیں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ تب اُس نے سنا۔ وہ اپنی ساتھی ہم عمر لڑکیوں سے کہہ رہی تھی۔

''مونا! آج یہاں ایسی ہوا چل رہی ہے نا، جیسی اسلام آباد میں چلتی ہے؟''

اُس کی ساتھی مونا نے پتہ نہیں کیا جواب دیا، مگر زمان کے ذہن میں یادوں کے جھکڑ چلنے لگے اور اُسے ایک دم ہی یاد آ گیا کہ اُس نے اسے کہاں دیکھا تھا! زمان اُسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

''سونیا! انگور بھی لے لو۔'' ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے اُس سے کہا۔

''امی! بس بھی کریں۔ بہت ہے یہ۔'' وہ بیزاری سے بولی تو زمان کو پتہ چلا کہ ساتھ میں اُس کی والدہ ہے۔

''لے لو تم۔''

''لگتا ہے، بہت کنجوس ہو؟'' زمان نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو وہ اُسے گھور کر رہ گئی۔

''شاہ تو دیکھیں۔'' اُس نے چڑایا۔

''پوری ریڑھی خرید دوں؟''

''شکریہ........ دعوے کرنے والے منہ کے بل گرتے ہیں۔'' سونیا نے کہا اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔

زمان کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ اُس نے اپنے لئے سیب اور انگور خریدے، تب تک گاڑی نے وسل دی۔ وہ واپس آ گیا اپنی سیٹ پر۔

اُس کی برتھ پر سرور اعظم صاحب نہایت اطمینان سے اپنی نیند پوری کر رہے تھے۔ پتہ نہیں، کتنی راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔

گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور زمان سیب چھیل کر کھا رہا تھا اور اُس کے دماغ کی وادی میں وہ لمحے زندہ ہو گئے، جب اُس نے پہلی بار سونیا کو دیکھا تھا۔ اُسے سونیا کے ایک ہی جملے سے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنے محکمے کی طرف سے ایک سیمینار میں شرکت کے لئے اسلام آباد گیا۔ سہ پہر تک وہ میٹنگ وغیرہ میں مصروف رہتا اور پھر اپنے دوست خالق کے ہاں آ جاتا۔ خالق اُس کا کلاس فیلو تھا اور بہت اچھا دوست بھی۔ پی آئی اے میں ملازم تھا اور سیلائٹ ٹاؤن میں پھولوں سے گھرا اُس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ اُس کی بیوی اُن دنوں میکے گئی ہوئی تھی، اسی لئے زمان ہوٹل کے بجائے خالق کے گھر ہی ٹھہرا تھا۔

شام کو دونوں اسلام آباد اور پنڈی کی رونقیں دیکھنے کے لئے نکل جاتے۔ لانگ ڈرائیو کے دونوں ہی شوقین تھے۔ باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلتا۔

اُس روز چھٹی تھی اور زمان نے شکر پڑیاں کی پہاڑیوں پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ خالق کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ویسے بھی دو روز بعد زمان کو چلے جانا تھا۔

شکر پڑیاں کی پہاڑیوں سے پھولوں سے گھرا سرسبز اسلام آباد نہایت خوب صورت لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں درختوں میں سرسراتی پھر رہی تھیں۔ چھٹی کی وجہ سے یہاں خاصا رش تھا۔ خوش رنگ آنچل لہرا رہے تھے، بچے کھیل رہے تھے، غرض کہ میلے کا سا سماں تھا۔

گھنٹیوں جیسی ہنسی پر زمان نے گردن موڑ کر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ہوا کی

وجہ سے چہرے پر آئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے تین لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہنس رہی تھی۔ اس کے بیچ موتیوں جیسے دانتوں کی قطار، میرون لپ اسٹک لگے ہونٹوں کے بیچ نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ چار لڑکیوں کا گروپ تھا اور دو پندرہ، اٹھارہ سال کے لڑکے بھی ان کے ساتھ تھے، جو یقیناً ان کے بھائی ہی ہوں گے۔

گرے سوٹ پر سلور کام کا گرے دوپٹہ عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ زمان کو وہ ایک ہی نظر میں بہت اچھی لگی۔ اور آج عرصے بعد کوئی اتنا فریش چہرہ انی کی طرح دل میں کھبا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو، دوست......؟" خالق نے اُسے مسلسل ایک ہی طرف دیکھتے پا کر ٹہوکا دیا۔

"قدرت کی صناعی۔"

"ہر جگہ کہانیاں نہ چھوڑا کرو۔" خالق نے کہا۔

"بھئی اچھی چیز کو دیکھنا جرم تو نہیں ہے نا۔" زمان نے ہنس کر کہا اور پھر ادھر دیکھنے لگا تو وہ لڑکی بھی زمان ہی کو دیکھ رہی تھی۔ زمان نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر، کھٹ سے اسے سلام کر ڈالا تو وہ ایک دم گھبرا گئی اور جلدی سے رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی کمر پر پڑے کھلے لمبے بالوں کو زمان پُرشوق نظروں سے دیکھنے لگا اور اُس کے اس طرح دیکھنے پر اسے یقین تھا کہ وہ لڑکی بھی گھبرا رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے گردن موڑ کر ترچھی نظر سے زمان کی طرف دیکھا تو اپنی طرف اسے دیکھتا پا کر نہ جانے کیسے اُس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور اُس نے مسکراہٹ چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"خالق!......خالق!" زمان نے قریب ہی لیٹے خالق کو جھنجوڑا۔

"کیا ہے دوست؟" وہ بیزاری سے بولا۔

"وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔" زمان نے اسے بتایا۔

"مسکرائی ہے، آئی تو نہیں نا۔"

"ایک نہ ایک دن آ بھی جائے گی۔"

"ذرا بھی نہیں بدلے تم۔"

"یار! انجوائے کرنے دو۔ یہی تو زندگی ہے۔ بیوی ساتھ ہو تو بندہ کسی کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ جب تک آزادی ہے، اُڑنے دو۔"

"چلو، جیسی تمہاری مرضی۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"ویسے خالق! یہ لڑکی مجھے اچھی لگی ہے۔ دوستی ہونی چاہئے اس سے۔"

"جوتے کھلوانے کا ارادہ ہے؟"

"تعارف حاصل کر لیں۔ کیا مضائقہ ہے؟" وہ بولا۔

"بالکل نہیں۔" خالق زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"چلو، ان کا گھر تو دیکھ لیں۔"

"کیسے؟" خالق نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"گاڑی میں ان کا تعاقب کریں گے۔" زمان نے کہا۔

"پھر کیا ہوگا؟"

"تجھے یاد نہیں، روحانہ سجاد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" زمان ہنسا۔

"کون روحانہ سجاد؟" خالق کو واقعی یاد نہ تھا۔

"وہی، ایبٹ آباد والی۔" زمان نے اُسے یاد دلایا تو اُسے یاد آیا کہ ان دنوں وہ لوگ کالج کی طرف سے ٹور پر ایبٹ آباد گئے تھے، وہیں ایک پبلک پوائنٹ پر دل پھینک زمان کو ایک لڑکی پسند آگئی۔ حُسنِ اتفاق کہ اس کا نام بھی زمان کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس کی ساتھی لڑکی نے جب اُسے آئس کریم کا کپ تھمایا تو کہا تھا۔

"روحانہ! جلدی سے کھا لو۔ پگھل جائے گی۔"

اور اس روز اُس کی موٹر کے پیچھے زمان نے ٹیکسی لگا دی۔ خالق بھی اس کے ساتھ تھا۔ اُن کا گھر اچھی طرح دیکھنے اور گھر کا نمبر نوٹ کرنے کے بعد زمان نے ڈائریکٹری میں سے فون نمبر تلاش کیا اور برقی لہروں کے ذریعے پہلا تیر پھینکا۔ اتفاق کہ فون روحانہ ہی نے اُٹھایا۔ پہلے تو اُس نے ننانوے فیصد لڑکیوں کی طرح اُسے بری طرح جھڑک دیا۔ مگر جب تین روز میں بلاشبہ چالیس پینتالیس کالیں زمان نے کھڑکھڑائیں تو روحانہ کے دل میں بھی زمان کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ اُس روز شام کو ان کے گروپ کی ملتان واپسی تھی۔ زمان نے روحانہ کو فون پر ہی اپنا ہاسٹل کا ایڈریس نوٹ کروا دیا۔ روز خط لکھنے کا وعدہ کیا، اس سے عہد لیا۔

مگر یہ تو ہوتا ہے کہ عورت عہد نباہ دیتی ہے، مگر مرد وعدے وفا کرنا نہیں جانتا۔ روحانہ سجاد اُسے بہت خوب صورت خط لکھتی اور زمان بھی تو لفظوں کا کھلاڑی تھا، وہ روحانہ کو لفظوں کے سحر میں جکڑ چکا تھا، جیسے کہ دنیا میں وہ اس سے زیادہ کسی کو چاہتا ہی نہیں۔ تصویروں کے تبادلے بھی ہو چکے تھے۔ روحانہ خود بھی خوب صورت تھی اور اپنے

خوب صورت پوز اُس نے زمان کو بھیجے تھے۔ اور زمان نے بھی جواباً ایسی ہی عنایت اُس پر کر دی تھی۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چلا۔ صرف تین چار ماہ ہی میں زمان کا دل ایک ہی قسم کی روٹین سے اوب گیا۔ وہی لفظ، وہی جذبے، وہی آہیں اور ملن کی آس لئے ردحانہ کے خطوط آتے۔ زمان اُس کے دو تین خطوط کے جواب میں چند لائنیں گھسیٹ ڈالتا تھا۔ روحانہ ذہین تھی، اُس کی بیزاری خطوں سے جان گئی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئی۔ کس طرح اُس نے خود کو واپسی کے لئے تیار کیا ہو گا، یہ زمان خوب جانتا تھا۔ پھر وہ اسے کبھی یاد بھی نہ آئی تھی۔ اور آج اتنے عرصے بعد اسے یاد آ گئی اُس کی۔

پھر وہی ہوا، جو زمان چاہتا تھا۔ خالد نے اپنی موٹر اُس گروپ کے پیچھے اس طرح لگائی کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ وہ لوگ دامنِ کوہ گئے، وہاں ذرا دیر رُک کر پھر راول ڈیم کی طرف چل دیئے۔

"لگتا ہے، آج ہی ساری تفریح کریں گی۔" خالق نے گیئر لگاتے ہوئے کہا۔ مگر زمان کی نظریں تو اسی گرے سوٹ والی پر ٹکی ہوئی تھیں، جو گاہے گاہے گردن موڑ کر پیچھے آنے والی موٹر کو دیکھ لیتی۔ اس کے لب مسکرا رہے تھے۔

"اسے پتہ چل گیا ہے کہ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔" زمان نے خالق کو اطلاع دی۔

"میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہے۔"

"آخر کیسے نہ چاہے؟ ہماری شخصیت ہی اس قدر سحر انگیز ہے۔" زمان نے فخر سے کہا۔

"بکواس کرنا کوئی تم سے سیکھے۔" خالق نے ہنس کر کہا۔ اُسے یہ اعتراف تھا کہ زمان میں کوئی بات ایسی ضرور ہے۔ جو لڑکیاں اُس سے متاثر ہو جاتی ہیں.

ڈیم پر بھی وہ لوگ ان سے بات نہ کر سکے۔ البتہ زمان نے یہ کیا کہ جو حرکت وہ لڑکی کرتی ہے، وہی حرکت وہ بھی کرتا۔ وہ لڑکی پانی میں چھوٹے کنکر پھینکتی تو وہ بھی یہی کرتا۔

وہ گردن اُٹھا کر آسمان کو دیکھتی تو زمان بھی فلک پر نہ جانے کیا تلاش کرنے لگتا۔

وہ ہنستی تو وہ بھی خوامخواہ ہنس دیتا۔

خالق اس آنکھ مچولی سے بور ہو گیا تھا۔

یونہی خاصا وقت گزر گیا۔ سورج مغرب کی پناہ گاہوں میں ڈوب گیا تو وہ لڑکیاں بھی

چل دیں۔ اُن کی موٹر چلی تو حسبِ معمول انہوں نے بھی اپنی موٹر ان کے تعاقب میں لگا دی۔

"اب یقیناً یہ اپنے گھر جائیں گی۔"

"اگر سینما میں گھس گئیں پھر؟" خالق نے خدشہ ظاہر کیا۔

"پھر ہم بھی دو ٹکٹ لے لیں گے۔" زمان نے کہا۔

"یہ ضروری ہے"

"اب سارا دن کی محنت تو بیکار نہیں کی جا سکتی۔ وہ کیا سوچے گی کہ میں اتنی جلدی ہار گیا۔" زمان کی تو انا کا مسئلہ تھا۔

"میں ٹیکسی سے گھر چلا جاتا ہوں، تم پھرتے رہو ان کے پیچھے۔" خالق بولا۔

"یہ ظلم تو نہ کرو۔ مجھے یہاں کے راستوں کا پتہ نہیں، ورنہ میں اس پیشکش پر ایک عدد قربانی پیش کر ڈالتا۔"

"انتہائی نالائق ہو۔" خالق اُس کے انداز پر ہنس دیا۔ تب ہی سرخ بتی کے اشارے پر انہیں موٹر روک دینی پڑی اور بس یہیں تو غلطی ہو گئی۔ جس موٹر کا تعاقب وہ کر رہے تھے، وہ آگے نکل چکی تھی۔

"سگنل توڑ کر نکل جاتے۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"کچھ تو عقل کے ناخن لو، میرے دوست!"

"جو جرمانہ ہوتا، میں بھر دیتا۔"

"اگر ایکسیڈنٹ ہو جاتا، پھر؟...... تم دیکھتے نہیں، ہم ییلو بتی پر ہی گاڑی چلا دیتے ہیں، گرین لائٹ کا انتظار ہی نہیں کرتے۔"

"ساری محنت اکارت گئی نا۔" زمان ہاتھ پر مُکا مار کر بولا۔

"اس کی دوستی تمہارے نصیب ہی میں نہ تھی۔" خالق نے کہا۔

"ہونہہ!" زمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سگنل کو توڑ کر پھینک دے۔

"ہمیشہ جیتنے والے کبھی تو ہار بھی جاتے ہیں نا۔" خالق نے کہا تو وہ اُسے گھور کر رہ گیا۔

"اب موڈ درست کر لو کہ مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔"

خالق نے "شیزان" کے سامنے گاڑی روک دی۔

پھر زمان نے نہایت بے دلی سے کھانے میں خالق کا ساتھ دیا۔ اسے بہت افسوس

ہو رہا تھا کہ اتنی اچھی لڑکی سے اُس کی دوستی نہ ہو سکی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بھی اس سے دوستی کی خواہاں تھی۔ رات بھر اُسے ڈھنگ سے نیند بھی نہ آئی۔ بار بار اُس کا ذہن بھٹک جاتا۔ نقرئی گھنٹیوں جیسی اُس کی ہنسی زمان کے دل کے دالان میں گونجتی۔ اُس کی آنکھیں زمان کے وجود کو بے چین کر دیتیں۔

دو روز بعد وہ اس لڑکی کی یاد دل میں لئے واپس ملتان آ گیا۔

کئی روز تک وہ لڑکی زمان کے ذہن پر سوار رہی۔ آخر کب تک؟...... وہ جلد ہی ذہن سے نکل گئی۔ اور مصروفیات کم تھیں، جو وہ اُسے یاد رکھتا، جو صرف سراب تھی۔

زندگی کی شاہراہ پر ملنے والی اور بہت سی لڑکیوں کی طرح وہ اسے بھی بھول گیا۔ مگر آج پورے ڈیڑھ برس بعد وہ نظر آئی تھی۔

جس کے خیال نے اُسے کئی دن بے کل رکھا تھا۔

حتیٰ کہ اُس کا نام بھی زمان کو پتہ نہ تھا، پھر بھی وہ اُس کی یادوں میں چٹکیاں لیتی رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو زمان کو اُس کا نام پتہ چلا تھا۔

سونیا......!

یہ نام دل میں عجیب سی ٹھنڈک اُتار رہا تھا۔

زمان اُٹھ کر دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ وہاں سے ساتھ والے کمپارٹمنٹ کا فاصلہ کم ہو گیا تھا۔ سونیا بھی دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔ اور زمان کو یقین تھا کہ یہ اسی کے نام کی چمک ہے۔ اسے تو یہ خوشی تھی کہ اس کی یہ اہمیت ہے۔

سونیا نے اُسے یاد رکھا اور وہ اُسے کتنی جلدی بھول گیا تھا۔

وہ دونوں دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور نظروں ہی نظروں میں ڈھیروں وعدے بھی کر لئے۔ زمان کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ نظروں کے راستے دل تک پہنچنے والی سیڑھیاں عبور کر گئی۔ آج تک کوئی بھی لڑکی اُس کے دل تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ یہ سونیا تھی، جس نے وہ راستہ پا لیا تھا۔ اُس کی رگ رگ میں سونیا محبت بن کر اُتر گئی۔ جی چاہ رہا تھا، وقت تھم جائے۔ مگر وقت کسی کی خواہش کا احترام کب کرتا ہے؟...... پھر تو وقت کا پتہ بھی نہ چلا۔ یوں لگا، گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے ہو گیا ہو۔

کراچی اسٹیشن پر وہ تمام مسافروں سے پہلے ہی اُتر کر سونیا کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے پاس سامان ہی کتنا تھا۔ ایک بیگ اور بریف کیس۔

اُس کی نظریں سونیا پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں لینے ایک عورت اور ایک نوجوان آیا ہوا

تھا۔ زمان تو ہر ایک سے بے نیاز اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اسے معلوم بھی نہ ہوا، کب وہ اس کے قریب آئی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا گول مول کیا ہوا کاغذ تھما کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

زمان نے جلدی سے وہ کاغذ کھولا، اس میں ایڈریس تھا۔ بس اس کی نظر مقام "ناظم آباد" پر پڑی تھی کہ قلی نے کہا۔

"قلی چاہیئے صاحب؟"

زمان نے گھبرا کر وہ کاغذ جیب میں ڈال لیا۔ وہ کبھی بھی تو اتنا گھبرایا نہ تھا۔ ایسے تو کتنے ہی رقعے ہاتھوں میں آئے، مگر یوں دھڑکنیں بے ترتیب نہ ہوئی تھیں۔ پھر آج کیا ہو گیا تھا۔

قلی نے اسے ٹیکسی دلوا دی تھی۔ ٹیکسی اسے لئے آگے بڑھ گئی اور زمان کے اردگرد سونیا کی خوشبو پھیل گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، جس میں اب بھی سونیا کی نفسِ تحریر موجود تھی۔

جب وہ عثمان بھائی کے ہاں پہنچا تو ثمینہ اُسے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آنے کی اطلاع بھی آپ نے نہیں دی، زمان بھائی!"

"تم بلاؤ اور میں بھلا نہ آؤں؟" زمان نے اس کے ریشمی بالوں والے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا۔

"سچ، میں بہت بور ہو رہی تھی۔ اب آپ آ گئے ہیں نا تو وقت اچھا کٹے گا۔" ثمینہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا۔

"بھابی کہاں ہیں؟" زمان بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"امینہ کے ساتھ اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہیں..... آپ نہا لیں، فریش ہو جائیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

"تم پہلے پانی تو پلاؤ۔"

"اوہ، یاد ہی نہیں رہا۔" ثمینہ ہنستے ہوئے بولی۔ اور جب وہ گلاس پانی کا لئے کمرے میں آئی تو زمان بریف کیس کی ایک ایک چیز نکال کر بیڈ پر پھینک رہا تھا۔

"کیا تلاش کر رہے ہیں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ایک کاغذ تھا۔"

"مل جائے گا۔ آتے ہی کیا ضرورت پیش آ گئی؟" ثمینہ نے گلاس اسے تھما دیا۔ وہ

ایک سانس ہی میں گلاس خالی کر گیا۔ پھر وہ بیگ کی جیبوں میں تلاش کرنے لگا۔

''کیا بہت ضروری کاغذ تھا؟'' وہ بولی۔

''ہاں دوست!''

''کہاں رکھا تھا؟''

''رکھا تو جیب میں تھا۔'' زمان نے بتایا۔

''پھر بیگ میں کیسے آگیا؟''

''جیب میں بھی نہیں ہے۔'' زمان پریشان ہوتا ہوا بولا۔

''آپ شاور لے لیں، خود ہی یاد آجائے گا گھر ہی میں ہوگا۔'' ثمینہ نے دلاسہ دیا۔

''ہاں........کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹیکسی والے کو پیسے دیتے ہوئے گر گیا ہو۔''

ثمینہ کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ وہ تیزی سے باہر لپکا۔ اور پھر کتنی ہی دیر وہ گیٹ پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ کاغذ وہاں ہوتا تو ملتا۔ مایوسی اُس کی رگ رگ میں اُتر گئی۔ وہ منہ لٹکائے اندر آیا تو ثمینہ نے پوچھا۔

''نہیں ملا........؟''

''نہیں۔'' زمان نے سر ہلایا۔

''تھا کیا آخر؟''

''ایک ایڈریس تھا۔'' زمان کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا۔

اور جب وہ شاور لے کر نکلا تو ثمینہ کھانا لگا چکی تھی۔

''چاچو! کیا کسی لڑکی کا ایڈریس تھا؟'' ثمینہ نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' وہ اس کے انداز پر حیران نہیں تھا۔ کیونکہ ثمینہ اتنی ذہین تھی کہ وہ جلد سمجھ جاتی تھی ہر بات۔

''اتنا دل گرفتہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کئی ایسے ایڈریس آئے اور گئے۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''لیکن ثمینہ! تم نہیں جانتیں۔''

''بس، بس........شروع شروع میں ایسا ہی حال ہوتا ہے آپ کا۔'' ثمینہ ہاتھ اٹھا کر بولی تو وہ ہنس دیا۔

''تم نہیں سمجھو گی۔'' وہ بولا۔

''فی الحال آپ کھانا کھائیں آرام سے، پھر سمجھا دیجئے گا۔'' ثمینہ نے کہا۔ تبھی باہر

بائیک رکنے کی آواز آئی۔

''شاید ساجد آگیا ہے۔'' ثمینہ نے بتایا۔

چند لمحوں بعد ہی ساجد اندر آگیا اور زمان کو دیکھ کر خوشی سے اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔

''اوہ چاچو!........کب آئے آپ؟''

''ابھی ابھی آئے ہیں۔ تم پرے ہٹو۔ کھانا کھانے دو انہیں۔'' ثمینہ کو پتہ نہیں کیوں برا لگتا تھا، جب کوئی زمان کے قریب ہوتا تھا۔

''آپا! تم کیوں جلتی ہو؟'' ساجد، زمان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جلے میری جوتی۔'' وہ پاؤں پٹخ کر بولی اور کھانا چھوڑ دیا۔

''مت لڑو بھئی میری بہن سے۔ میں آیا ہی اس کے لئے ہوں۔'' زمان نے نوالہ ثمینہ کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ کے حد سے زیادہ لاڈ نے تو بگاڑ رکھا ہے انہیں۔''

''بھئی میں اس کے لاڈ نہیں اٹھاؤں گا تو کون اٹھائے گا؟ دہرا رشتہ ہے۔''

''دہرا رشتہ........؟'' ساجد نے یہ لفظ دہرایا۔

''ہاں........چاچا بھی ہوں اور بھائی بھی۔''

''اور دوست بھی۔'' ثمینہ نے ٹکڑا لگایا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشہ چمک رہی تھیں۔

''ہاں بھئی، دوستی کا رشتہ تو دونوں رشتوں سے بڑا ہوتا ہے۔ مقدس ہوتا ہے۔'' زمان سر ہلا کر بولا۔

پھر ساجد سے مخاطب ہوا۔

''تمہاری پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟''

''یونیورسٹی بند ہے۔'' ساجد نے بتایا۔ وہ این ای ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی میں سال اوّل کا طالب علم تھا۔ اس سے چھوٹی امینہ تھی، جو ایف ایس سی کر رہی تھی۔

''تو پھر سارا دن کیا کرتے ہو؟''

''بائیک لے کر سڑکوں کی خاک چھانتے ہیں۔'' ساجد کے بولنے سے پہلے ہی ثمینہ نے کہا۔

''دیکھیں آپا! الزام مت لگائیں۔''

''خیر، کل سے تم بائیک لے کر نہیں جاؤ گے۔'' ثمینہ نے حکم دیا۔

"کیوں؟" وہ ابرو چڑھا کر بولا۔

"میں اور زمان بھائی گھومنے جائیں گے۔ ہے نا۔" ثمینہ، زمان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے، وہی ہو گا۔ یہاں آ کر تو زمان کی زندگی کی ڈور ثمینہ کے ہاتھوں میں ہوتی اور وہ جہاں چاہتی، گھماتی رہتی اسے۔

کھانا ثمینہ اور ساجد کی نوک جھوک میں ختم ہوا۔ زمان انہیں لڑتے دیکھ کر بس مسکراتا رہا۔ جواباً وہ بھی ایسا ہی کرتی۔ اور یہ دونوں کی محبت کی دلیل تھی۔

⊛......⊛......⊛

"سچ ثمن! وہ لڑکی ایسی ہے کہ لگتا ہے، میری تلاش ختم ہو گئی۔" چائے کا سپ لیتے ہوئے زمان نے آہستہ سے کہا۔ ابھی ابھی وہ اسے من وعن سونیا کے بارے میں بتا چکا تھا۔

"تم یہ دیکھو کہ ڈیڑھ برس پہلے وہ مجھے نظر آئی اور میں چکراتا پھرا اس کے پیچھے۔ پھر ایک دم وہ گم ہو گئی۔ لیکن کئی روز تک ٹیسیں میرے دل میں اُٹھتی رہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں چند روز بعد اسے بھول گیا تھا، لیکن یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ پھر کوئی لڑکی مجھے اچھی نہ لگی۔ تم گواہ ہو کہ پچھلے ڈیڑھ برس میں، میں نے تمہیں اپنا کوئی نیا افیئر نہیں سنایا اور آج وہ مجھے نظر آ گئی تو پھر اس کی طرف دل کھنچنے لگا۔ جس کا مطلب ہے، اس کی محبت میرے دل کی تہوں میں چھپ گئی تھی، اسے سامنے پا کر پھر اُبھر آئی ہے دل کی سطح پر۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اسے میرا نام بھی پتہ نہیں، پھر بھی اس نے مجھے یاد رکھا، میری شبیہ پتلیوں میں ثبت کر لی، دل میں اُتار لی، اپنے خیالوں کی دنیا مجھ سے بسا لی۔"

"خوش فہمی تو دیکھیں۔" ثمینہ نے چڑایا۔ "آپ کو کیسے پتہ کہ اس نے آپ کی شبیہ پتلیوں میں ثبت کر لی، دل میں اتار لی؟"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے دیکھ کر ایک دم نہ پہچان لیتی۔ تمہیں پتہ نہیں، لڑکیاں کس قدر گہری ہوتی ہیں۔" زمان نے فلسفہ جھاڑا۔

اور وہ سوچنے لگی۔

واقعی، زمان بھائی صحیح تو کہہ رہے تھے۔ اگر سونیا نے اپنے خیالوں کی دنیا میں انہیں نہ بسایا ہوتا تو انہیں کیسے ڈیڑھ برس بعد پہچان لیتی؟

اور اتنے عرصے بعد اسی بندے کو پہچانا جاتا ہے، جس سے دل کا کوئی بھی تعلق ہو۔

ورنہ یوں تو دن میں کئی موڑ میں پیچھا کرتے ہیں اور پھر زندگی کی شاہراہ میں گم ہو جاتے ہیں۔

"آپ اتنے خالی الذہن ہو گئے تھے کہ وہ کاغذ پھینک بیٹھے۔"

"میں نے تو نہایت احتیاط سے رکھا تھا۔" زمان آہ بھر کر بولا۔

"اتنا ہی عقل سے کام لیتے تو آپ بھی اپنا ایڈریس کا یہاں کا فون نمبر کسی کاغذ پر لکھ کر اسے تھما دیتے۔ سارا وقت تو وہ کھڑکی میں بیٹھی رہی تھی، آسانی سے دیا جا سکتا تھا آپ سے۔ بہادر تو وہی نکلی کہ اتنے ہجوم میں بھی اس نے........"

"بس، عقل ہی خبط ہو گئی۔" زمان اس کی بات کاٹ کر آہ بھر کر بولا۔

"چلیں، گولی ماریں۔ دنیا لڑکیوں سے خالی تو نہیں۔"

"مگر تمہیں اس جیسی چاچی نہیں ملے گی۔"

"چاچی نہیں، بھابی۔" ثمینہ نے جلدی سے تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔" زمان ہنس دیا۔

پھر ایک ہفتہ کچھ اس طرح گزرا کہ وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ وقت کا پنچھی مٹھی میں سے جگنو کی طرح نکل گیا۔ ہر جگہ وہ ثمینہ کے ہمراہ گیا، جہاں وہ پہلے بھی ہزار ہا مرتبہ جا چکا تھا۔ مگر ہر پبلک پوائنٹ پر اس نے اس چہرے کو ضرور کھوجا، جو اس کے دل میں بس چکا تھا۔ مگر وہ تو اپنی چھب دکھا کر نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔ ناظم آباد کے علاقے میں بھی وہ بارہا گیا تھا، مگر اتنے بڑے علاقے میں وہ ایک نازک سی لڑکی کو بھلا کس طرح تلاش کر سکتا تھا؟........اور مایوسیوں میں گھر کر اس نے رختِ سفر باندھا۔ پھر بھی دل میں موہوم سی اُمید تھی کہ شاید وہ کہیں مل جائے۔ مگر اسے نہ ملنا تھا اور نہ ملی۔

اسٹیشن پر اسے چھوڑنے سب ہی آئے۔ عثمان بھائی، سلمٰی بھابی، ساجد، امینہ اور وہ چھلی سی ثمینہ، جو صبح سے باقاعدہ رو رہی تھی اور زمان اسے چپ کرواتے ہوئے ایک بار تو خود بھی رو دیا تھا اور اب سلمٰی بھابی کہہ رہی تھیں۔

"زمان! اب تمہاری بھی شادی ہو جانی چاہئے۔"

"پلیز بھابی! ابھی نہیں۔" وہ منمنایا۔

"اے لو، کیوں نہیں۔ کل ہی امی جی فون پر کہہ رہی تھیں کہ زمان کو منا لو شادی کے لئے۔" انہوں نے اطلاع دی۔

"اماں کو تو فضول میں میری شادی کی فکر ہے۔"

"ہر ماں کو فکر ہوتی ہے۔" سلمیٰ نے کہا۔

"میں کوئی لڑکی تو نہیں، جو وہ پریشان ہیں۔" زمان نے منہ بنا کر کہا تو سلمیٰ بیگم نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ بھی ان کی بیٹی کی طرح ضدی ہے۔ اپنی من مانی کرتا ہے۔

"چاچو! ہے تو اچھا مشورہ۔ شادی کر ہی لیں۔" ثمینہ جو ان کی باتیں سن رہی تھی، ایک دم بولی۔

"کروں گا، لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"لیکن کیا؟" ثمینہ نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

"صرف اور صرف سونیا سے۔" زمان نے ثمینہ کی طرف جھکتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"اگر وہ نہ ملی، پھر؟"

"ایسی بد دعا تو نہ دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ضرور ملے گی۔" زمان کا دل عجیب کشمکش میں تھا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ سچ، مجھے بہت تجسس پیدا ہو گیا ہے اس سے ملنے کا۔ واقعی وہ کوئی ایسی لڑکی ہو گی، جس نے میرے چاچو کے دل کے قلعے پر کمند ڈالی ہے۔ ورنہ یہاں تو بڑے بڑے سکندر شکست کھا گئے۔" ثمینہ، زمان سے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ اس کا لہجہ زمان کی محبتوں سے چُور چُور تھا اور وہ اس کی محبت پر نثار ہی تو ہو گیا اور پھر ان لوگوں نے نم آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے اسے رخصت کیا۔ ٹرین نے وسل دی اور رینگنے لگی۔ دُور تک وہ ثمینہ کے ہلتے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔

کتنا خوش تھا، ایک ہفتہ قبل، جب وہ یہاں آ رہا تھا اور اب سِل جیسا بوجھ اُس کے سینے پر دھرا تھا۔

ثمینہ کی محبتوں کا بوجھ۔

اور سونیا کو پا کر کھو دینے کا بوجھ اُس کا دل اُٹھائے ہوئے تھا۔

❀......❀......❀

زمان کی زندگی پھر اپنے معمول پر آ گئی۔ وہی آفس، وہی فائلوں سے سر کھپانا۔ مگر اتنی مصروفیت کے باوجود وہ نقرئی گھنٹیوں جیسی ہنسی والی لڑکی سونیا اُسے یاد آئی اور اتنی شدت سے یاد آئی کہ اس کا دل چاہتا، اسے زور سے آواز دے اور وہ جہاں ہو، وہاں تک اس کی آواز پہنچ جائے۔

اُس کی یاد میں کمی ہونے کے بجائے دن بہ دن اس کی یاد بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بھی تو اسے بھولنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

نہ ہی اسے بھولنے کی خواہش تھی۔ خواہش تو بس سونیا سے ایک بار ملنے کی تھی۔ مل کر اسے اپنانے کی تمنا نے دل میں جگہ پا لی تھی۔ خواہشوں کے قافلے موج در موج اس کے دل کے آنگن میں اُترتے۔

امنگوں کے شجر پر تمناؤں کی کونپلیں پھوٹتی تھیں۔ اور آنکھوں میں صرف سونیا کا خوب صورت چہرہ بسا ہوا تھا۔

وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے دل کی لگی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔

اچھا خاصا روگ لگ گیا تھا۔ میٹھا میٹھا درد اسے چین نہ لینے دیتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محبت میں کس طرح اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے بندے کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اب اسے احساس ہوتا تھا کہ پہلے جو اس نے محبتیں کی تھیں، عشرت، روحانہ، قندیل، بینا اور ہاجرہ سے تو یہ محبتیں نہ تھیں، یہ تو صرف کھیل تھا، جو تھوڑے عرصے رہا اور بس ختم۔

محبت تو اب ہوئی تھی۔

اب پتہ چلا تھا کہ دل میں کسی کو بسا لینا کیا ہوتا ہے؟

کیسے جذبے ہوتے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے روح میں اُترتے ہیں، رگ رگ میں سما جاتے ہیں۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ وہ کسی سے نہیں ہار سکتا، اس کومل سی لڑکی نے اسے زبردست شکست سے ہمکنار کر دیا تھا اور ان دنوں اسے ایک شعر شدت سے یاد آتا۔

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

وہ خود کو بھی اسی پرندے کی طرح سمجھتا تھا، جو بہت چوکنا تھا۔ مگر سونیا نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا۔ بار بار اسے یاد آتا۔

کتنی ذہین تھی وہ۔ میری اُلجھن سمجھ کر کتنا خوب صورت جملہ ادا کیا تھا کہ مجھے یاد آ گیا۔ وہ جان گئی تھی کہ میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس کا پیچھا کرنے کا جنون اسے یاد تھا۔ تبھی تو اس نے یاد دلا دیا تھا اور وہ جو بھول گیا تھا، سب کچھ یاد آ گیا، پھر کبھی نہ بھولنے کے لئے۔

اور حقیقت یہ تھی کہ اسلام آباد سے آنے کے بعد اسے کوئی بھی لڑکی اچھی نہ لگی تھی۔

پہلے جو وہ حسین لڑکی دیکھ کر کیوپڈ کے تیر سنبھال کر بیٹھ جاتا تھا، اب ایسا نہ کرتا تھا۔ اب اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا، محبت کا کھیل کھیلنے کو۔ ورنہ لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر وہ بڑا لطف لیتا تھا۔ پھر سوچتا، اب لڑکپن گزر گیا ہے، اس لئے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ مگر اب پتہ چلا کہ یہ سب کیوں اچھا نہ لگتا تھا۔

سونیا، جو دل کی تہوں میں چھپی ہوئی تھی، یہ اس کی محبت ہی تھی، جس نے اس کے قدم جکڑ رکھے تھے۔ اپنے بعد آگے نہ بڑھنے دیا تھا۔

⊕......⊕......⊕

ثمینہ کے فائنل سمسٹر ہوئے تو وہ ہمیشہ کی طرح عثمان احمد کے ساتھ علی پور آ گئی۔

ثمینہ آئی تو زمان روز ملتان سے علی پور آ جاتا۔ ورنہ ہر ویک اینڈ پر آتا تھا۔ وہیں واپڈا کالونی میں اسے بنگلہ اور ملازم محکمے کی طرف سے ملے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی جب اس کے بھانجے بھتیجیوں کا دل آؤٹنگ کے لئے چاہتا تو وہ آ جاتے اور زمان احمد کے گھر میں بہار آ جاتی۔ اتنا شور کرتے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

عثمان احمد تو ثمینہ کو علی پور چھوڑ کر جا چکے تھے اور انہیں علم تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے واپس پہنچا دے گا۔

ثمینہ کے آنے سے حویلی میں عجیب سی بہار آ جاتی۔ کبھی اس کی پھوپھیاں آ جاتیں، منجھلی چاچی اور چھوٹی چاچی تو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ محبتوں کے معاملے میں وہ بڑی خوش قسمت تھی۔ ہر جگہ اسے محبتیں ہی ملتی تھیں۔ دوست تھیں تو جی جان سے چاہتی تھیں، رشتے دار جان چھڑکتے تھے اور زمان احمد کی تو وہ آنکھوں کا نور تھی۔

ان دنوں زمان احمد، ثمینہ کو ملتان لے آیا تھا۔ ساتھ میں اس کی دادی اماں، عابدہ پھپھو اور ان کی بیٹی نسرین بھی تھیں۔ بھرا بھرا گھر زمان کو بہت اچھا لگتا تھا۔ تب ایک روز جب وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو اماں نے کہا۔

''بیٹا! اب تم میری خواہش پوری کر دو۔''

''کیسی خواہش؟'' وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔

''بہت دل چاہتا ہے، تیرے سر پر سہرا سجا دیکھوں۔''

''پانچ بیٹوں کے سر پر سہرے سجا کر آپ کی خواہش پوری نہیں ہوئی؟'' وہ ہنسا۔

''تُو تو مجھے سب سے پیارا ہے۔''

''نوازش!'' زمان سر جھکا کر بولا تو ثمینہ نے شرارت سے کہا۔

''میں کہوں گی پپا سے کہ دادی اماں آپ کو نہیں۔''

''میں سب سے چھوٹا ہوں نا؟'' زمان نے کہا۔

''وضاحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' ثمینہ نے ہنستے ہوئے دادی اماں کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور ان کے گال سے گال رگڑتے ہوئے بولی۔ ''زمان بھائی سے زیادہ کون پیارا ہے آپ کو۔''

''پھر تُو ہے میری جان، میری روح!'' دادی اماں نثار ہو گئیں۔

''دیکھا؟'' ثمینہ نے زمان کو چڑایا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔

''اچھا اماں! خدا حافظ۔''

''جاؤ، رب راکھا۔''

''یاد ہے نا، شام کو۔'' ثمینہ نے اسے کہا۔

''یاد ہے۔ بھلا تمہارا حکم کبھی بھولا ہوں؟'' زمان نے ثمینہ کے گال تھپتھپائے اور کمرے سے نکل گیا۔

''کیا کرنا ہے شام کو؟'' دادی اماں نے پوچھا۔

''میں نے کہا ہے کہ مجھے فالودہ کھلا لائیں۔'' ثمینہ نے بتایا۔

''ہائے......تم اس ٹھنڈ میں فالودہ کھاؤ گی؟'' وہ اس طرح اُچھلیں، جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

''کوئی نہیں اتنی ٹھنڈ........اچھا لگتا ہے۔'' ثمینہ نے ٹھنک کر کہا تو دادی اماں کو پتہ تھا، جو بات اُس کے ذہن میں سما جائے، کوئی نہیں نکال سکتا۔

''تُو اپنے چاچا کو سمجھاتی نہیں کہ تیری چاچی لے آئیں؟'' انہوں نے ثمینہ سے کہا۔

''سو مرتبہ کہہ چکی ہوں، مانتے ہی نہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''تیری ہر بات تو مانتا ہے۔''

''وہ کہتے ہیں، تُو کہے گی تو جان بھی دے دوں گا۔ مگر شادی کے لئے مجبور مت کرو مجھے۔ تو اب بتایئے، میں کیا کروں؟'' ثمینہ نے کہا اور حقیقت یہی تھی کہ اس نے کئی بار زمان کو کہا تھا، مگر وہ کہتا تھا۔

''سونیا سے ایک بار ملوں گا، اس کے بعد ہی فیصلہ کروں گا، اپنی شادی کا۔''

زمان احمد کا لہجہ اس قدر سخت ہوتا کہ ثمینہ کو کچھ اور کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا۔

⊕......⊕......⊕

شام کو ثمینہ اور زمان، حسین آگاہی گئے۔

''مجھے نیل پالش اور لپ اسٹک خریدنی ہے۔'' ثمینہ نے اسکوٹر سے اترتے ہوئے کہا۔

''چلو، پہلے وہی لے لیتے ہیں۔'' زمان نے کہا اور ایک اسٹور پر ثمینہ اپنے پسندیدہ شیڈ کی لپ اسٹک تلاش کر رہی تھی۔ زمان نے اپنے لئے آفٹر شیو لوشن وغیرہ لیا۔

ریسٹورنٹ میں فالودہ کھاتے ہوئے ثمینہ نے کہا۔

''چاچو! فلم تو دکھا دو۔'' وہ اس وقت بڑے موڈ میں تھی۔

''چلو، تم بھی کیا یاد کرو گی۔'' زمان نے کہا۔

''تھینکس!'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''اب جلدی جلدی کھاؤ۔ صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں، فلم شروع ہونے میں اور ٹکٹ بھی خریدنا ہوگا۔ تم صبح بتا دیتیں تو بکنگ کروا لیتا۔'' زمان گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔

''مزہ تو دھکم پیل میں لینے کا ہے۔ میں خود لے آؤں گی۔ سچ، عرصہ ہو گیا ہے کھڑکی میں سے ٹکٹ لئے۔'' وہ نہایت معصومیت سے بول رہی تھی۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' زمان احمد نے بات اسی پر ڈال دی۔

ڈریم لینڈ کے پارکنگ لاٹ میں بائیک کھڑی کر کے وہ اندر آئے تو بہت رش تھا۔

''مشکل ہی سے ٹکٹ ملے۔''

''آپ پیسے تو دیں، میں ابھی لاتی ہوں۔'' وہ بچوں کی طرح پاؤں زمین پر مارتی ہوئی بولی۔

''لڑنا نہیں۔'' زمان نے اسے پیسے دیئے تو وہ ہنستی ہوئی بکنگ آفس کی طرف بڑھ گئی۔

زمان کی نظریں اسی پر تھیں اور اسے معلوم نہیں تھا کہ ثمینہ اور کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ یہ صفدر جاوید تھا۔ اپنے دوستوں طالب اور رمضان کے ساتھ۔ زمان نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ خود ہی اس کی طرف لپکتا۔ صفدر جاوید اس کے آفس میں الیکٹریکل انجینئر تھا۔ اچھا لڑکا تھا، اس لئے زمان سے اس کی خاصی بنتی تھی۔

تبھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ زمان کی طرف آ گیا۔

''السلام علیکم زمان صاحب!''

''وعلیکم السلام!'' زمان نے اس سے مصافحہ کیا اور پھر اس کے دوستوں سے بھی ہاتھ

ملایا۔

''تم نے ٹکٹ لے لیا؟''

''ہم نے تو بکنگ کروالی تھی۔ اگر ضرورت ہو تو لے لیں؟'' صفدر بولا۔

''نہیں، نہیں......مل جائے گا ٹکٹ۔'' زمان نے جلدی سے کہا۔

صفدر کا دل چاہا، وہ اس لاابالی سی لڑکی کے بارے میں زمان سے پوچھے کہ وہ کون ہے؟ مگر وہ اپنے میں ہمت ہی نہ پا رہا تھا۔ تبھی وہ بالوں کو ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے ان کے قریب آ گئی۔

''چاچو! مار لیا میں نے میدان۔''

ثمینہ نے زمان کے ہاتھ میں ٹکٹ پکڑا دیئے۔ اس وقت زمان نہایت شرمندگی محسوس کر رہا تھا، صفدر کے سامنے کہ وہ کیا سوچے گا، زمان کی بھتیجی ایسی ہے۔ مگر اسے کیا پتہ تھا کہ ثمینہ کا یہی لاابالی پن ہی صفدر کے دل میں جگہ بنا گیا ہے۔ برسوں کا سنبھالا ہوا دل ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اُس کے بلیو سوٹ پر پرنٹڈ دوپٹہ اوڑھے وہ نہایت اچھی لگ رہی تھی۔ پھر زمان، صفدر سے معذرت کر کے ثمینہ کو لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

⊛......⊛......⊛

دوسری صبح ناشتے پر صفدر جاوید نے خدیجہ جاوید سے کہا۔

''امی جی! میں نے آپ کے لئے بہو پسند کر لی ہے۔''

''سچ بھائی؟'' نصرت اور عفت ایک ساتھ چیخیں۔

''آف کورس۔''

''کون ہے بھئی وہ؟'' کرنل جاوید بھی اس معاملے کے بیچ دلچسپی لیتے ہوئے بولے۔

''ہے ایک لڑکی۔'' وہ بے نیازی دکھاتا ہوا بولا۔

''یقیناً لڑکی ہی ہوگی۔ پر ہے کون؟'' وہ ہنسے۔

''اچھی فیملی ہے۔ اس کے چچا میرے محکمے ہی میں جونیئر ایگزیکٹو آفیسر ہیں۔''

''اچھا، اچھا۔'' کرنل جاوید چائے کا سپ لیتے ہوئے بولے۔

''کب سے ہے چکر؟'' کیپٹن منصور نے صفدر کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''بھئی، اسے تو میں نے کل پہلی بار دیکھا ہے۔'' صفدر اس کے جملے سے لطف لیتا ہوا بولا۔

''یعنی دیکھا اور فتح کر لیا۔''

"نہیں، دیکھا اور پانے کی خواہش کر لی۔" صفدر جاوید جلدی سے بولا۔

"ویری گڈ۔" منصور چٹکی بجا کر بولا۔

"امی جی! آپ ان کے ہاں جائیں گی نا؟"

"کیوں نہیں بیٹے! میں تو تمہیں لڑکیوں کی تصویریں دکھا دکھا کر تھک چکی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی پسند تو آئی۔ اور........"

"پھر زندگی تم کو گزارنی ہے۔ لیکن اچھی طرح سوچ لو۔" کرنل جاوید بولے۔

"ڈیڈی! میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے اور آپ کو علم ہے کہ میں اپنے فیصلے پر کبھی نہیں پچھتاتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا انتخاب آپ کو پسند آئے گا۔" صفدر کے لہجے میں یقین کے گھنگھرو بول رہے تھے۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کب چلنا ہے؟" خدیجہ بیگم نے کہا۔

"میں آج زمان صاحب سے بات کرلوں، پھر جو وہ کہیں گے۔"

"ہاں بھئی، ایسا نہ ہو کہ وہ لڑکی پہلے سے انگیجڈ ہو۔" خدیجہ بیگم نے کہا تو صفدر کے دل پر گھونسا سا پڑا۔

'خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ ویسے اس کو دیکھ کر پتہ تو نہیں چلتا کہ کسی کا سایہ اُس کے دل پر پڑا ہو۔' صفدر نے دل ہی دل میں سوچا اور کرسی کھسکا کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا۔

موٹر ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بار بار ایک ہی جملہ دل کے دالان میں چکرا رہا تھا۔

"اگر وہ انگیجڈ ہوئی؟"

"نہیں نہیں......ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ سر جھٹک دیتا۔ مگر خیالوں کے آکٹوپس بھلا سر جھٹکنے سے بھی کہیں بھاگے ہیں؟

اتنے عرصے بعد تو اسے لڑکی پسند آئی تھی۔ حالانکہ جب سے وہ جاب پر لگا تھا، تب سے اس کی امی لڑکیوں کی تصویریں دکھا دکھا کر ہار چکی تھیں۔ اسے کوئی لڑکی بھی تو پسند نہ آتی تھی۔ اور اب پسند بھی آئی تو لااُبالی سی ثمینہ۔ جو خوبیاں وہ اپنی بیوی میں چاہتا تھا، ثمینہ کو دیکھنے کے بعد اسے یقین تھا کہ اس میں ہر وہ خوبی موجود ہے۔ پتہ نہیں، ہر مرد میں یہ کیا عادت ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اس کے خوابوں کے مطابق ڈھلی ڈھلائی ملے۔ صفدر بھی ایسے ہی مردوں میں سے تھا۔

اس کا جی چاہا، وہ فوراً زمان کے کمرے میں چلا جائے اور پوچھے۔ "کل جو آپ کے ساتھ لڑکی تھی، کیا وہ کسی سے منسوب ہے؟"

اُس نے پیون کو زمان کے کمرے میں بھیجا مگر وہ موجود نہ تھا۔ پھر دس بجے ڈائریکٹر جنرل نے میٹنگ بلوا لی۔ صفدر اور زمان وہیں مصروف ہو گئے۔ اُس روز صفدر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ خالی خالی ذہن لئے بیٹھا رہا۔

جب میٹنگ ختم ہوئی تو زمان نے صفدر کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"آج تم مجھے اپ سیٹ لگ رہے ہو؟"

"ہاں، واقعی میں آج بہت اپ سیٹ ہوں۔" صفدر نے اعتراف کیا۔

"چلو میرے آفس میں۔ ایک کپ چائے ہی پی لو میرے ساتھ۔" زمان نے آفر کی۔

"خود ہی کڑی سے کڑی مل رہی ہے۔" صفدر نے دل ہی دل میں سوچا اور زمان کے آفس میں آ گیا۔

زمان نے اپنے پیون کو چائے لینے بھیج دیا۔

"زمان صاحب! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" صفدر میز پر کہنیاں ٹکاتا ہوا بولا۔

"ہاں ہاں، کرو۔ مگر ثمینہ کے بارے میں مجھے مزید شرمندہ مت کرنا۔ وہ ہے تو میری بھتیجی، مگر بہت ہی لااُبالی سی ہے۔ بقول اس کے، میں ساتھ ہوتا ہوں تو اس کا بچپن اپنی پوری شدتوں کے ساتھ لوٹ آتا ہے۔ اور تمہیں حیرت ہو گی کہ کل میں نے اس سے سینما کے ٹکٹ کیوں منگوائے تو یہ اُس کی اپنی خواہش تھی۔"

"آپ نہ جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ بخدا مجھے آپ کی بھتیجی بہت اچھی لگی ہے۔ مجھے چھوئی موئی سی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"پھر......؟" زمان نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"میں لاگ لپیٹ کا قائل نہیں ہوں، زمان صاحب! جہاں بیری ہوتی ہے، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں نا۔ اور میں نے آج اپنی امی سے بات کی تھی۔ میں انہیں آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"موسٹ ویلکم......مگر کس لئے؟......کیسی بات کی تھی تم نے؟" زمان واقعی نہ سمجھ سکا تھا۔

"میں، ثمینہ کو اپنانا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا۔

"اوہ......!" زمان کے ہونٹ سکڑ گئے اور صفدر کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کل تم نے پہلی بار صرف چند منٹوں کے لئے اُسے دیکھا ہے۔ اور پھر ڈیئر! زندگی کے ہمسفر کے بارے میں اچانک فیصلے تو نہیں کئے جاتے نا۔"

"بعض فیصلے اچانک بھی ہوں تو پائیدار ہوتے ہیں۔" صفدر نے رسان سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے جیسے کہ میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔"

"مگر ایسے فیصلے دل سے نہیں، ذہن سے کئے جاتے ہیں۔" زمان نے کہا۔

"میں نے دل کی بات کو ذہن سے تسلیم کروایا ہے۔ تبھی تو آپ سے بات کر رہا ہوں۔" صفدر جاوید برجستہ جواب دے رہا تھا اور زمان پیشانی کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ صفدر نے اسے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر کہا۔

"کیا ثمینہ انگیجڈ ہے؟"

"نہیں۔" زمان نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟" صفدر نے پوچھنے کو تو یہ سوال پوچھ لیا مگر اس کا دل قلابازیاں کھانے لگا تھا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ وہ اور کسی کو پسند کرے، ناممکن ہی ہے۔"

"پھر کون سی بات ہے، جو آپ سوچوں میں گم ہو گئے ہیں؟" صفدر نے کہا۔

"دیکھو صفدر! یہ رشتے کوئی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں۔ ساری زندگی کی بساط بچھانی پڑتی ہے۔" زمان نے کہا۔

"میں گزشتہ دو سال سے آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کو علم ہے کہ میرا ریکارڈ کیا ہے اور میرا کیریکٹر کیا ہے۔ کسی کو سمجھنے کے لئے دو گھنٹے بھی کافی ہوتے ہیں، پھر میں تو دو سال سے یہاں ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے گھر والوں کو میری گارنٹی دینے میں نہیں ہچکچائیں گے۔ خدا نے چاہا تو آپ کو پشیمان نہیں ہونا پڑے گا۔"

"تم نے صحیح کہا۔ مگر عزیزم! اس بھڑ کے چھتے کو کون سنبھالے گا؟ وہ تو زمین و آسمان ایک کر دے گی۔" زمان نے کہا۔

"کیوں؟" صفدر حیرت سے بولا۔

"بس، اُس کی انوکھی شرط ہے کہ ایم اے کے بعد لیکچرار شپ کرنی ہے، پھر شادی۔"

"وہ تو سب لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں۔ مگر پورے کب ہوتے ہیں؟" صفدر کے لب مسکرائے۔

تبھی پیون چائے لے آیا تو بات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر پھر زمان نے بات شروع کی۔

"وہ اپنی بات منوانے کا فن جانتی ہے۔"

"میرے گھر والے تو تین سال انتظار نہیں کریں گے۔"

"تمہیں کس نے کہا، دو تین سال لگیں گے؟...... ایم اے کا فائنل سمسٹر دے کر آئی ہے کراچی سے۔"

"نہیں۔" صفدر کو حیرت ہوئی۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ بی اے کی طالبہ ہو گی وہ۔

"مت یقین کرو۔ پر ہے یہ حقیقت۔" زمان نے کہا۔

"بس زمان صاحب! آپ میری مدد کریں۔" وہ مچل گیا۔

"دیکھو دوست! ہمارے خاندان میں کبھی برادری سے باہر شادی نہیں کی گئی، کسی بھی لڑکی کی۔" زمان نے اسے بتایا۔

"تو میں اُمید توڑ دوں؟" صفدر کی آواز ڈوب گئی۔

"یہ تو نہیں کہا میں نے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ خاندان میں بھی کوئی لڑکا ایسا نہیں، جسے میں یہ کہوں کہ یہ ثمینہ کے قابل ہے یا اس کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔"

"کیسی خامیاں؟"

"بہت ضدی ہے۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ طبیعت پائی ہے اس نے۔ غصہ تو اس کا چند لمحوں کا ہوتا ہے، مگر وہ غصہ نہیں، بھونچال ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ بہت اچھے دل کی اور صاف گو لڑکی ہے۔ شادی کے بعد محبت کی قائل ہے۔ شادی سے پہلے محبت کو فراڈ اور دھوکا سمجھتی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کا ہم سفر جو کوئی بھی ہو، اس کا ذہن ایسا ہو کہ جو ثمینہ کو سمجھ سکے اور جس نے اسے سمجھ لیا، اس کی زندگی بہت سکھ چین سے گزرے گی۔" زمان آہستہ آہستہ ثمینہ کی خوبیاں اور خامیاں گنوا رہا تھا۔

"زمان صاحب! میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ کیوں اچھی لگی، بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان شاء اللہ! آپ کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنی والدہ کو لے آنا۔" زمان نے کہہ دیا۔

"میں مطمئن ہو جاؤں نا کہ میرا پروپوزل منظور ہو جائے گا؟"

"یہ درست ہے کہ میرا ووٹ تمہاری طرف ہی ہوگا، لیکن فائنل تو بہرحال بابا جان اور عثمان بھائی ہی کریں گے۔"

"ٹیسٹ میں پاس ہو گیا ہوں، اِن شاء اللہ امتحان میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔" صفدر نے زمان کا ہاتھ تھام کر یوں کہا، جیسے کہ اس کی قسمت کا فیصلہ انہی ہاتھوں کو کرنا ہو۔ اور پتہ نہیں، زمان کو کیوں اس پر بے طرح پیار آ گیا۔

⊛......⊛......⊛

اُسی شام صفدر جاوید اپنی والدہ اور بہن نصرت کے ساتھ آ موجود ہوا۔

زمان نے اماں اور بہن عابدہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اماں تو بری طرح گھبرا گئی تھیں۔

"عثمان اور سلمیٰ ہیں نہیں۔"

"آپ لڑکا تو دیکھ لیں، پھر آج ہی میں انہیں فون کر دوں گا۔ وہ آ کر خود بھی اطمینان کر لیں گے۔"

"اُسے کون منائے گا؟" اماں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ فی الحال اسے کچھ نہ بتایا جائے۔" زمان نے کہا۔

"مجھ پر بعد میں الزام نہ آئے۔" دادی اماں نے کہا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں۔" زمان نے اماں کو دلاسہ دیا تھا اور تبھی تو اب اماں نے خدیجہ بیگم کا پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔

"بہن! ذرا اُس بچی کو تو بلائیں۔" خدیجہ بیگم نے عابدہ جبیں سے کہا۔

"ہاں، جس نے ہمارے بھائی کی نیندیں چرا لی ہیں۔" نصرت نے ہنس کر کہا تو عابدہ جبیں بھی ہنس دیں اور اسے بلانے چلی گئیں۔ صوفے پر زمان کے قریب بیٹھے صفدر کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

عابدہ جبیں اس کے کمرے میں گئیں تو وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اُس کا صبیح چہرہ نہایت پاکیزہ لگ رہا تھا۔ ہاتھ چہرے پر پھیر کر وہ جاء نماز تہ کرتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "ثمینہ بیٹی! زمان کے دوست کی امی اور بہن آئی ہیں۔ ذرا آ جاؤ۔"

"بہتر پھپھو جی!"

"کپڑے تو بدل لو۔"

"دوپہر کو تو بدلے ہیں۔ ٹھیک ہیں۔" ثمینہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے اپنے لیلن کے سیاہ پرنٹڈ سوٹ کی طرف دیکھا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" عابدہ جبیں نے کہا۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا، جس نے پسند کرنا تھا۔ کر تو لیا ہے، اب بننے سنورنے کی اسے کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی وہ سادہ سی ثمینہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں رخصت ہوئی تو صفدر ہی کی نظر پہلے پڑی۔ اُس کی دھڑکنیں رُکنے لگیں۔ ثمینہ سب کو سلام کرتی ہوئی خدیجہ بیگم کے پاس ہی بیٹھ گئی بلکہ انہوں نے خود اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"بڑی پیاری بچی ہے۔" خدیجہ بیگم کے منہ سے نکلنے والا یہ جملہ صفدر کے دل میں ٹھنڈک اُتار گیا۔

"پڑھتی ہو، بیٹا؟"

"جی پڑھ چکی۔ ایم اے کا امتحان دیا ہے۔"

"ارے...... اس چھوٹی سی عمر میں آپ نے ایم اے بھی کر لیا۔" نصرت نے حیرت سے کہا۔

"بھئی نظر تو نہ لگائیں۔" ثمینہ نے کھٹ کہا تو صفدر ہنس دیا اور زمان پہلو بدل کر رہ گیا۔

خدیجہ بیگم مسکرا کر اماں سے باتوں میں لگ گئیں اور وہ تو نصرت سے اس طرح باتیں کر رہی تھی، جیسے کہ بہت پرانی جان پہچان ہو۔ چند لمحوں ہی میں اس نے نصرت کے دل میں گھر کر لیا اور وہ سوچنے لگی۔

"واقعی، تم ہو ہی اس قابل کہ تمہیں چاہا جائے، پوجنے کی حد تک۔"

ان کے لئے چائے پر ہی خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور جب وہ جانے لگیں تو خدیجہ بیگم اماں اور عابدہ جبیں سے بولیں۔

"آپ لوگ آئیے گا ہمارے گھر۔"

"ہاں، ہاں...... ضرور آئیں گے۔" اماں اور عابدہ جبیں کے بولنے سے پہلے ہی ثمینہ نے کہا۔

تب نصرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو اب ہم مستقل لے جائیں گے۔"

"نہیں بھئی، میں مستقل تو کہیں بھی نہیں رہ سکتی۔" وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"مگر ہمارے ہاں رہنا پڑے گا۔" نصرت نے اس کے گال پر چپت لگاتے ہوئے کہا تو ثمینہ کی نظریں سامنے موڑ میں بیٹھے صفدر جاوید کی طرف اُٹھ گئیں، جو آنکھوں میں قندیلیں روشن کئے اسی کو دیکھے جا رہے تھے اور ثمینہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"بر دکھوا...... یعنی میرا بر دکھوا۔"

نصرت اور خدیجہ بیگم جا چکی تھیں۔ اماں اور عابدہ جبیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

"بہت اچھے لوگ ہیں۔ اور بہت ہی شریف۔" وہ اندر چلی گئیں تو ثمینہ نے دیکھا، زمان احمد برآمدے میں دونوں بازو سینے پر لپیٹے کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کے قریب گئی اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

"یہ...... یہ لوگ یہاں کیوں آئے تھے؟"

"تمہیں دیکھنے۔" وہ سچ بولنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

"میں کوئی دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں؟"

"صفدر بہت اچھا لڑکا ہے۔" زمان نے کہا۔

"ہے تو ہوتا رہے۔" ثمینہ گرجی۔

"میری خواہش ہے کہ تم مستقل ملتان میں رہو۔" زمان نے بتایا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے عثمان بھائی نے بتایا تھا کہ تمہارے پروپوزل آ رہے ہیں۔ تمہاری کسی کلاس فیلو نے بھی تمہیں پروپوز کیا ہے۔ میں نے سوچا اس طرح تو تم مستقل کراچی میں رہو گی۔ اور پھر پتہ نہیں وہ لوگ کیسے ہوں گے۔ ہم اس بے تکلفی سے مل بھی سکیں یا نہیں۔ تب میں نے صفدر کو تمہارے لئے مناسب جانا۔ میں چاہتا ہوں، تم یہیں رہو میرے قریب۔ کیونکہ تم میری واحد دوست ہو، جس سے میں اپنے دل کی ہر بات کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔ پھر اب اس عمر میں کہاں میں رازداں تلاش کرتا پھروں۔ تم میرے بڑے بھائی کی بیٹی ہی نہیں، میری دوست بھی ہو۔" زمان دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔

"زمان بھائی!" ثمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں، زمان بھائی کی بہن! یہ میری خواہش ہے۔ اگر تمہاری کوئی تمنا، تمہارے دل

کا کوئی خواب ہو تو مجھے بتا دو۔ میں صفدر کو انکار کر دوں گا۔"

"میرے دل کا خواب۔" ثمینہ زور سے ہنس دی۔ "آپ کو پتہ ہے کہ ایسی کوئی بات ہوتی تو سب سے پہلے آپ ہی کو بتاتی۔ چاہے آپ مجھے جوتے بھی مارتے۔ میری کوئی پسند نہیں، زمان بھائی! مجھے آپ کی پسند قبول ہے۔" ثمینہ نے سر جھکا دیا اور کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے پھسلتے چلے گئے۔

پھر وہ جو کہتے ہیں کہ جہاں نصیبہ جڑے ہوں، آپ ہی آپ ہر رکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔ عثمان احمد اور سلمٰی کو بھی صفدر بہت پسند آیا تھا اور وہ ہر لحاظ سے انہیں اپنی بیٹی کے لئے مناسب لگا تھا۔ صفدر جلد از جلد ثمینہ کے وجود سے اپنا گھر بسانا چاہتا تھا، اس لئے ایک ماہ کے اندر اندر شادی کی سب تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔

جس روز ثمینہ کو مایوں بٹھایا گیا، تب پہلی بار زمان احمد بے تحاشا رویا۔ اسے لگا اس کی دوست واقعی پرائی ہو رہی ہے۔ وہ ثمینہ کے زرد چہرے کو دیکھتا تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں نمی اتر آتی۔ وہ ایک دم ہی گم صم ہو گئی تھی۔ تب ایک روز جب لڑکیاں اس کے پاس نہ تھیں تو زمان احمد نے اسے اکیلا پا کر پوچھا۔

"تم خوش ہو ناثمن؟"

"ہاں زمان بھائی! بھلا آپ کے انتخاب پر خوش نہ ہوں گی۔"

"پھر تم چپ چپ کیوں رہتی ہو؟ ہنستی بولتی کیوں نہیں؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اب سب کے سامنے ٹھٹھے لگاؤں تو سب سمجھیں گے کہ مجھے ذرا بھی پرائے گھر جانے کا دُکھ نہیں۔" وہ رازداری سے بولی۔

"اب وہ پرایا نہیں، تمہارا اپنا گھر ہے۔" زمان نے کہا۔

"چلیں، جو بھی ہے، مگر زمان بھائی! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر...... کیا ڈر؟" زمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"پتہ نہیں، صفدر کیسا ہو؟"

"ارے گھائل کر دیا ہے تم نے اسے۔ بس ثمن جی! یہ یاد رکھنا کہ مرد مٹ جانے والی عورت کو پسند کرتا ہے۔ تم بھی مٹ جانا اس کی خاطر۔ اپنا سب لااُبالی پن چھوڑ دینا۔ بات بات پر ضد اور غصہ مت کرنا۔ صفدر کا ہر حکم سر جھکا کر ماننا۔ زندگی بہت سہل گزرے گی۔" زمان آہستہ آہستہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے بہت تجربوں سے گزرے ہوں۔" ثمینہ نے کہا۔

''میں مرد ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ مرد بیوی میں کیا صفات دیکھنا پسند کرتا ہے۔''

''مگر مرد کو یہ پتہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر میں کیا خوبیاں دیکھنا پسند کرتی ہے۔'' ثمینہ نے زمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ زمان کوئی جواب دیتا، لڑکیوں کا پورا ریلا کمرے میں آ گیا تو زمان باہر چلا گیا۔

اور ثمینہ جو لیکچرار بننے کے خواب دیکھتی تھی، صفدر جاوید کے خوابوں کو پلکوں پر سجا کر ان خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے اس کے نام کی مہندی ہاتھوں میں رچائے ملتان آ گئی۔

صفدر نے پہلے دن ہی اسے اتنی محبتیں دیں کہ اس کے سارے خدشے گزرتے وقت کے سیلاب میں بہہ گئے۔

امی اور ڈیڈی اسے نصرت اور عفت کی طرح چاہتے تھے۔ منصور بھابی بھابی کہتے نہ تھکتا۔ اور صفدر کی تو بات ہی اور تھی۔ خوش رنگ جملوں کے کتنے ہی موتی وہ اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔ وہ یہاں آ کر بہت امیر ہو گئی تھی۔ محبتوں کے معاملے میں تو شروع ہی سے خوش قسمت تھی، ہر جگہ محبتیں ہی ملی تھیں۔

اس کی شادی کو پانچ ہفتے گزر گئے تھے اور زمان احمد ایک بار بھی اس سے ملنے نہ آیا تھا۔ بس صبح و شام فون کر دیتا۔ وہ اسے آنے کو کہتی تو ہنس کر ٹال جاتا۔

صفدر آفس جا رہا تھا تو ثمینہ نے کہا۔

''آپ زمان بھائی سے کہیں کہ مجھے روز ملنے آیا کریں۔''

صفدر اس کے بچوں کے سے انداز پر ہنس دیا۔

اسی شام صفدر، زمان احمد کو لے کر آ گیا۔ ثمینہ اسے اتنے دنوں بعد دیکھ کر بری طرح رو دی۔

''آپ اتنے دن کیوں نہیں آئے؟'' وہ ضدی بچوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

''میں نے سوچا، کیا تم لوگوں کو ڈسٹرب کروں۔'' زمان نے سرگوشی کی، جو صفدر نے بھی سن لی۔ وہ زور سے ہنس دیا۔ جب کہ ثمینہ کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا تھا۔

''آپ کو یاد ہے کہ آپ نے مجھے اس شادی پر کیا کہہ کر راضی کیا تھا؟'' ثمینہ، صفدر کی پروا کئے بغیر بولی اور زمان احمد گھبرا سا گیا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہاں یاد ہے۔''

''پھر آپ روز ملنے کیوں نہیں آتے؟ بتائیں۔ اگر نہیں ملنے آ سکتے تھے تو پھر مجھے یہاں شادی کے لئے مجبور کیوں کیا تھا۔ اسے اس کی پروا بھی نہ تھی کہ صفدر کے چہرے کا

رنگ زرد ہو گیا ہے۔

''یہ پوچھو کہ تمہارے شوہر نے کیا رشوت دی تھی؟'' زمان نے کہا۔

''رشوت!'' ثمینہ نے یہ لفظ دہرایا۔

''ہاں، اس نے کہا تھا کہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے سوچا اس سے بہتر اور کوئی شخص نہیں مل سکتا، جو تم شترِ بے مہاری کو نکیل بھی ڈال دے اور خوش بھی رکھے۔''

زمان احمد کے آنے سے وہ بہت خوش تھی اور اس خوشی میں تو وہ صفدر کو بھی بھول گئی تھی۔ وہ ڈیڈی اور صفدر سے خاصی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر ڈیڈی نے اسے زبردستی رات کے کھانے کے لئے روک لیا۔ اور جب وہ اور صفدر، زمان احمد کو گیٹ تک چھوڑنے کے بعد اپنے کمرے میں آئے تو اچانک ہی صفدر کا موڈ بدل گیا۔

''مجھ سے شادی کر کے تم خوش نہیں ہو؟''

''مجھے شکی مردوں سے بہت چڑ ہے۔'' ثمینہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ وہ ذرا بھی نہ گھبرائی تھی اور نہ ہی پریشان ہوئی تھی، جیسے کہ اسے علم تھا کہ زمان احمد کے جانے کے بعد صفدر کا رویّہ اس سے ایسا ہی ہو گا۔

''پھر تم نے وہ سب کیوں کہا تھا، زمان چاچا سے؟'' ثمینہ کے ناتے وہ بھی اب زمان احمد کو چاچا کہنے لگا تھا۔

''اتنی عقل تو آپ میں ہونی چاہئے کہ اگر میں اس شادی پر کسی مجبوری کے تحت راضی ہوئی ہوتی تو یہ سب آپ کے سامنے نہ کہتی، اکیلے میں زمان بھائی سے شکوہ کرتی۔ وہ روز دو وقت فون کرتے ہیں۔ تب کہہ سکتی تھی۔ مجھے افسوس ہے صفدر! آپ میری پہلی ہی آزمائش پر پورے نہیں اترے۔'' ثمینہ کی آواز بھرّا گئی اور وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ثمن!'' صفدر نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اگر مجھے کوئی اور پسند ہوتا تو میرے چاچا جی میری بات کبھی نہ ٹالتے اور یوں میں آپ کے لئے ہاں نہ کہہ دیتی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے آج تک کسی کو اس نظریے سے نہیں دیکھا۔ آپ ہی واحد ہستی ہیں، جو میرے دل میں بسی۔''

''آئی ایم سوری جان!'' صفدر واقعی شرمندہ تھا۔ ثمینہ کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔

''بس، بس....... میں اب آپ سے نہیں بولوں گی۔'' ثمینہ تکیوں میں منہ چھپا کر

بلک پڑی۔ اسے رہ رہ کر اپنی ذہنیت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر بیوی خوب صورت ہو، دل پسند ہو اور صاف گو ہو تو اس کے روٹھنے کی ادا بھی دل کو بھاتی ہے۔ اور اسی کیفیت سے صفدر بھی گزر رہا تھا۔

⊛......⊛......⊛

وقت کے سمندر میں بہت سے مہینے گم ہو گئے اور دو سال بیت گئے۔ ثمینہ کی نند نصرت کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر فلائٹ لیفٹیننٹ صادق اعوان کے ساتھ سرگودھا میں مقیم تھی۔ منصور کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ ثمرہ اس کی بڑی کیوٹ سی، بھولی بھالی سی بیوی تھی اور وہ لاأبالی سی ثمینہ ایک خوب صورت سی بیٹی میراں کی ماں بن گئی تھی۔ مگر اب بھی اس کی عادتیں وہی بچوں جیسی تھیں۔ خصوصاً جب زمان احمد آتا تو اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کا بچپن لوٹ آتا تھا۔

سب چاہتے تھے کہ زمان شادی کر لے۔ بڑی اماں بھی اس کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان لئے قبر کی عمیق گہرائیوں میں اُتر گئیں۔ مگر زمان احمد پھر بھی نہ مانا۔ اسے تو سونیا سے ملنا تھا اور اسی کے انتظار میں اُمنگوں اور آرزوؤں بھرے لمحے فنا کر رہا تھا۔

تب ایک روز ثمینہ نے اسے نہایت سختی سے شادی کر لینے کی بابت کہا تو وہ نہایت دُکھ سے بولا۔

"دشمن جانی! تُو تو نہ کہا کر مجھے شادی کے لئے۔ نہ کریدا کر میرے زخم۔ تجھے تو پتہ ہے سب، پھر کیوں کھرچتی ہے انہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں انتظار کر رہا ہوں اس کا۔ جس روز سونیا مجھے ملی، میں شادی کا فیصلہ کر لوں گا۔"

"فرض کریں، اس کی شادی ہو گئی تو؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بس اسے ایک بار ملنا چاہتا ہوں، تاکہ وہ مجھ پر بے وفائی کا الزام نہ دھرے۔ اس نے کہا تھا کہ دعوے کرنے والے منہ کے بل گرتے ہیں۔"

"توبہ ہے، کون سے وعدے کئے تھے آپ نے اس سے؟" وہ چڑ گئی۔

"ہوئے تھے وعدے۔ کیا تھا دعویٰ میں نے اسے اپنانے کا۔ اور ضروری تو نہیں کہ ہر بات زبان سے کہہ دی جائے۔ کچھ باتیں آنکھیں بھی کہتی ہیں، جو سچی اور انمول ہوتی ہیں۔ زبان جھوٹ کہہ سکتی ہے، مگر آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں۔" وہ نہایت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"آپ تو ٹیپ ریکارڈر کی طرح شروع ہو جاتے ہیں۔"

"پھر تم کیوں مجبور کرتی ہو؟"

"آئندہ میری توبہ جو کچھ کہوں۔" ثمینہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو وہ ہنس دیا اور میراں سے کھیلنے لگا۔

"کب سے میرا دماغ چاٹ رہی ہو۔ ایک کپ چائے تو بنا لاؤ۔"

"ابھی تو آپ نے پی تھی۔"

"کیا دوبارہ نہ پیوں؟" وہ مسکرایا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ آج کل آپ نے سگریٹ پینا بھی بہت زیادہ کر دی ہے اور چائے بھی۔ دونوں ہی چیزیں خون جلاتی ہیں۔ کیا فائدہ؟"

"پلانی ہے تو چائے پلاؤ۔ لیکچر مت دو۔" زمان احمد نے منہ بنا کر کہا تو وہ اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

⊛......⊛......⊛

ثمینہ کئی روز سے محسوس کر رہی تھی کہ جب زمان احمد آتا ہے تو اس کی چھوٹی نند عفت جہاں، جو تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی، بار بار ثمینہ کے کمرے کے چکر لگاتی ہے کیونکہ زمان اسی کے کمرے میں بیٹھتا تھا۔ ثمینہ سے باتیں بھی کرتا تھا اور میراں سے بھی کھیلتا۔

ثمینہ کو کہنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی، عفت جلدی سے چائے بنا لاتی اور خاصا اہتمام کرتی۔ کبھی چائے کے ساتھ سموسے ہوتے۔ کبھی گرم گرم پکوڑے یا کباب۔ اسے نہ جانے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ زمان یہ چیزیں بہت شوق سے کھاتا ہے۔

شروع میں تو ثمینہ نے زیادہ توجہ نہ دی مگر اس روز جب ثمینہ، میراں کو فیریکس کھلا رہی تھی، عفت' چائے رکھ کر جانے لگی تو ثمینہ نے کہا۔

"پلیز عفی! اب ذرا بنانے کی بھی تکلیف کر لو۔"

عفت نے چائے بنا کر زمان کو دی تو ثمینہ نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کتنے ہی دھنک رنگ بکھر گئے، جو بلاشبہ محبت کے رنگ تھے۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ ثمینہ نے ترچھی نظر سے زمان کو دیکھا، جو عفت سے بے نیاز اخبار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

'یعنی وہ یکطرفہ معاملہ ہے۔' ثمینہ نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

"تم فضول ہی میں شک کر رہی ہو۔ جو تم سوچ رہی ہو، شاید وہ نہ ہو۔ صفدر سے مت کہہ دینا۔ کہیں اس کے دل میں بات آئے کہ تم اس کی بہن پر الزام لگا رہی ہو۔"

ثمینہ کے دل میں خیالوں کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے۔

پھرتو ثمینہ نے عفت پر نظر رکھنی شروع کر دی۔

اس نے محسوس کیا کہ جب زمان احمد کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو وہ پاؤں جلی بلی کی طرح چکراتی پھرتی ہے برآمدے میں۔ اور جب وہ آتا ہے تو کتنے ہی سنہری لفظ اس کی آنکھوں میں تحریر ہو جاتے ہیں۔ کال بیل کی آواز پر یوں اُچھلتی ہے جیسے کہ بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

زمان احمد سامنے آتا تو عفت کی چمکتی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ جاتی۔ گالوں پر شدتِ جذبات سے سرخی پھیل جاتی اور پلکیں بوجھ حیا سے سرخ عارضوں پر تھر کنے لگتیں۔

کئی روز تک ثمینہ، عفت کی حرکات کا جائزہ لیتی رہی۔ خصوصاً جب زمان آیا ہوا ہوتا تو جو اس کی کیفیت ہوتی، ثمینہ سے وہ پوشیدہ نہ تھی۔ مگر اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ زمان اس سے سلام دعا کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ اور عفت کے لئے یہی کچھ بہت تھا۔ عفت وقت کی منتظر تھی۔ وہ آنے والا وقت، جس نے اس کی زندگی کے چمن میں پھول ہی پھول کھلانے تھے۔

عفت اسٹڈی میں دوسرے دن ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی کہ ثمینہ آ گئی۔ ثمینہ کو دیکھ کر اس کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ سج گئی۔

”کوئی کام تھا بھابی!“ عفت نے پوچھا۔

”ہاں، ایک بات تم سے پوچھنی تھی۔“ ثمینہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”پوچھیں۔“ وہ بالوں میں پین پھیرتے ہوئے بولی۔

”وہ........ عفی........“ ثمینہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس سے بات کرے۔ ہمت کر کے یہاں تک تو آ گئی تھی، مگر دل میں خوف کا پنچھی بھی بکل مارے بیٹھا تھا۔ اگر عفت نے کہا کہ وہ زمان کو پسند نہیں کرتی تو کیا ہوگا؟........ وہ سمجھے گی، میں اس پر کوئی الزام لگانا چاہتی ہوں۔ اصل میں اس کا رشتہ ہی اس سے ایسا نازک تھا کہ ہر لمحہ، ہر ساعت دھڑکا لگا رہتا۔

”آپ کچھ پوچھنا چاہتی تھیں، بھابی!“ عفت نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا۔

”تمہیں زمان بھائی کیسے لگتے ہیں؟“ منہ پھٹ ثمینہ نے ایک دم ہی کہہ دیا۔ عفت کی اُنگلیاں کانپیں اور قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی کہ جس سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کی آنکھیں

آپ ہی آپ جھک گئیں۔

”دیکھو، ڈرو مت۔ میں تمہاری دوست ہوں، عفت! تم بلا جھجک مجھے اپنے دل کا راز بتا دو۔“ ثمینہ نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

”وہ........ وہ بھابی........!“ عفت ہکلا گئی۔

”تم سے زمان بھائی نے تو کچھ نہیں کہا؟“ ثمینہ نے پوچھا۔

”نہیں بھابی! وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔ میری طرف دیکھتے ہی نہیں۔“ عفت نے مایوس لہجے میں کہا۔

”تم چاہتی ہو کہ وہ تمہاری طرف دیکھیں۔“ ثمینہ نے اس کی طرف دیکھا تو عفت نے سر جھکا لیا، جو اس بات کا اعتراف تھا کہ ثمینہ جو کہہ رہی ہے، عفت یہی چاہتی ہے۔ یہی اس کے دل کی آواز ہے۔

”تمہیں پتہ ہے کہ زمان بھائی کیوں شادی نہیں کرنا چاہتے؟“ ثمینہ نے پوچھا۔

”عام سی بات ہے، کسی کی محبت سے وفا نباہ رہے ہیں۔“ وہ بولی۔

”پھر بھی تم انہیں چاہنے کی غلطی کر بیٹھی ہو۔“

”بھابی! چاہنا اور چاہے جانا...... اسی جذبے کی لگن ہر دل میں ہوتی ہے۔ اور جسے دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں سے چاہا جائے، اسے پانے کی تمنا بھی دل کے آنگن میں مچلتی ہے۔ مگر بہت کم چاہنے والے ایک دوسرے کو پا سکتے ہیں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ زمان نے بھی کسی کو اتنی ہی شدتوں سے چاہا ہے کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اپنے دل پر اس کی آہٹیں محسوس کرتے ہیں۔“ عفت نہایت دھیمے دھیمے کہہ رہی تھی اور ثمینہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی وہ۔ محبت میں کیسی طاقت ہے، جو بولنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ ہی آپ بہت سی انہونی باتوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

”سچ بھابی! میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کے سب دکھ لے لوں۔“ عفت دکھ سے بولی۔

”دکھ لینے کی بات مت کرو۔ خدا تمہیں خوشیاں دے۔“ ثمینہ نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

”میں صفدر سے بات کروں گی۔“

”آپ پہلے زمان صاحب سے تو بات کریں۔“ عفت نے ہولے سے کہا۔

"ہاں، یہ بھی تم نے صحیح کہا۔ میں پہلے زمان بھائی سے بات کروں گی۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" ثمینہ نے کہا۔

حالانکہ اسے پتہ تھا کہ جو وہ کہہ رہی ہے، وہی عفت کے دل کی تمنا بھی ہے۔

"بھابی! اگر زمان صاحب نہ مانے، پھر؟" عفت نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ تمہارا مقدر۔ لیکن میری شدید ترین خواہش ہے کہ وہ اپنی محبت نہیں پا سکے تو تم تو پالو۔ تم دونوں ہی مجھے بہت عزیز ہو۔" ثمینہ نے عفت کو لپٹا لیا تو ڈھیروں سکون عفت کے دل کی دیواروں سے لپٹ گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

"میراں کہاں ہے؟" زمان احمد نے آتے ہی ثمینہ سے پوچھا۔

"دم تو لیں۔" ثمینہ نے ہنس کر کہا۔

"سچ، میں اس اپنی ننھی دوست کے لئے بہت اُداس ہو گیا ہوں۔" زمان کرسی پر گر سا گیا۔

وہ پورے ایک ہفتے بعد علی پور سے لوٹا تھا، کیونکہ ملک احمد خان کی طبیعت خراب تھی۔ صفدر اور ثمینہ بھی ایک روز جا کر انہیں دیکھ آئے تھے، جب کہ زمان چھٹی لے کر مستقل وہیں رہا تھا۔

"دادا ابا اب کیسے ہیں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اور یوں بھی اب بوڑھے ہو گئے ہیں تو بیماریاں حملہ کرتی ہی رہتی ہیں۔" زمان احمد پیشانی پر آئے بالوں کو ہاتھ سے پرے کرتا ہوا بولا۔

تبھی عفت، میراں کو لئے آ گئی۔ ثمینہ کے لب مسکرا دیئے۔ اس نے دل ہی دل میں عفت کو مخاطب کیا۔

"تم تک اس کی خوشبو پہنچ گئی تھی، جو تم آ گئی ہو۔"

میراں، زمان کو دیکھ کر اس کی طرف لپکنے لگی۔

"ما...... ما!"

"آؤ، ماما کی جان!" زمان احمد نے بازو پھیلا دیئے اور عفت نے میراں کو اس کے حوالے کر دیا۔ اور وہ اس کی کیفیت سے بے نیاز میراں کے پھولے پھولے گال چوم رہا تھا۔ اور میراں نے مٹھیوں میں زمان کے بال جکڑ لئے تھے۔ عفت جلدی سے کمرے سے نکل گئی کہ وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں ہی اختیار میں نہ رہی تھیں۔

"زمان بھائی! میراں نے آپ کے بال اس لئے جکڑ رکھے ہیں کہ آپ اتنے دن بعد کیوں آئے؟" ثمینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس کی بھی عادتیں تمہاری طرح ہیں۔ تم نے بھی بارہا میرے خوب صورت بالوں کو جڑ سے اُکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔" زمان اپنے بال چھڑاتے ہوئے بولا۔

"زمان بھائی! ایک بات کہوں؟" ثمینہ نے چادر تہہ کرتے ہوئے کہا۔

"کہو......؟" وہ بولے۔

"آپ شادی کر لیں۔ بس، اچھا نہیں لگتا۔ میری بھابی لے آئیں۔"

"تلاش تو کرتا رہتا ہوں۔" وہ مذاق سے بولے۔ وہ سمجھ گئی کہ کس طرف اشارہ ہے اس کا۔

"چار سال سے تو تلاش کر رہے ہیں، اب تک تو نہ ملی۔"

"مل جائے گی۔ کرو۔ سنا نہیں، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے؟"

"بہت ڈھیل دے دی ہے۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔ بس آپ شادی کر لیں۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔ "کب تک اس کے ملنے کی آس میں وقت گزارتے رہیں گے؟ اور کیا خبر کہ وہ ملے یا نہ ملے۔"

"اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔ اور ثمن ڈیئر! یہ دنیا اتنی بڑی تو نہیں کہ پھر ایک بار بچھڑ کے نہ مل سکیں۔" زمان کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔

"بس، میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ کو آج فیصلہ کرنا ہوگا، ورنہ......"

"ورنہ......؟" زمان نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں ساری زندگی آپ سے نہیں بولوں گی۔" اس کا انداز روٹھا روٹھا تھا۔

"بھئی اتنی کڑی شرط تو نہ لگاؤ۔" زمان مسکرایا۔

"میں نے کہہ دیا ہے، آپ کو ماننا ہوگا۔ اور میری پسند سے شادی کرنی ہوگی۔" وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔

"تو کیا تم نے لڑکی دیکھ لی؟" زمان حیران ہوتا ہوا بولا۔

"بالکل...... اور دیکھنی، کیا لڑکی گھر کی ہے۔ سچ زمان بھائی! مجھے عفت بہت پسند ہے۔ آپ...... آپ عفت کو اپنا لیں۔" ثمینہ نے جلدی سے مدعا بیان کیا اور زمان ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ آج عرصے کے بعد ثمینہ نے اسے ہنستے دیکھا تھا اس طرح کھل کر۔ مگر وہ اس ہنسی کی کب عادی تھی۔

یہ نوحوں والی ہنسی۔

جس میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

یہ ہنسی تو دل پر بوجھ بن کر گر رہی تھی۔

زمان احمد کی ہنسی میں تو زندگی ہوتی تھی۔ اس کے قہقہوں میں کھنک ہوتی تھی اور اب وہ ہنس رہا تھا تو لگ رہا تھا، جیسے اندر ہی اندر کوئی شدت سے رو رہا ہو۔ دل کی تہوں میں ماتم ہو رہا تھا۔

''مت ہنسیں اس طرح۔'' ثمینہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس کی ہنسی ثمینہ کے دل کو آرے کی طرح چیرتی ہوئی روح میں زخم بن کر اتر رہی تھی۔

''بھئی، تم نے بات ہی ایسی کی ہے کہ آپ ہی آپ ہنسی آ گئی۔ لطف آ گیا۔'' وہ مزا لیتے ہوئے بولا۔

''کوئی انوکھی بات کر دی، میں نے؟'' ثمینہ نے اسے گھورا۔

''ویسے آپس کی بات ہے، عفت نے تمہیں کتنی رشوت دی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' ثمینہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم نے یہ بات کس کے کہنے پر مجھ سے کی ہے؟''

''میرے دل نے کہی ہے یہ بات۔'' ثمینہ نے مٹھی بند کر کے انگوٹھا اپنی جانب کیا۔

''جھوٹ مت بولو، ثمن! مجھے سخت نفرت ہے جھوٹ سے۔'' زمان کا لہجہ پتھریلا تھا۔

''اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ عفت نے اپنے دل کا خواب مجھے بنا لیا ہے اور اب وہ اس خواب کی خوب صورت تعبیر چاہتی ہے۔'' زمان بولا۔

''آپ.......آپ کو کیسے پتہ؟'' مارے حیرت کے ثمینہ کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔

''بھلا میں کس طرح نہ دیکھ پاتا کہ عفت کی آنکھوں میں میری شبیہ ہے۔'' زمان کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکان بکھری ہوئی تھی۔

''تو زمان بھائی! پھر آپ عفت کو اپنا لیں نا۔'' وہ بولی۔

''کیوں؟'' وہ ابرو چڑھا کر بولی۔

''وہ آپ کو چاہتی ہے۔ دل کی عمیق گہرائیوں سے۔'' ثمینہ نے بتایا۔

''یہ مت بھولو کہ میرے دل میں کوئی بسا ہے۔ وہ تو اس راستے پر ابھی چلی ہے اور میں چار برس سے یہ آبلہ پائی کا سفر طے کر رہا ہوں۔''

''سائے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں آپ۔'' ثمینہ غصے سے بولی۔

''سائے بھی زندگی کی اہم ضرورت ہوتے ہیں۔ میں بھی اسی سائے کو پانے کے لئے تپتے ریگستان میں ننگے پاؤں چل رہا ہوں۔'' زمان احمد نے بتایا۔

''ساری زندگی چلتے رہیں گے، مگر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔'' ثمینہ نے گیلی لکڑی کی طرح سلگ کر کہا۔

''داد تو آبلہ پائی کی ملے گی نا؟'' زمان کے خمیدہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، جو اس کا خاصہ تھی۔

''خلش اور تڑپ کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو گا۔ مرہم بھی نہیں ملے گا آپ کو اپنے زخموں پر لگانے کے لئے۔'' ثمینہ ہونٹ کچلتے ہوئے بولی۔

''نہ ملے۔ پھر بھی میں عفت سے شادی نہیں کر سکتا۔'' زمان نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''آج آپ فائنل بات کریں کہ آخر کب تک اس بندھن سے بچیں گے؟'' ثمینہ آج پوچھ کر ہی دم لینا چاہتی تھی۔

''ثمینہ! میں نے تم سے کہا تھا کہ جس روز سونیا ملی، میں اسی روز شادی کا فیصلہ کر لوں گا۔'' زمان احمد نے متانت سے جواب دیا۔

''اشتہار دے دیں، کہیں بھی ہو، آ جائے تاکہ آپ کا انتظار تو ختم ہو۔'' ثمینہ نے میراں کو زمان کی گود سے اٹھا کر کاٹ میں لٹا دیا۔ وہ زمان کی کلائی گھڑی سے کھیلتے کھیلتے سو گئی تھی اور وہ دونوں بحث میں لگے ہوئے تھے۔ میراں کو لٹانے کے بعد وہ پھر زمان کی طرف پلٹی۔

''آپ کوئی مخصوص وقت بتا دیں؟''

''ثمن! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔'' زمان دکھ سے بولا۔

''میں سب سمجھتی ہوں۔ مگر آپ میری بات نہیں مانتے تو آج سے میرا آپ کا تعلق سب ختم۔ مت آیا کریں میرے گھر۔'' ثمینہ کے لہجے میں اتنی سختی تھی کہ زمان ہکا بکا اسے دیکھے گیا اور پھر جھنجلا کر بولا۔

''میرے لئے عفت ہی رہ گئی ہے؟''

''چلیں، عفت سے شادی نہ کریں، کوئی اور لڑکی بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ کہیں بھی کریں، بس کریں شادی۔ آخر کب تک مجنوں کے باپ بنے رہیں گے؟''

''ثمن!'' زمان نے دھیرے سے پکارا۔ ''میں نے کبھی تمہاری کوئی بات نہیں ٹالی۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میرے دل کی بھی کوئی مجبوری ہے۔ اور وہ ہے سونیا۔ میں تمہارے

سامنے انکار کر کے بار بار شرمندہ ہو جاتا ہوں۔"

"شرمندہ ہوتے تو میری بات کیوں ٹالتے؟"

"تم دل کی لگیوں کو نہیں جانتیں۔"

"کون سا آپ نے اس سے وعدے وعید کیے تھے، جو اس کی خاطر زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آج کل تو لوگ محبت کہیں کرتے ہیں اور شادی کسی اور سے۔ یوں بھی اب وہ آپ کو ملنے سے رہی۔" وہ گرجی۔

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ مجھے ضرور ملے گی۔"

"خوش فہمی ہی میں مر جائیں گے۔"

"چلو، تمہاری جان چھوٹے گی۔"

"بس، آئندہ آپ مجھ سے بات مت کیجئے گا۔ اور نہ ہی آیئے گا یہاں۔ سمجھے؟"

مارے غصے کے ثمینہ کی آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

"میں تم سے نہیں، میراں سے ملنے آتا ہوں۔"

"کچھ نہیں لگتی میراں آپ کی۔ کوئی رشتہ نہیں اس سے آپ کا۔ مت جتائیں محبتیں۔"

"ثمن!" زمان اسے حیران و ششدر دیکھے گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"صحیح کہہ رہی ہوں۔ میں اس شخص سے کوئی رشتہ نہیں رکھ سکتی، جسے صرف اپنے دل کا خیال ہو۔ دوسروں کی خواہش اس کی نظر میں مٹی کے کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ خودغرض، اپنی ذات کے پجاری۔" ثمینہ اسے گھورتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اور زمان تو بس ہلتے پردے کو دیکھتا رہ گیا۔

یہ کون سا روپ تھا؟

یہ روپ تو اس نے اپنی ثمن، اپنی دوست کا پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ اس سے ناراض ضرور ہوتی تھی، لڑتی جھگڑتی تھی مگر اتنے سخت الفاظ میں کبھی اس کی تضحیک نہ کی تھی۔ زمان کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی۔ پھر وہ وہاں رکا نہیں، ثمینہ کے گھر سے نکلتا چلا گیا کہ یہ اس کا حکم تھا۔ اور ڈرائنگ روم میں کھڑکی کے پٹ سے سر ٹیکے ثمینہ اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ کتنے ہی آنسو اس کے گالوں پر اُتر آئے۔

اور وہ دل ہی دل میں اس انجانی لڑکی سونیا سے مخاطب ہوئی۔

"تم نے توڑ ڈالا ہے میرے چاچو کو سونیا! تم جس روپ میں بھی ہو، ایک بار اسے مل جاؤ تاکہ وہ اپنی زندگی کو کوئی موڑ تو دے دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم یقیناً کوئی ایسی

لڑکی ہو گی، جس نے میرے چاچو کو اپنے خیالوں کے جال میں اس طرح جکڑا ہے کہ وہ چاہے بھی تو اس جال کی ڈور کاٹ کر باہر نہیں نکل سکتا۔ لگتا ہے، وہ اس جال سے رہا ہی نہیں ہونا چاہتا۔ وہ تم سے ایک بار...... صرف ایک بار ملنا چاہتا ہے۔ اسے یہ یقین ہے کہ تم نے اب تک شادی نہ کی ہو گی اور اسی کی راہ دیکھ رہی ہو گی۔ پھر وہ تمہیں اپنا کر اپنی یہ آرزو پوری کر سکے گا۔ مگر اس روشن پہلو کے ساتھ وہ اس تاریک پہلو پر بھی نظر رکھتا ہے کہ اگر کسی اور سے بھی وابستہ ہو گئی ہو گی تو وہ تم سے اپنی وفا کی داد لینے کے بعد کسی بھی لڑکی سے اپنا گھر بسا لے گا۔ مگر کب؟ ...... تم کب ملو گی سونیا! اُسے؟ کہیں انتظار طول نہ دے جائے۔ انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں نہ پتھرانے لگیں۔ جلد آن ملو۔ اس سے اپنے انتظار کی اس کیفیت سے نکالو، جو پھانس کی طرح اس کے سینے میں گڑی ہوئی ہے، جسے نہ وہ نکال سکتا ہے اور نہ ہی اس کی چبھن اسے چین لینے دیتی ہے۔

⊛......⊛......⊛

دو ہفتے گزر چکے تھے۔ زمان احمد، ثمینہ کے ہاں نہ آیا تھا، نہ ہی فون کیا تھا۔

صفدر نے کئی بار کہا کہ "چاچو! کیوں نہیں آتے آپ؟

"بس، مصروفیت ہے ذرا۔" وہ یہی کہہ کر ٹال جاتا۔

"کیا کوئی بات بری لگی میرے گھر والوں کی؟" آخر ایک روز صفدر نے پوچھا۔

"نہیں دوست! وہ تو سب بہت اچھے ہیں۔"

"پھر آپ آتے کیوں نہیں؟ ثمینہ سے پوچھوں تو وہ بھی ٹال جاتی ہے۔ کیا آپ دونوں کی لڑائی ہوئی ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟" صفدر چونک گیا۔ "آپ...... آپ دونوں بھی لڑ سکتے ہیں؟ ناممکن زمان چاچا!"

"مگر اب یہ ممکن ہو گیا ہے۔" زمان نے کہا۔

"لڑائی کی وجہ؟"

"وہ کہتی ہے کہ میں شادی کر لوں۔" زمان نے اسے سچ سچ بتا دیا۔

"ویسے چاچو! حق بات تو یہ ہے کہ کہتی تو وہ ٹھیک ہے۔" صفدر نے ہنس کر کہا۔

"ہاں بھئی، تم بیوی کی طرف داری نہ کرو گے تو کون کرے گا؟"

"چاچو! یہ حقیقت ہے کہ آپ سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ بھلا پبلک پوائنٹ

اور ٹرینوں کے عشق بھی توڑ چڑھے ہیں۔" صفدر نے کہا۔ ثمینہ اسے شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی بتا چکی تھی کہ زمان شادی کیوں نہیں کرتا۔

"صفدر! میں خود بھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں واقعی بے وقوف ہوں۔ مگر کیا کروں کہ اس کے بعد کوئی لڑکی نظروں میں جچتی ہی نہیں۔ دل اسی کے لئے مچلتا ہے۔"

"یہ درست ہے کہ وہ واقعی اس قابل ہوگی کہ جو آپ اتنا چاہ رہے ہیں اسے۔ مگر اس کی تھوڑی سی شبیہ کسی میں نظر آئے تو آپ اسے اپنا لیں۔ مکمل تو دل کی تمنا کسی کو نہیں مل سکتی۔"

"تمہیں بھی دل کی پوری پسند نہیں ملی۔" زمان نے اسے ٹٹولا۔

"مجھ جیسا خوش قسمت ہر کوئی تو نہیں ہو سکتا۔" صفدر نے شوخی سے کہا تو زمان بھی ہنس دیا۔

"پھر آپ آج آجائیں گے نا؟"

"تمہاری بیگم نے کہہ دیا ہے کہ نہ آؤں۔"

"بھئی، یہ آپ چاچا بھتیجی کا معاملہ ہے........ میں کچھ نہیں کہوں گا۔" صفدر صاف پہلو بچا گیا۔

پھر اس نے زمان سے نہیں کہا کہ وہ گھر کیوں نہیں آتا۔ ثمینہ سے بھی اس نے پوچھا تھا تو اس نے بھی وہی کچھ بتایا، جو زمان اسے بتا چکا تھا۔

"خود ہی اکڑ ختم ہو جائے گی، میں نہیں بولوں گی تو۔" ثمینہ نے نہایت مان سے کہا تو صفدر ہنس دیا۔

"وہ زمان بھائی ہیں، میں نہیں ہوں۔ جسے تم نظر بھر کر بھی دیکھ لیتی ہو تو دل میں ڈوبنے لگتا ہے۔" صفدر کی آنکھوں میں دیوالی رُت آن بسی تھی۔

"زمان بھائی! مجھے شدت سے چاہتے ہیں۔ اتنا چاہتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ مجھے کسی نے اتنا نہیں چاہا۔"

"میں نے بھی نہیں۔" صفدر نے شکوہ کیا۔

"آپ کی بات اور ہے صفدر! آپ کے جذبوں میں شدتیں ہیں۔ پھر میاں بیوی کا رشتہ تو نہایت خوب صورت احساسات کی ڈور سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اور محبتیں آپ ہی آپ دل میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر زمان بھائی کی محبت بہت نرم ہے۔ بہت نرماہٹیں ہیں ان کی محبت میں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی ہار جائیں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" صفدر نے صدقِ دل سے دعا کی۔

اور واقعی اس کا مان بے جا نہیں تھا۔ اس روز وہ گلاب کی کیاریاں مالی سے ٹھیک کروا رہی تھی کہ پورچ میں اسکوٹر آ کر رکا۔ ثمینہ نے فوراً رخ موڑ لیا۔ آنے والا زمان احمد تھا۔ اسے اتنے دنوں بعد دیکھ کر ثمینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ زمان احمد نے ثمینہ کو دیکھ لیا تھا اور وہیں آ گیا۔ وہ رخ موڑے کھڑی رہی۔

"ثمن!" زمان نے ہولے سے پکارا۔

"اب تک ناراض ہو؟........ میں........ میں ہار کر آیا ہوں یہاں۔" زمان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"زمان بھائی!" ثمینہ نے اس کا نام لیا۔

"تم نے اس روز کہا تھا نا کہ میں تمہیں کوئی مخصوص وقت بتاؤں کہ کب تک انتظار کروں گا۔"

"ہاں۔" ثمینہ نے سر اٹھا کر زمان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر زردی تھی اور آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔

"تو ثمینہ! مجھے ایک سال کی اور مہلت دے دو۔ اگر وہ مجھے اس دوران مل گئی تو ٹھیک ہے، ورنہ آئندہ سال اسی تاریخ کو تمہیں اختیار ہوگا کہ جسے چاہو، اپنی بھابی بنا لو۔" آواز زمان کے حلق میں پھنس رہی تھی۔

"سچ کہہ رہے ہیں نا؟"

"تم سے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ یہ وعدہ ہے میرا تم سے۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔" زمان نے کہا تو ثمینہ کا مان بڑھ گیا اور اس نے کتنے ہی آنسو بہا ڈالے۔

"اب تو خوش ہو نا؟"

"میں ایک سال مزید آپ کا انتظار کروں گی۔ اور یوں بھی ابھی تو عفت کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اگر آپ اس کا نصیب ہیں تو کوئی بھی آپ کو اس سے نہیں چھین سکتا۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے گیلی گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تم بہت بری ہو۔ مجھے منانے بھی نہیں آئیں۔" زمان نے شکوہ کیا۔

"اگر میں آجاتی تو آپ یہ فیصلہ نہ کرتے، جس نے میرے دل میں پھول کھلا دیئے ہیں۔"

"مگر میرے دل میں خون کی ندیاں رواں ہوگئی ہیں۔" وہ آہ بھر کر بولا۔

"بس، بس....... کہنے کی باتیں ہیں۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"یقین کرو ثمن! اتنی لڑکیاں زندگی میں آئیں اور سب وقت کے دھندلکے میں گم ہو گئیں۔ مگر سونیا صرف ایک جھلک دکھا کر دل میں گھر کر گئی۔ کبھی کبھی مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے۔"

"کہتے ہیں کہ محبت کرنے کے لئے باقاعدہ پلاننگ نہیں کرنی پڑتی۔" ثمینہ نے کہا۔

"محبتیں تو بہت کی جاتی ہیں، مگر عشق ایک ہی سے کیا جاتا ہے۔ اور میری محبت عشق کی حدوں کو چھو چکی ہے۔"

"عشق اور محبت میں فرق آپ ہی کو پتہ ہوگا۔ اندر چلیں نا۔"

"میراں کہاں ہے؟" زمان نے پوچھا۔

"سوئی ہوئی ہے۔"

"میں تمہاری وجہ سے نہیں، میراں کے لئے آیا ہوں۔"

"آپ جھوٹ تو نہ بولیں۔" ثمینہ نے ہنس کر کہا تو زمان اس کے یقین پر مسکرا دیا۔

"بہت دُبلے لگ رہے ہیں۔" ثمینہ نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔

"اتنے دن لڑتا جو رہا ہوں خود سے، تو......." زمان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کیونکہ کرنل جاوید سامنے سے آ رہے تھے۔

"السلام علیکم!" زمان احمد نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ بھئی کہاں غائب تھے زمان میاں؟" انہوں نے زمان کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"بس، معروف اس قدر رہا کہ آ ہی نہیں سکا۔" اس نے کن انکھیوں سے ثمینہ کو دیکھا، جو مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ ثمینہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا۔ سوئی ہوئی میراں کو اس نے اٹھا کر سینے سے لگا کر اس قدر زور سے بھینچا کہ وہ بلبلا اُٹھی۔

"پلیز چاچو! آہستہ۔ میری بچی کا دم نہ نکال دینا۔" ثمینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ جلدی سے کھانا لے آؤ میرے لئے۔"

"آتے ہی کیوں نہ بتایا؟ میں ابھی لائی۔" ثمینہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

⊛......⊛......⊛

وہ گلابی جاڑوں کی سرد شام تھی، جب زمان احمد نے آتش دان کے قریب بیٹھ کر

چلغوزے چھیلتے ہوئے کہا۔

"ثمن! میرا اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

"کیا......؟" ثمینہ کا دل رُکنے لگا۔

"تمہیں صفدر نے نہیں بتایا؟"

"میں نے نہیں بتایا۔" ثمینہ کے کہنے سے پہلے ہی صفدر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

ثمینہ نے دیکھا، اسلام آباد کے نام پر ایک عجیب سی چمک زمان احمد کی آنکھوں میں آ گئی تھی۔ چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایسا اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس شہر کے نام پر زمان احمد کی آنکھوں میں مشعلیں جل اُٹھتی تھیں۔ اُسے گرے سوٹ میں ملبوس سونیا یاد آ جاتی۔ اُس کا دامنِ کوہ اور راول ڈیم تک پیچھا کرنے کا ایک ایک لمحہ یاد آ جاتا۔

"آپ رُکوا لیں ٹرانسفر۔" ثمینہ نے مچلتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی خدا خدا کر کے تو موقع آیا ہے اس سے ملنے کا اور تم کہہ رہی ہو کہ ٹرانسفر رکوا لیں۔" صفدر نے ہنس کر کہا تو زمان بھی مسکرا دیا۔

"آپ کو یقین ہے کہ وہاں سونیا ملے گی؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"پہلے جو اتنی مرتبہ گئے ہیں، ملی؟" ثمینہ نے اسے یاد دلایا۔

"وہ تو ایک دو روز کے لئے جاتا تھا، میں اب مستقل رہوں گا تو کہیں نہ کہیں ضرور ٹکرائے گی مجھ سے۔" زمان کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"یقیناً۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"میرا دل کہہ رہا ہے۔ اور ثمن ڈیئر! دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔" زمان بہت خوش تھا۔ اور پہلے جو ثمینہ دعا کرتی تھی کہ سونیا ایک بار زمان کو مل جائے۔ آج پہلی بار وہ دُعا گو تھی کہ خدا کرے۔ سونیا اسے نہ ملے۔ وہ ہر صورت میں چاہتی تھی کہ زمان، عفت کو اپنا لے، جو زمان کو دیکھ کر کھل اُٹھتی تھی۔ جو اس کے دکھ اپنانے کی خواہش مند تھی۔ جس نے زمان کو سپنوں کی صورت آنکھوں میں بسایا ہوا تھا۔ لیکن ثمینہ کی دعائیں تو ہمیشہ کی طرح شرفِ باریاب نہ ہو سکی تھیں۔ وہ تو راستے میں سے لوٹ آئی تھیں۔

زمان احمد کو اسلام آباد آئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ وہ آفس ٹائم کے بعد دیوانوں کی طرح سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا شکر پڑیاں، یاسمین گارڈن، دامنِ کوہ اور راول ڈیم وہ بار بار

جا چکا تھا۔ ہر چہرے میں وہ اسی ایک مکھڑے کو تلاش کرتا، جو اس کے دل میں انی کی طرح کھب چکا تھا۔ وہ آنکھیں، جو اس کے دل کے طاق پر مثلِ دیا روشن تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ جو میعاد اس نے ثمینہ کو دی ہے، اس سے پہلے ہی سونیا اسے مل جائے۔ تاکہ وہ اسے بتا سکے کہ دعوے کس طرح نباہے جاتے ہیں۔ خالق اس کی دیوانگی پر کڑھتا تو اس کی بیوی ناہید کو بھی زمان کی ان حرکتوں پر دکھ سا ہوتا۔ اسے خالق نے بتایا تھا کہ اس کے دوست نے کون سا روگ پالا ہوا ہے۔ وہ جو دل لگی کرتا تھا، اب یہی دل لگی اس کا روگ بن گئی تھی۔

ایسا عشق نہ دیکھا۔ افسانوں، کہانیوں میں تو پڑھا ہے۔ بھلا کوئی تک ہے کہ زندگی تباہ کر لی جائے۔ بارہا وہ زمان سے کہہ چکی تھی یہ جملہ۔

تب وہ ہنس دیتا اور کہتا۔

"بھابی! تمہیں کیا پتہ کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ جو اس آگ میں جلتا ہے، وہی اس کا لطف جانتا ہے۔ اور روز جینے مرنے کا کھیل کھیلنا پڑتا ہے۔ اس میں صرف روح کی تسکین کے لئے محبت دل سے ہوتی ہے اور عشق روح میں زہر کے مانند سرایت کر جاتا ہے اور زہر جیسا بھی ہو، مار ڈالتا ہے۔"

تب ناہید سوچتی، یہ زمان مردوں کی کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ قدرت نے اس کا خمیر کون سی مٹی سے اٹھایا ہے؟ ورنہ مرد کو تو بھونرا، ہرجائی، جفاکار اور نجانے کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ یہ کیسا مرد ہے کہ نہ وعدے ہوئے نہ عہد لئے گئے۔ پھر بھی وفا نبھائی جا رہی ہے۔

زمان احمد آفس سے آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ہیلو!" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"پلیز زمان بھائی! جلدی سے آئیں۔" ناہید کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"خیریت تو ہے نا؟"

"گوگی سیڑھیوں سے گر پڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے، اس کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ خالق کو فون کر چکی ہوں، مگر نمبر انگیج جا رہا ہے۔" وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"میں ابھی آ رہا ہوں۔" زمان نے ناہید کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور میز سے موٹر کی چابی اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکلا تو فضلو نے کہا۔

"صاحب! کھانا لگا دیا ہے۔"

"میں نہیں کھاؤں گا۔ خالق کے ہاں جا رہا ہوں۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔" وہ کہتا ہوا جلدی جلدی برآمدے کی سیڑھیاں عبور کر گیا۔

فل اسپیڈ سے وہ گاڑی بھگاتا ہوا خالق کے ہاں پہنچا۔ ملازم کی مدد سے اس نے گوگی کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا۔ ناہید بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"پلیز بھابی! حوصلہ کریں........ بچوں کو تو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔" زمان نے اسے دلاسہ دیا۔

ڈاکٹر شنواری جو چائلڈ اسپیشلسٹ تھے، انہوں نے فوراً گوگی کو ٹریٹ منٹ دی اور اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا۔ چند لمحوں بعد ہی گوگی بیڈ پر لیٹا مسکرا رہا تھا مگر ناہید کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"دیکھیں بھابی! بچہ ہنس رہا ہے اور آپ اب تک رو رہی ہیں۔" زمان نے گوگی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو ناہید بولی۔

"شکر ہے تم فوراً آ گئے۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔"

"کچھ نہ ہوتا۔ آپ ذرا حوصلے سے کام لیتیں تو خود بھی اسے لا سکتی تھیں، ہاسپٹل۔ مگر آپ تو حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھیں، ہمارے ہاں کی ننانوے فیصد ماؤں کی طرح!"

"تمہیں کیا پتہ کہ ماں کا دل کیسا ہوتا ہے۔ اولاد کیا ہوتی ہے؟ جن کا گلشن ان پھولوں سے مہکتا ہے، خوشبو تو وہی جانتے ہیں نا۔" ناہید نے گوگی کی پیشانی چوم لی۔

"میں خالق کو فون کر دوں۔" زمان نے کہا۔

"ہاں۔ مگر انہیں بتا دینا کہ اب گوگی ٹھیک ہے۔ ورنہ پریشان ہوں گے۔"

"وہ مرد بچہ ہے، بھابی! انہیں ہوگا پریشان۔" زمان ہنستا ہوا باہر آ گیا۔

مگر وہ کوریڈور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ آج عرصے بعد اس کا دل وجود کی عمارت میں بری طرح دھڑ دھڑانے لگا، جیسے کہ ابھی باہر آ جائے گا۔ وہ تقریباً سات آٹھ گز کے فاصلے پر تھی، پھر بھی زمان نے اسے پہچان لیا۔

ہاں، وہ بلاشبہ وہی تھی، جس کی اسے تلاش تھی۔

وہ سونیا تھی، جسے وہ ہر خوب صورت چہرے میں کھوجتا پھرتا تھا۔

آج بھی وہ ویسی کی ویسی تھی۔ ان ساڑھے چار برسوں نے اس پر کوئی اثر نہ چھوڑا

تھا۔ وہی نازک سراپا، ناگن کی طرح لہرا کر چلنے کا انداز، ہائی ہیل کی ٹھک ٹھک زمان کے دل پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب آئی تو گم صم کھڑے زمان احمد کے وجود میں زندگی دوڑ گئی اور دل کی دنیا پر ڈولتا نام لبوں پر آ گیا۔

"سونیا۔"

وہ ٹھٹک گئی۔

زمان احمد کو سونیا کی ذہانت اور بصارت پر فخر تھا۔

"بہت جلد پہچان لیا۔" اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"تمہیں بھولا ہی کب ہوں۔" زمان نے ہولے سے کہا۔

"بے وقوف بنانے میں تو مرد ماہر ہے۔"

"تم......تم میری بات تو سنو۔"

"سنا تھا، جس مرد کی آنکھ میں تل ہو، وہ بے وفا ہوتا ہے۔ آج پتہ چلا کہ واقعی یہ درست ہے۔ کاش، پہلے آپ کی آنکھ کا تل دیکھ لیتی۔" سونیا نے کہا اور پھر رکی نہیں، تیزی سے ڈاکٹر شنواری کے کمرے میں گھس گئی۔

کتنی بڑی بات کہی تھی اس نے۔ کیسا زخم دیا تھا اس نے۔ زمان کو پتہ تھا کہ اس کی آنکھ کی بھوری پتلی کے ساتھ ایک چھوٹا سا سیاہ تل بھی ہے۔ اسے زندگی کی شاہراہ پر ایک لڑکی بینا بھی ملی تھی جس سے اس کی دوستی حسین آگاہی میں شاپنگ کرتے ہوئے ہوئی تھی۔ اسے زمان کی آنکھیں اور دائیں آنکھ میں تل بہت پسند تھا۔ اور زمان کو اپنی آنکھوں پر بہت ناز تھا۔

لیکن اس کے دل میں بسنے والی سونیا کس بے دردی سے اس کی آنکھوں کو ہی بے وفائی کی علامت قرار دے کر جا چکی تھی۔ اس کا جی چاہا، چیخ چیخ کر کہے۔

"سونیا! میں بے وفا نہیں ہوں۔ تم نے فردِ جرم سنا دی ہے اور مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔"

وہ ایک دم پلٹا اور ڈاکٹر شنواری کے کمرے میں آ گیا۔

"آئیے زمان صاحب!" وہ خوش دلی سے بولے۔ سونیا اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔

"میں جا رہی ہوں۔ آپ ایک گھنٹے میں گھر پہنچ رہے ہیں نا؟"

"ان شاء اللہ!" ڈاکٹر شنواری بولے۔ "بیٹا! ایک گھنٹہ سے اوپر ایک منٹ بھی نہیں

لگے گا۔ وعدے کا پابند ہوں۔ آخر مرد ہوں نا۔"

"ہر مرد وعدے کا پابند نہیں ہوتا انکل!" سونیا نے ایک نظر زمان کو دیکھا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

"مجھے ایک فون کرنا تھا۔" زمان، ڈاکٹر شنواری سے مخاطب ہوا۔

"ضرور......ضرور بھئی!" انہوں نے فون اٹھا کر اس کی طرف رکھ دیا۔ دوسری طرف سے پتہ چلا کہ خالق گھر جا چکا تھا۔

وہ ڈاکٹر شنواری کو تھینکس کہہ کر گوگی کے وارڈ کی طرف آ گیا۔ خالق کو دیکھ کر اسے خاصی حیرت ہوئی۔

"تم کب آئے؟" زمان نے پوچھا۔

"ابھی ابھی آیا ہوں۔ نصیبن بوا نے مجھے فون کر کے کہہ دیا تھا، میں فوراً آ گیا۔ تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے......" خالق کہہ رہا تھا مگر زمان اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"دیکھو دوست! شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ مت کرو۔ جو میں نے کیا ہے، یہ میرا فرض تھا۔"

"چلو نہیں ادا کرتے شکریہ۔" خالق ہنسا۔ "بہت تھکے تھکے سے لگ رہے ہو۔ تم گھر جاؤ، میں اب موجود ہوں۔"

"میں پھر شام کو آؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

"ضرورت کسی چیز کی نہیں۔" ناہید نے جلدی سے کہا تو زمان، گوگی کو پیار کر کے باہر آ گیا۔

گھر آتے ہی اس نے ڈائریکٹری سے ڈاکٹر شنواری کے گھر کا فون نمبر تلاش کیا۔

"کیا وہ یہیں رہتی ہے یا......؟" جب وہ نمبر ڈائل کر رہا تھا تو اس کے ذہن میں یہ خیال سانپ کی طرح سرسرایا۔

"کوئی حرج نہیں ٹرائی کرنے میں۔" زمان کے مچلتے دل نے کہا۔

تیسری گھنٹی پر کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو......!"

زمان کے اردگرد نرم نرم پھوار برسنے لگی۔ وہ پہچان گیا تھا اسے۔ دوسری جانب وہی تھی۔

"ہیلو، بھئی کس سے بات کرنی ہے؟" وہ بولی۔

"تمہی سے۔"

"اوہ!" وہ ہنسی۔ وہی نقرئی گھنٹیوں جیسی ہنسی۔ "مجھے پتہ تھا، تم فون ضرور کرو گے۔ بتاؤ، کیا بات کرنی ہے؟"

"جب یہ پتہ تھا کہ میں فون کروں گا تو یہ بھی پتہ ہوگا کہ کیا بات کروں گا۔ لگتا ہے تمہیں تو الہام ہوتے ہیں۔"

"الہام ہوتے ہیں، مگر اتنے تو نہیں ہوتے نا؟" سونیا نے کہا۔ وہ دونوں اس قدر بے تکلفی سے بات کر رہے تھے، جیسے کہ روز ملتے رہے ہوں۔ اور یہ غلط نہیں تھا۔ دونوں خیالوں میں ایک دوسرے سے روز باتیں کرتے تھے اور وہی خیالوں والی بے تکلفی انہوں نے حقیقت میں بھی اپنا لی تھی۔

"سونیا! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیا تم نہیں جانتیں؟" اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

"مگر میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔"

زمان احمد کو لگا، جیسے کوئی تیر سنسناتا ہوا آیا ہو اور اس کے دل میں کُھب گیا ہو۔

"وجہ......؟" زمان کے لب تھرّائے۔

"یہ تم خود سے پوچھو!" سونیا نہایت سفاکی سے بولی۔

"خود سے پوچھوں گا تو دل مچل کر یہی کہے گا کہ تم سے ملنا چاہتا ہے، ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہتا ہے۔"

"مگر میرا دل ایک دھوکے باز، فریبی شخص سے کوئی سلسلہ نہیں رکھنا چاہتا۔" اس کی آواز میں زہر تھا۔

"میں دھوکے باز، فریبی نہیں ہوں سونیا!" زمان نے کہنا چاہا۔

"مجرم کب اپنے جرم کی حامی بھرتا ہے؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں ہمیشہ تم سے ملنے کے لئے بے قرار رہا ہوں۔"

"لفظوں کے سحر میں مجھے نہیں گرفتار کیا جا سکتا۔"

"تم یقین کرو سونیا! میں تمہیں تلاشتا پھرا ہوں۔ آج تمہارا پتہ چلا ہے تو دیکھو، میں نے آج ہی تم سے رابطہ قائم کر لیا۔" زمان نے جلدی جلدی اسے بتایا۔ اسے علم تھا کہ سونیا اس سے بہت خفا ہے اور منانے میں بھی وقت صرف ہوگا۔ اس نے سنا، وہ کہہ رہی

تھی۔

"جھوٹ مت بولو، زمان! میں نے خود تمہیں اپنا ایڈریس دیا تھا۔ پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہارے پاس میرا پتہ نہ تھا؟"

زمان نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ناگن جیسی پھنکار تھی۔

"وہ کاغذ پتہ نہیں کہاں گر گیا تھا۔" زمان نے اسے تمام تر تفصیل بتا دی۔

"زمان......!" سب کچھ سننے کے بعد سونیا کی آواز میں طنز کی جگہ دکھ نے لے لی۔ وہ اسے اب تک بے وفا اور اپنی محبت کا مجرم سمجھتی آئی تھی، وہ تو ایسا نہ تھا۔ تبھی تو اس کی آواز میں دکھوں کے گھنگھرو بول رہے تھے۔

"سونیا! میں مجرم نہیں ہوں۔" زمان نے کہا۔

"ہاں زمان! ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں تمہیں مجرم سمجھ رہی تھی۔ پتہ نہیں زمان! ہم لڑکیوں میں یہ کیا بری عادت ہوتی ہے کہ جو ایک بار نظروں کو اچھا لگ جائے، آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائے، پھر وہ دل کے معبد خانے میں اس طرح ایستادہ ہو جاتا ہے کہ لاکھ چاہو اسے نکالنا، پھر بھی نہیں نکلتا۔"

"تو کیا تم نے مجھے بھی دل سے نکالنا چاہا؟" زمان نے پوچھا۔

"جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں نے ایسا ضرور چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ پتہ ہے زمان! میں نے تمہارے خط اور فون کا بہت انتظار کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جیسے ہی تایا جی کے ہاں پہنچوں گی، تم سے فون پر بات ہوگی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ میں انتظار کرتی رہی، بالکل ایسے جس طرح ایک قیدی کو اپنی رہائی کا انتظار ہوتا ہے۔ مگر میرا انتظار، انتظار ہی رہا۔ اور ان دو ماہ میں تم میرے اتنے قریب آ گئے خیالوں کی وادی میں سفر کرتے ہوئے کہ تم سے دوری سوہانِ روح تھی۔" سونیا ٹوٹے لہجے میں بتا رہی تھی۔ اور اس کے لہجے کا کانچ زمان کے دل میں چبھ رہا تھا۔

"فون کی ہر گھنٹی پر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ جاتا۔ پوسٹ بکس میں سے ملازم ڈاک نکال کر لاتا تو دھکڑ پکڑ میرے دل میں شروع ہو جاتی۔ بس زمان! میں الفاظ میں اپنی کیفیات بیان نہیں کر سکتی۔"

زمان تو اس اعتراف پر یوں محسوس کر رہا تھا، جیسے کہ اس کے اردگرد پھول کھل اٹھے ہیں۔

"سونیا! میں تمہیں اپنی کیفیت نہیں بتا سکتا۔ آج جو مجھے خوشی ملی ہے، اس کا احاطہ

نہیں کر سکتا۔ اب تم اپنے دل کی کیاریوں میں سے اُداسیوں کے سائے اکھاڑ پھینکو۔

"کیوں؟" سونیا حیران تھی۔

"ملو تو پھر بتاؤں گا۔" زمان شوخ ہو گیا۔ "ملو گی نا کبھی؟ نہ بچھڑنے کے لئے؟"

"نہیں زمان! بہت عرصہ پہلے یہ خواہش تھی، تم سے ملنے کی۔ مگر اب نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا مطلب؟" زمان احمد کی آواز میں حیرانگی سمٹ آئی۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم یہ خیال، یہ تمنا دل سے نکال پھینکو۔ میں کہیں نظر بھی آؤں تو کترا کر گزر جانا کہ........"

"کیوں؟" زمان اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے، زمان!" وہ بولی۔

"تم تو بہت بہادر تھیں۔" زمان نے یاد دلایا۔

"تھی نا۔ اب نہیں ہوں۔ وہ سونیا تو کھو گئی، جس نے اسٹیشن پر سینکڑوں لوگوں کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے تمہارے ہاتھ میں کاغذ پکڑا دیا تھا۔ اب میں بہت بزدل ہوں۔"

"لیکن کیوں ہوا ایسا؟" زمان جاننا چاہتا تھا۔

"جب لڑکی بیوی بنتی ہے اور بیوی سے ماں بننے کا سفر طے کرتی ہے تو وہ اپنے لاابالی دور کو بہت پیچھے چھوڑ آتی ہے۔ بزدلیاں اس کے وجود میں گھنگھور گھٹاؤں کی طرح اُتر آتی ہیں اور........"

"سو......نیا........" زمان کے حلق سے آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

"ہاں زمان! اب میں میجر ایمل خان کی بیوی ہوں۔ اور دو ماہ کی ننھی سی زارا کی ماں۔ ایمل خان کی بیوی بنتے ہی بزدلی میری روح میں اُتر گئی۔ اب تو میں سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں اور اب ایک اور غضب ہو گیا ہے۔"

"کیا غضب؟" زمان طویل سانس لے کر بولا۔

"مجھے تمہارا نام بھی پتہ چل گیا ہے۔ حالانکہ پہلے مجھے تمہارے نام تک کا پتہ نہ تھا۔ تب تمہیں نت نئے ناموں سے مخاطب کر کے اپنے خیالوں کی دنیا سجاتی تھی، تم سے شکوے کرتی، رُوٹھتی۔ اور اب اگر کبھی بے خیالی میں ایمل خان کے سامنے تمہارا نام لبوں پر آ گیا تو پھر قیامت ہی آ جائے گی۔" وہ دُکھیا لہجے میں بول رہی تھی اور زمان کے دل

میں دراڑیں سی پڑ گئیں۔

"سونیا! مجھے لگ رہا ہے، میں جہاں سے چلا تھا، وہیں کھڑا ہوں اور تم بہت آگے نکل گئی ہو۔ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا، اس لئے تو نہیں کیا کہ تم اس طرح ملو کہ تمہارے نام کے ساتھ کسی اور نام کا اضافہ ہو چکا ہو۔ ایسا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میرے انتظار کا یہ صلہ؟"

"زمان!" سونیا کی آواز ایئرفون میں اُبھری۔ "انتظار ایک کیفیت ہے، ایک احساس ہے۔ مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، ایک میعاد ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی سی عمر ہے۔ اس عمر کی مالا میں انتظار کے موتی پروتے پروتے تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی نا؟ دیکھو، میں نے تو تمہارا انتظار نہیں کیا اور ایمل خان کا رشتہ آیا تو سر جھکا دیا کہ جسے میں نہیں پا سکی، اس کو پھر کیوں نہ پالیا جائے، جو مجھے چاہتا ہے۔" سونیا اسے سمجھا رہی تھی۔

"ثمینہ بھی یہی کہتی ہے۔" زمان آہ بھر کر بولا۔

"کون ثمینہ؟" سونیا نے پوچھا۔

"میری دوست، میری بھتیجی........ جس سے ملنے میں کراچی گیا تھا تو تم سے دوسری ملاقات ہوئی تھی۔" زمان نے کہا تو سونیا کے ذہن کے ایوانوں میں ٹرین کی چھک چھک ہونے لگی۔ وہ سر جھٹک کر بولی۔

"زمان! لڑکیوں کو پتہ ہوتا ہے، لڑکیوں کی مجبوری کا۔ وہ سچ کہتی ہے۔"

سونیا کے جملے پر وہ خاموش رہا۔ وہ کیا کہتا؟

وہ سوچا کرتا تھا، سونیا سے جب بھی ملاقات ہوئی، وہ یہ کہے گا، وہ کہے گا، اسے ڈھونڈنے کی داستان سنائے گا، ہجر کے قصے بیان کرے گا۔

مگر جب وہ ملی تو کسی اور کی ہو چکی تھی۔

اور ثمینہ کے کہنے کے باوجود وہ خود کو اس سچویشن کے لئے کبھی تیار نہ کر سکا تھا اور اب اس طرح وہ سونیا سے کچھ نہ کہہ پا رہا تھا، جیسے کہ سارے لفظ اس کے دکھ کی طرح گونگے ہو گئے ہوں۔

دونوں طرف خاموشی تھی اور لگتا تھا، اب دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا ہو۔ اور سونیا واقعی بہادر تھی۔ اس نے نہایت سچائیوں سے اعتراف کر لیا تھا، زمان کو چاہنے کا۔ اور کیوں نہ کرتی کہ یہ جرم وہ بالی عمریا میں کر چکی تھی۔ زخمِ وفا کھایا تھا اور اس زخم سے اب بھی ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔

"اچھا زمان! خدا حافظ۔" سونیا نے طویل خاموشی کو توڑا۔

"سونیا!" زمان نے دل کی عمیق گہرائیوں سے اسے پکارا۔

"کہو؟"

"اک بار ملو گی؟" زمان کے لہجے میں دل کی ساری بے چینیاں، شدتیں سمٹ آئیں۔

"نہیں زمان! یہ ناممکن ہے۔" سونیا گھبرا گئی۔

"کیوں؟" وہ چیخ پڑا تو وہ بولی۔

"کوئی دیکھ لے گا۔ تمہیں پتہ نہیں کہ شادی شدہ عورت کو کس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔"

"میں آواز دے رہا ہوں۔ دیکھو تو سہی میری طرف۔" زمان نے کہا۔

"میں پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی، زمان! میں پتھر ہو جاؤں گی۔ او کے زمان! زارا شاید اُٹھ گئی ہے۔ بس اب مجھے آواز مت دینا۔" سونیا نے اس کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

تب وہ کتنی ہی دیر تک ریسیور کو گھورتا رہا۔ لائن بے جان ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا، بازوؤں میں چہرہ چھپا کر بلک بلک کر روئے۔ بے تحاشا روئے۔

کیوں سونیا کے لئے روؤں؟......اب تک میری آنکھیں اسے دیکھنے کا انتظار کرتی رہیں، ترستی رہیں اور اب اسے کھو دینے پر آنسو بہائیں......نہیں، اب میں نہیں روؤں گا۔

اپنے ہارنے کا جشن مناؤں گا۔ اپنی پسند، اپنی محبت کو نہ پا سکنے پر چراغاں کروں گا اور خود سے وابستہ ہستیوں کی برسوں پرانی خواہش پوری کروں گا۔

ہاں ثمن!...... میں تمہاری عفت کو اپناؤں گا۔ بقول تمہارے وہ مجھے بے تحاشا چاہتی ہے اور مرد کو اس لڑکی سے ضرور شادی کر لینی چاہئے جو کہ اسے چاہے۔ ایسی لڑکیاں بہت اچھی بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔

پھر زمان نے لمحہ بھر کی تاخیر کئے بغیر لرزتی انگلیوں سے نمبر ڈائل کئے، تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ دوسری طرف عفت بول رہی تھی۔ زمان نے اس کی آواز پہچان لی۔

"عفت! میں زمان بول رہا ہوں۔" زمان نے کہا۔

"جی، جی......فرمائیے۔ کیا بھائی کو بلاؤں؟" عفت ایک دم گھبرا سی گئی۔

"اس سے کہہ دینا کہ وہ جو چاہتی ہے، وہی ہوگا۔ میں اس کی پیاری نند عفت سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور بہت جلد آؤں گا۔" زمان نے اُبھرتی ڈوبتی سانسوں کے درمیان کہا اور پھر ریسیور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسے لگا، جیسے کہ پل صراط کا سفر طے کیا ہو۔ اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹیک دیا تو کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔

⊛......⊛......⊛

تُو پاس نہیں اور پاس بھی ہے

گلابی شاموں کا اپنا ہی حُسن ہوتا ہے۔ ماحول کی خنکی خود بخود ہی چاروں طرف خوشبو کی طرح بکھر جاتی ہے۔ اور پھر خوانخواہ ہی اُداس ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اور اُداسی میں تو دل چاہتا ہے۔

چپ چاپ پڑے سوچتے رہو۔

کچھ سوچتے رہو...... کیا......؟ تو اس کی خود کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ خاموش رہنا، خوابوں کی دنیا میں بسنا اچھا لگتا ہے۔ مگر اُسے تو سرد شاموں اور گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں بھی چین نہ آتا تھا۔ عجیب بے چین سی روح تھی اور ہمیشہ توقع کے خلاف کام کرتی۔ دوسروں کو حیران کر دینے کی اُس میں زبردست صلاحیت موجود تھی۔ لگتا تھا، اُسے کسی کی پروانہیں۔ وہ خود سے بھی بے پروا اور بے نیاز تھی۔

"تہمینہ بلوچ.......!" سیاہ مخملی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ اپنی بے تحاشا خوب صورت آنکھوں سے تہمینہ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میرے ساتھ بیراج تک چل رہی ہو ناں؟" لہجہ اس کا شام کی طرح سرد، مگر تحکمانہ تھا۔ اور جب اسے کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ اسے "تمی" کے بجائے پورے نام سے پکارتی تھی۔

"یار! شام اُترنے والی ہے۔" تہمینہ نے توجیہ پیش کی تھی۔

"اور میں شام کا حُسن دیکھنے ہی بیراج تک جا رہی ہوں۔"

"تم چھت پر چلی جاؤ ناں۔" تمی نے مشورہ دیا۔

"اس گھر کی چھت کی دیواریں بھی بہت اونچی اونچی ہیں۔ میرا دم گھٹتا ہے یہاں۔" اس نے اپنے گلابی ہونٹ کچلے۔

"تارو، پلیز! مجھے مجبور نہ کرو۔ پھر ماما جانی سے مجھے خوف آتا ہے۔"

"تم ان سے کہہ سکتی ہو کہ تم چھٹیاں گزارنے آئی ہو، قید ہونے نہیں۔ قید ہونے کے لئے تو ملتان میں بھی بہت بڑا قفس تھا۔"

"معلوم نہیں کیوں، تم روایات سے انحراف کرتی ہو؟"

"رسمیں اور یہ روایات جو ہیں ناں تمہاری، یہ انسان کو مارنے کے مترادف ہیں۔ یہ سلو پوائزن جیسی روایات، جو نہ جینے دیتی ہیں اور نہ مرنے دیتی ہیں، گھٹن ہے....... بہت گھٹن ہے۔"

"اصل میں تم شروع ہی سے بورڈنگ ہاؤس اور ہاسٹلز میں رہی ہو ناں، تنہا رہنے کی عادی ہو۔ یہاں رہو گی تو عادت ہو جائے گی۔"

"ناممکن۔" اس نے تیزی سے سر کو منفی جنبش دی۔

"جبراً کوئی نہیں رہ سکتا۔ مجھے تو یہ گورچانی ہاؤس کی عورتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ اتنی اونچی دیواروں کی قید میں کس طرح رہتی ہیں؟ مجھے اگر پڑھائی کا سہارا نہ ہو تو میں مر جاتی۔ اور دیکھنا تم تہمینہ بلوچ! اگر میں یہاں رہی تو مر جاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو؟" تہمینہ نے جلدی سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ارے، تم گھبرا گئیں؟" وہ ہنس دی۔ تہمینہ کو لگا، جیسے چاندی کی بے شمار گھنٹیاں کمرے میں بج اٹھی ہوں۔ "یار! ضروری تو نہیں کہ بندہ فزیکلی مرے۔ دل مر جائیں، دل کی اُمنگیں، آرزوئیں ختم ہو جائیں تو بھی انسان مر ہی جاتے ہیں۔ اور مجھے جب بھی قید کیا گیا، دلی طور پر مر جاؤں گی۔"

"تمہیں یہاں کوئی قید نہیں کرے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"اعجاز بلوچ تمہیں یہاں سے لے جائے گا اور......."

"پلیز تہمینہ! یہ ٹاپک بند کرو۔ میں جا رہی ہوں۔ اور سنو! اعجاز بلوچ بھی اس خاندان کی طرح روایات کا پابند ہے۔ اور اپنی ماں سے کہہ دینا کہ زبردستی کے بندھن کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں۔"

"پتہ نہیں، تم کون سے راستے پر چل رہی ہو، ستارہ علی احمد! خبر بھی ہے منزل کی؟ منزل کا تعین کئے بغیر چلنے والے سوائے تھکن کے، کچھ نہیں پاتے۔ اور مجھے بھی یقین ہے کہ ضد اور ہٹ دھری کی پٹی آنکھوں پہ باندھے تم چلی جا رہی ہو۔ جس روز ٹھوکر کھائی تو پتہ چل جائے گا۔ اور تمہیں پتہ نہیں کہ اعجاز بلوچ بھی دوسرے راستوں پر چل رہا ہے۔

تمہاری بے اعتنائی اُس کے بھی شیشۂ دل کو کرچی کرچی کر چکی ہے۔ اس کے باوجود خاندانی روایات کا پابند ہے۔ بزرگوں کے کیئے گئے فیصلے سے وہ انحراف نہیں کر رہا۔ اُس میں جرأت نہیں کہ وہ انکار کر سکے۔ مگر مجھے پتہ ہے، تم میں سب کچھ کرنے کی جرأت بھی ہے اور بہت کچھ سہنے کا حوصلہ بھی۔ خدا کرے تم اندھی، بہری اور گونگی ہو جاؤ۔ نہ کچھ دیکھ سکو، نہ سن سکو اور نہ ہی بول سکو۔ کہ اس میں سب کی بہتری ہے۔''

تہمینہ بلوچ نے صدقِ دل سے اس کے اندھے، بہرے اور گونگے ہونے کی دعا کی۔ تبھی زارا آ گئی۔

''تیمی آپا! یہ ستارہ آپا کہاں گئی ہیں؟''

''کہہ رہی تھی، بیراج تک جا رہی ہوں۔'' تیمی نے بتایا۔

''آپ نہیں گئیں؟''

''میرا موڈ نہیں تھا۔'' تیمی نے کہا۔

''چلی جاتیں تو اچھا تھا۔'' زارا بولی۔

''کیوں؟'' تیمی نے ابرو چڑھائے۔

''بابا سائیں آئیں گے تو تارا آپا کو نہ پا کر سخت غصے ہوں گے۔''

''اگر میں چلی جاتی تو کیا ہوتا؟''

''ہونا کیا تھا، ذرا لحاظ کر جاتے۔ اب مما پر گرم ہوں گے۔ تارا آپا بھی مما کو ڈانٹ کھلوا کر خوش ہوتی ہیں۔''

''وہ موڈی لڑکی ہے، زارا!''

''اچھا موڈ ہے، جو دوسروں کا موڈ آف کر دے۔ سچ، جب تک تارا آپا نہیں ہوتیں، گھر میں سکھ ہوتا ہے اور جہاں یہ آ جاتی ہیں، ہمارا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ روز ہی کوئی نہ کوئی فساد ہوتا ہے۔''

''اور فساد کی جڑ تارا ہوتی ہے۔'' تیمی نے کہا۔

''جی!'' زارا افسردگی سے بولی۔ ''آپ خود سوچیں، تیمی آپا! ہم بہنیں ہیں ناں۔ ہمیں واقعی ان کے آنے کی خوشی ہوتی ہے۔ مگر ان کا انداز ایسا ہوتا ہے، جیسے ہم ان سے کمتر ہیں، حقیر ہیں۔ ٹھیک ہے، ہم نے اسکولز، کالجز میں تعلیم حاصل نہیں کی، مگر مما نے ہمیں اچھے برے کی تمیز سکھائی ہے۔ لیکن تارا آپ نے تو اتنا پڑھ لکھ کر کچھ بھی نہیں سیکھا۔ پتہ نہیں، اپنی کون سی دنیا میں مست رہتی ہیں۔ وہ اپنے ہی کوئی قوانین رائج کرنا

چاہتی ہیں، جو ممکن نہیں۔ آخر قناعت کیوں نہیں کرتیں؟ جو کچھ ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کیوں نہیں کرتیں؟'' زارا دل کا سارا غبار نکال رہی تھی۔

''میں سمجھاؤں گی اسے۔'' تہمینہ نے اسے دلاسا دیا۔ حالانکہ اسے پتہ تھا کہ جو بات وہ کہہ رہی ہے، وہ ممکن نہیں ہے۔ اُلٹا ستارہ اسے سمجھا دیتی۔

''وہ کسی کی نہیں مانتیں۔ پتہ نہیں، کس راجدھانی میں رہتی ہیں۔'' زارا کا لہجہ کڑوا تھا۔ ''تم دل برا نہ کرو۔'' تیمی نے پیار سے کہا۔

''اب پتہ نہیں کہاں گئی ہیں؟'' زارا پریشان تھی۔

''بتایا تو ہے، بیراج تک گئی ہے۔''

''آپ چلی جاتیں تو...... تو وہ طوفان نہ آتا، جو اب متوقع ہے۔'' زارا واقعی پریشان تھی۔

''ماما جانی کو کیسے پتہ چلے گا؟'' تیمی نے پوچھا۔

''گاڑی اور ڈرائیور جو نہیں ہے۔ اور بابا سائیں تو گھر میں گھستے ہی اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ کرے، بابا سائیں کے آنے سے پہلے آ جائیں۔ خدا ہی عزت رکھنے والا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو زارا! شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

''شادی ہو، تب ناں۔'' زارا منہ بنا کر بولی۔

''اعجاز بھائی کا فائنل ایئر ہے۔ صرف چار ماہ میں ایگزام ہیں۔''

''مگر ستارا آپا تو ایم۔اے کرنا چاہتی ہیں۔''

''اصل میں پڑھائی وڑھائی اس کا مسئلہ نہیں۔ وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتی ہے اور ہمارے ہاں آ کر اس کا ماحول بدل جائے گا۔ اعجاز بھائی کا ساتھ اسے بدل دے گا۔ تم دیکھنا تو سہی، کس قدر تبدیلیاں آتی ہیں اس میں۔'' تہمینہ نے زارا کے بال اس کے چہرے سے ہٹا کر کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''تیمی آپا! آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپا ہمیں پیاری نہیں ہیں۔ بخدا ہمیں بہت پیاری ہیں وہ۔'' زارا کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' تہمینہ نے کہا۔

''باوجود اس کے کہ ہم انہیں نہیں بھاتے، مگر وہ ہماری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہیں۔ ہم ان سے بات کرنے کو ترستے ہیں، بڑی بہن ہونے کے ناتے کبھی انہوں نے

پیار سے ہمیں گلے نہیں لگایا۔ ہم ان سے بہت سی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ پتہ ہے، زویا کہتی ہے کہ وہ آپا کے لانبے بالوں میں کنگھی کرنے۔ وہ یہ خواہش بھی پوری نہیں کر سکتی۔ ہے نا ظلم۔ اور پتہ نہیں، زیبو کو وہ کیسے پیار کر لیتی ہیں۔ مجھے تو یہ حیرت ہے۔"

"یار! وہ اندر سے بہت پیاری ہے۔ ریشم کی طرح نرم و ملائم۔ بس مزاج کی تیکھی ہے۔ اور وجہ اصل میں مامی تاجور کا پیار تھا۔ بڑی ماں نے واقعی انہیں پیار بہت کیا تھا۔ بس ذہنی طور پر وہ ان کی موت قبول نہیں کر سکی۔"

"اور ہم سے بدظن ہو گئی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" زارا تلخی سے بولی۔

"بھئی، تم چند ماہ صبر تو کر لو۔ دیکھنا، شادی کے بعد تم لوگوں پر کیسی واری صدقے ہو گی۔ وہ منتر پھونکیں گے اعجاز بھائی کہ بس۔" تہمینہ نے آنکھیں میچ کر کہا اور زارا مسکرا دی۔

"چلو، اب مجھے گرما گرم چائے تو پلاؤ، بالائی والی۔ اتنی بحث کر کے میرا دماغ خالی کر دیا ہے۔"

"اتنی جلدی دماغ خالی ہو گیا؟"

"اور کیا؟" تیمی نے کہا۔

"تھا بھی سہی؟" زارا شوخی سے بولی۔

"بہت تھا۔ کچھ تو ستارہ بیگم چاٹ گئیں اور کچھ تم۔ اب جلدی سے کھسکو۔" تہمینہ نے کہا تو زارا ہنس دی۔

"یوں کریں، میرے کمرے میں آ جائیں۔ زویا، میں اور آپ اکٹھے چائے پیتے ہیں۔" زارا نے مشورہ دیا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" تہمینہ نے کمبل ہٹایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

⊛......⊛......⊛

"بس غلام حسین! روک دو گاڑی۔" ستارہ نے تاحدِ نظر پھیلے سرسوں کے کھیتوں سے پرے ڈوبتے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو کھجوروں کے جھنڈ کے پار، دُور ٹیلوں کے پیچھے آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے کنارے کر کے روک دی اور جلدی سے اُتر آیا۔ ستارہ نے بھی اپنا کیمرا سنبھالا، گلے میں دُور بین بھی لٹک رہی تھی۔ سیاہ جینز پر سیاہ ویلوٹ کا کوٹ پہنے، بالوں کو سیاہ اسکارف میں قید کئے وہ کوئی فارنر سیاح ہی لگ رہی تھی۔

"غلام حسین! وہ سامنے تنور والی مائی رہتی ہے نا؟"

"جی بی بی جی!"

"جہاں سے گرمیوں میں تم میرے لئے گرم گرم روٹیاں لائے تھے۔"

"جی۔" غلام حسین سر جھکا کر بولا۔

"وہاں سے آج مکئی کی روٹی لے آؤ، جلدی سے۔ سخت بھوک لگی ہے۔" وہ دُور بین آنکھوں سے لگائے لگائے بولی تو غلام حسین جلدی سے کھسک گیا۔

"اوہ خدا! کتنا حُسن ہے یہاں۔ بھلا یہ حُسن گورچانی ہاؤس کی اونچی اونچی دیواروں سے دیکھا جا سکتا ہے؟....... وہ بیس کنال کا قید خانہ....... پتہ نہیں مما، زارا اور زویا کیسے وہاں رہتی ہیں۔ مہینوں باہر نہیں نکلتیں۔ میں اگر روز نہ نکلوں تو مر جاؤں۔" شاندار اینگلز سے اس نے ڈوبتے سورج کے منظر کی کئی تصاویر بنا ڈالیں۔ اندھیرے کی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ فضا میں خنکی بھی پھیل رہی تھی۔ اور وہ یہاں سنسان سی جگہ پر تقریباً تنہا ہی کھڑی تھی۔ اسے کوئی بھی ڈر خوف نہ تھا۔

کہ وہ ایک لڑکی ہے۔

پھر تنہا بھی۔

بس وہ اپنے ماحول سے نہ جانے کیوں الرجک تھی۔

تبھی ایک جیپ اس کے قریب ہی آ کر رک گئی۔ ستارہ نے حیرت سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھا۔

"اینی پرابلم مس؟"

"نو پرابلم۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"پھر یہاں کیوں کھڑی ہیں؟"

"کیا یہاں کھڑے ہونے کا ٹیکس دیا جاتا ہے؟"

"یہ بات نہیں۔" نوجوان جیپ سے اُتر آیا۔ ڈرائیور جیپ آگے بڑھا کر لے گیا۔

"پھر کیا بات ہے؟" وہ ابرو چڑھا کر بولی۔

"یہ جنگل، بیاباں، آپ تنہا......."

"یہ میرا ملک ہے۔" اس نے کہا۔

"ظاہر ہے۔"

"پھر خوف کیسا؟"

"کہیں باہر سے آئی ہیں؟" وہ اس کے سراپا کو بغور دیکھتا ہوا بولا۔

"نہیں، اے سی صاحب! میں یہیں کی باسی ہوں۔"

"اوہ......! آپ مجھے جانتی ہیں؟"

"بیوروکریٹس کو ہر کوئی جانتا ہے۔"

"میں بیوروکریٹ نہیں ہوں۔" اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"نئے نئے انتظامیہ میں آئے ہیں ناں، تبھی نئے نئے لوگوں کو یہ لفظ گالی ہی لگتا ہے۔ بعد میں اُن کا ضمیر اسی لفظ سے مطمئن ہوتا ہے۔"

"آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

"بھئی روز ہی تو اخبار میں آپ کا بیان بمعہ تصویر کے چھپتا ہے۔ میں شہر میں یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا۔ کرتے کراتے کچھ نہیں، تبریز جمال صاحب!"

"بس آپ بتائیں، آپ کا کیا کام ہے؟" تبریز جمال کے لب مسکرائے۔

"میں کام کروا سکتی ہوں، تبریز جمال صاحب! میرے پاپا معمولی شخصیت نہیں ہیں۔ آپ لوگ اپنی پروموشنز کے لئے سفارش لے کر ان کے پاس آتے ہیں تو کیا میرا کوئی کام نہیں ہو سکتا؟" ستارہ نے اُڑتے بالوں کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

اس کے لہجے میں باپ کی بڑائی کا غرور تھا، فخر تھا۔ ایک لمحے کو تبریز جمال کا جی چاہا، اس پر لعنت بھیج دے۔ مگر کوئی بات اس میں ایسی ضرور تھی کہ چاہنے کے باوجود بھی اس کے قدم نہ اُٹھ سکے۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہم روحِ سفر ہیں، ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ"

وہ بڑی ترنگ میں تھی۔ پتہ نہیں، فضا کا اثر تھا، ماحول کا اثر تھا یا پھر وہ تبریز کو چھیڑ رہی تھی۔

"بہت خوب! میرا نام تو جانتی ہیں؟"

"بھئی، مجھے آپ کی طرح شوق نہیں کہ اخبارات میں تصویریں چھپوا کر اپنی پہچان کراتی پھروں، البتہ......"

"البتہ کیا؟" تبریز نے جلدی سے پوچھا۔

"انتظار کریں، کبھی میری تصویر چھپ ہی جائے۔" وہ اپنی کار سے ٹیک لگا کر کھڑی

ہوگئی۔

"کب؟" تبریز کے لہجے میں بے تابی اُتر آئی تھی۔

"جب میں مروں گی۔"

"خدا نہ کرے۔" بے ساختہ ہی تبریز جمال کے ہونٹوں سے نکلا تو ستارہ ہنس دی۔

"بھئی مرنا تو ہے ہی ناں۔"

"مگر وقت سے پہلے موت کی بات اچھی نہیں لگتی۔"

"مومن وہ ہے، جو ہر وقت موت کو یاد رکھے۔"

"تو آپ مومن کی مثال ہیں؟"

"کوئی شک؟"

"نہیں...... مگر وہ تصویر کے نیچے کیپشن کیا ہوگا؟"

"ہاں، یہ ہوئی بات۔ لکھا ہوگا۔" ستارہ نے پہلے تو اپنے اوپری ہونٹ کا کونہ دانتوں تلے دبایا اور پھر بولی۔ "بھئی پاپا کے نام سے پہچانی جاؤں گی، نہ کہ مشہور و معروف سیاستدان اور شہر کی معزز شخصیت سردار علی احمد گورچانی کی صاحبزادی اپنے کمرے میں مُردہ پائی گئی۔"

"اوہ......!" تبریز جمال کے ہونٹ دائرے میں سکڑ گئے۔

علی احمد گورچانی کی صاحبزادی۔ کون نہیں جانتا تھا اُنہیں۔ اس پورے علاقے پر سارا ہولڈ انہی کا تھا۔ وہ بہت بڑے زمیندار تو تھے ہی، ضلع کونسل کے ہمیشہ بلا مقابلہ چیئرمین منتخب ہوتے تھے۔ بڑے بڑے کلیدی عہدے پر فائز عہدے داران اُن کے نیاز حاصل کرنے ان کی بیٹھک پر جاتے تھے۔ یہ بے نیاز سی لڑکی اس علی احمد گورچانی کی بیٹی تھی، جن سے تبریز جمال بہت متاثر تھا اور اکثر وہ حاضری دیتا تھا وہاں۔ مگر اسے یہ خوب صورت "بلا" تو وہاں کبھی بھی نظر نہیں آئی۔

تم کب زنان خانے میں گئے ہو، تبریز! اور یوں بھی تم نے گورچانی ہاؤس میں کبھی صنفِ نازک ملازمہ نہیں دیکھی تو اس حویلی کی کوئی خاتون کیسے دیکھتے؟

"کیا سوچنے لگے ہیں آپ؟" اُس کی آواز تبریز کو خیالوں سے کھینچ لائی۔

"کچھ نہیں۔" تبریز چونک گیا۔

"میرے پاپا کا نام اتنا خوف ناک تو نہیں۔" وہ مسکرائی تھی۔

"یہ بات نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں بارہا گورچانی ہاؤس گیا ہوں، آپ نظر ہی

نہیں آئیں۔'' تبریز نے سچ بول دیا۔

''وہاں بھلا ہم باہر نکل سکتی ہیں؟''

''لگتا تو نہیں کہ آپ باہر نہ نکل سکتی ہوں۔''

''بہت سخت روایات ہیں ہمارے ہاؤس کی۔ آپ کو معلوم ہو شاید کہ ہماری خواتین اگر کار میں بھی جائیں تو کار میں پردے لگا دیئے جاتے ہیں۔''

''مگر آپ کی کار تو بے پردہ ہے۔'' تبریز نے کہا۔

''میں جو بے پردہ ہوں۔''

''کیا خوب صورتی کو قید کرتے ہیں؟''

''ہر چیز کو قید کرتے ہیں۔ جذبوں کو، آرزوؤں کو، خواہشوں کو۔ ہر شے گورچانی ہاؤس میں قید ہے۔'' وہ روانی سے بولتی گئی۔

''سوائے آپ کے۔'' تبریز نے کہا۔

''شاید'' وہ بے ساختہ ہنس دی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اب اُفق پر صرف سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ تبھی اس نے غلام حسین کو آتے دیکھا تو کار میں بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ جس کا مطلب تھا، اب وہ تبریز سے کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتی۔ تبریز کو اس کی بد اخلاقی پر غصہ تو بہت آیا، مگر اسے پتہ چل گیا تھا، یہ موڈی لڑکی ہے۔ تبھی وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا اور جیپ چند لمحوں ہی میں غائب ہو گئی۔ غلام حسین، چنگیر میں مکئی کی روٹی اور چھوٹی سی مٹی کی کٹوری میں سرسوں کا ساگ لے آیا تھا، جس پر مکھن رکھا ہوا تھا۔

''جیو، غلام حسین!'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی تھی۔ ''تم نے کھایا؟''

''مجھے بھوک نہیں۔'' وہ بولا۔

''اب واپس گھر چلو۔ برتن کل دے جانا، مائی کو۔ ابّا شاید آ گئے ہوں۔ آہستہ آہستہ چلنا، میں جب تک کھانا کھا لوں گی۔''

غلام حسین کو ہدایت دیتے ہوئے وہ مکئی کی روٹی کھانے لگی۔ غلام حسین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

⊛......⊛......⊛

''کہاں رہ گئی تھیں اتنی دیر سے؟'' انیسہ بیگم نے اُسے تقریباً جھنجوڑ ہی ڈالا۔

''اوہ، ماں! مر تو نہیں گئی تھی۔'' وہ اس باز پرس پر جھنجلا گئی۔

''پتہ ہے، کس قدر اندھیرا ہو گیا ہے؟''

''معلوم ہے مجھے، ابھی صرف ساڑھے چھ بجے ہیں۔''

''ہمارے ہاں لڑکیاں اتنی دیر تک باہر نہیں رہتیں۔''

''آپ کے ہاں تو لڑکیاں دن میں بھی باہر نہیں نکلتیں۔''

''تارا! تم کسی دن میرا مُردہ دیکھو گی۔ شکر کرو، تمہارے ابّا ابھی نہیں آئے۔ میرا تو دل ہولا جا رہا تھا، اُن کی جواب دہی سے۔''

''آپ مت جواب دیا کریں۔ اُنہیں کہا کریں، وہ ڈائریکٹ مجھ سے بات کریں۔ چند دن کے لئے گھر آؤ تو زندگی عذابوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بس میں کل ہی لاہور چلی جاتی ہوں۔ نہیں رہا جاتا مجھ سے یہاں، واہموں اور دھڑکوں کے بیچ۔''

ستارا نے انیسہ بیگم کے ہاتھ تھام کر لبوں سے لگائے اور پھر انہیں حیران چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

⊛......⊛......⊛

ابھی کچھ ہی دیر پہلے
میں نے اپنی انگلیوں سے تمہارے ہونٹوں کو چھوا ہے
تمہارے بال اپنے چہرے پر بکھرائے
اور تمہاری خوشبو کو اپنے جسم پر محسوس کیا ہے
ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے
تمہارے سانسوں کی تپش سے حرارت
اور ہونٹوں سے سکون جذب کیا ہے
میری پلکوں نے تمہاری پلکوں کی سرگوشیاں سنی ہیں
اور میں نے تمہاری انگلیوں میں انگلیاں ڈال کے
تمہارے ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کیا ہے
ہاں بالکل ابھی ابھی
اپنی پلکوں پہ ستارے جھلملانے
اور روح میں کچھ ٹوٹ کے چبھ جانے سے تھوڑی دیر پہلے!

اُسے لگ رہا تھا، جیسے ڈھیر سارے کانچ اُس کے اندر بکھرے ہوئے ہوں۔ ایسا کبھی بھی تو نہ ہوا تھا۔ تبریز جمال! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اس حسینہ کے تصور سے آزاد

کیوں نہیں ہوتے؟

وہ خود کو سمجھا رہا تھا۔

بہلا رہا تھا۔

مگر سب بے سود ہی تھا۔ گزرے چار دنوں میں اُس کی یاد اتنی شدید ہوگئی تھی کہ تبریز جمال اسے اپنے قریب بلکہ بے حد قریب پا رہا تھا۔ اسے اس کا نام نہیں معلوم تھا۔

مگر وہ اسے اپنی پسند کے ناموں سے مخاطب کرتا۔

اسے لگتا وہ بہت نزدیک ہے۔

اور یہ تصور اسے بہت ہی بھایا تھا۔ اپنی عمر کے کسی بھی دور میں اس نے کب ایسا چاہا تھا؟ ایسا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ بچپن سے جوانی تک، وہ اپنی ماموں زاد سحرش اور مہوش کے ساتھ رہا تھا، مگر کبھی بھی انہوں نے اس طرح اُس کے در دل پر دستک نہ دی تھی۔

مگر اس قاتلہ نے دستک کب دی تھی؟ وہ تو دروازہ کھول کر تیزی سے داخل ہوگئی تھی اور تبریز جمال اسے منع بھی نہ کر سکا تھا۔ اب بڑے طمطراق سے وہ اس کے دل کے ہر خانے پر قبضہ جمائے اس طرح بیٹھی تھی، جیسے برسوں سے یہاں مقیم ہو۔

معلوم نہیں، تم نے مجھ سے مل کر کیا تاثر لیا ہے؟

اور کیا خبر، تمہیں میں یاد بھی ہوں کہ نہیں؟

مگر تم کیوں میری یاد کے ہر تار سے جڑی ہوئی ہو؟ کیوں بار بار میرا ذہن تمہاری یاد کی طرف دھکیلتا ہے۔

تمہیں سوچنا۔

تمہیں چاہنا، اچھا کیوں لگ رہا ہے؟ اس درد کی دوا۔ بھلا کبھی کسی کو میں نے اس طرح چاہا تھا؟ پہلی نظر کی محبت کا تو میں قائل ہی نہیں۔ مجھے تم سے محبت بھی تو نہیں، ایک دم عشق ہوا ہے پیاری لڑکی! تمہیں دیکھ کر لگا تھا، جیسے ہر پاسے سُکھ چین کے بُوٹے اُگ آئے ہوں۔

تمہیں دیکھا تو تبریز جمال کو لگا، جیسے لاشعوری طور پر وہ تمہیں تلاش کرتا پھرا ہے۔

کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے؟ اس طرح بھی ہوسکتا ہے؟

پہلی نظر ہی دین و ایمان چھین لے جائے۔

بندے کو خالی کر دے۔ سوچوں کے ریشم نے اسے اُلجھا دیا تھا اور یہ سوچیں بھی اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

دل چاہ رہا تھا، کوئی نہ چھیڑے، کوئی نہ بلائے۔ محبوب کا تصور اُسے ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ حالانکہ وہ بہت حقیقت پسند لڑکا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ وہ کبھی بھی علی احمد گورچانی کی صاحبزادی کو "پا" نہیں سکتا۔ مگر "چاہنا" تو اختیار میں تھا۔ اور وہ اختیار والی حرکت کر رہا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا پہلا اور نیا نیا احساس اسے عجیب سی نرماہٹیں دے رہا تھا۔ تبھی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ وہ اپنے خیالوں کی دھنک سے نکل آیا۔ نہایت بے دلی سے اس نے ریسیور اٹھایا اور بیزاری سے بولا۔

"ہیلو!"

"اوہ، امی جان! آپ...... السلام علیکم! خیریت تو ہے نا؟" آج پہلی بار سائرہ خاتون نے اسے فون کیا تھا، ورنہ وہ خود ہی کر لیتا تھا۔

"پورے پانچ روز سے تمہارا فون نہیں آیا۔ میرے دل میں ہول اُٹھ رہے تھے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں امی!"

"مجھے تو نہیں لگ رہا۔ آواز بھی بھاری ہو رہی ہے۔"

"امی جان! سو کر اُٹھا ہوں۔"

"ہیں...... سرِ شام ہی؟" آواز میں حیرانی تھی۔

"آفس سے آ کر سو گیا تھا، اب آنکھ کھلی ہے۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"تمہارے ماموں نے بھی صبح فون کیا تھا، تم سے بات نہیں ہو سکی۔"

"مجھے تو کسی نے نہیں بتایا؟"

"جلدی جلدی فون کیا کرو۔ تمہیں پتہ تو ہے، میری تو پونجی تم اور اویس ہی ہو۔"

"جی امی!" وہ شرمندہ ہو گیا۔ واقعی وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"اویس کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ آج ہی اس کا خط ملا تھا۔ تم اس سے ملنے نہیں گئے؟"

"امی! ذرا فرصت مل جائے تو ضرور جاؤں گا۔ اس ویک اینڈ پر، پرامس۔"

"ٹھیک ہے۔ خبر گیری رکھا کرو بھائی کی۔ تمہاری طرف سے صرف ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"آپ کو پتہ ہے، ڈیرہ غازی خان سے ملتان ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے؟"

"اور کیا...... سنا ہے۔" انہوں نے ایک دم ہی بات بدل دی۔ پھر وہ تبریز کو نصیحتیں

کرنے لگیں۔ صحت کا خیال رکھنے اور اپنا خیال رکھنے کی بابت۔ اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تو مِس گورچانی!........ تم نے ہمیں دنیا میں اپنی عزیز ترین ہستی سے بھی دُور کر دیا۔" تبریز نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے سوچا۔

واقعی، تم ہو ہی ایسی۔ بندہ دنیا و مافیہا سے ہی بے خبر ہو جائے۔

کچھ خبر نہ رہے۔ اپنا بھی پتہ نہ ہو۔

تبھی اس نے سائیڈ پہ رکھے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ مغنی گا رہا تھا۔

بے وفا ہجری دی بھاہ
بالی تاں ہی سکیں تاں ہا!

(ترجمہ: بے وفا ہجر کی آگ تو تُو نے اپنی جدائی سے جلائی تھی، پھر اپنے ہاتھ تو تاپ لیتا)

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے، جیسے یہ گیت بھی ہمارے دل کی آواز ہوں۔ ایک ایک لفظ سچ بن کر دل کی اوک میں گرتا ہے۔ وہ بھی ریزہ ریزہ ہونے لگا۔

دیکھو، تمہارے تصور نے مجھے ماں سے بھی بے خبر کر دیا۔

میری ماں۔

میرا بھائی۔

جو میری کُل کائنات ہیں۔

میری ساری دولت ہیں۔

میرا فخر و غرور ہیں۔

اور تم نے مِس گورچانی! سب کو ایک کونے میں ڈال دیا اور میرے خیالوں پر مسلط ہو گئیں۔ یہ تو سراسر بے ایمانی ہے، ناانصافی ہے۔ ابھی سے میرا حال یہ ہے تو تمہارے قرب میں تو سب کچھ بھلا بیٹھوں گا۔ بس تمہیں چاہوں گا، محسوس کروں گا۔

لیکن تمہیں، کہاں تم، کہاں میں؟

تم آسمان ہو، میں زمین۔

تم ٹھنڈا بادل ہو، میں بنجر دھرتی۔

تم چاندی ہو اور میں تھل کے ٹبوں کا حقیر ذرّہ۔

تم ہواؤں میں رچی خوب صورت خوشبو ہو، میں خزاں رسیدہ پتہ۔

تم سب کچھ ہو اور میں کچھ بھی نہیں۔

وہ ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ یہ تو حقیقت ہی تھی کہ تبریز جمال اسے چاہ سکتا تھا، پانے کا خیال ہی عبث تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تقدیر کبھی بھی اس پر اتنی مہربان نہیں ہو سکتی کہ علی احمد کی صاحبزادی کو اُس کے پہلو میں لا بٹھائے۔ اور پھر کسی کو چاہنا جرم تو نہیں۔ پانا تو نصیبوں کی بات ہے۔ اور سنو مِس گورچانی! میں تمہارے دل میں محبت کی جوت ضرور جگاؤں گا، یہ میرا عہد ہے۔

اُس نے دل ہی دل میں مضبوط ارادہ کر لیا۔

⊛......⊛......⊛

گورچانی ہاؤس میں بھونچال ہی تو آ گیا تھا۔

علی احمد اپنی خواب گاہ میں غصے سے تنتناتے ہوئے ٹہل رہے تھے اور انیسہ بیگم کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"انیسہ! یہ سارا تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے۔"

"میں نے کیا، کیا ہے آخر؟"

"تمہیں ہی شوق تھا کہ تارا پڑھے۔ اور میں بے وقوف تھا، جو تمہاری خواہش کا احترام کرتا رہا۔ دیکھا، تعلیم حاصل کرنے کا انجام۔ وہ........ وہ معمولی اے سی، سردار علی احمد کی بیٹی کو تحفہ بھیجے۔ علی احمد کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"یونہی بھیج دیا ہوگا۔ آپ کو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔"

"اسے کیسے پتہ کہ تارا کو تصاویر اور پینٹنگ کا شوق ہے؟" یہ ایسا سوال تھا کہ جس کا جواب انیسہ بیگم کو بھی نہ آتا تھا۔

"اُلو کا پٹھا..... لکھتا ہے، ملتان گیا تھا تو یہ لینڈ اسکیپ دیکھا تو آپ مجھے یاد آ گئیں۔"

"اب ہماری بیٹیاں لوگوں کو یاد آئیں گی........ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس سے کہاں ملا ہے؟........ تمہارا ذرا کنٹرول نہیں ہے انیسہ!" وہ گرجے۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتے، انیسہ بیگم نے رسانیت سے کہا۔

"آپ یونہی خود کو پریشان کئے دے رہے ہیں۔ یہ آفیسرز لوگ یونہی ہمیشہ آپ کی خوشامد کرتے آئے ہیں۔"

"میں مانتا ہوں، مگر کبھی کسی نے یوں اس حویلی کی بیٹیوں کو مخاطب کرنے کی جرأت

نہیں کی۔ تمہیں نہیں پتہ کہ تارا کس طرح میری عزت کو روند رہی ہے۔" مارے غصے کے سردار علی احمد کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔

"علی! بے شک، تارا بدتمیز ہے مگر وہ کبھی اتنی بری نہیں ہو سکتی۔" انیسہ بیگم کا دل شوہر کی بات مان ہی نہ رہا تھا۔

"انیسہ! تم اس کی طرف داری مت کرو۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ دیکھو...... دیکھو یہ...... اگر پڑھ سکتی ہو تو۔" علی احمد نے کاغذ ان کی طرف بڑھایا تو انیسہ بیگم نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ کاغذ لے لیا اور ان کی نظریں کاغذ پر پھسلنے لگیں، جہاں تین سطریں لکھی تھیں۔

"مِس گورچانی!

تسلیمات!

آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ حاضر ہے۔ گزشتہ روز ملتان گیا تھا، وہاں یہ لینڈ اسکیپ اچھا لگا تو مجھے آپ یاد آ گئیں۔ امید ہے، قبول فرمائیں گی۔

تبریز جمال۔"

"دیکھا تم نے۔ ہمارے خاندان کی لڑکی کو وہ معمولی اسسٹنٹ کمشنر تحائف بھیج رہا ہے۔" علی احمد کے لہجے میں حقارت ہی حقارت تھی۔ وہ چونکیں اور پھر اطمینان سے بولیں۔

"اسے پتہ چلا ہوگا کہ آپ کی بیٹی کو تصاویر جمع کرنے کا شوق ہے تو بھیج دیا۔ سو کام نکلوائے گا، آپ سے۔"

"اگر اُسے چاپلوسی کرنی ہوتی تو مجھے یہ لینڈ اسکیپ بھیجتا۔" انہوں نے گولڈن فریم میں جکڑی خوب صورت تصویر کو دیکھا۔ "میں بدنامی کی آہٹیں سن رہا ہوں، انیسہ!"

اب اُن کا لہجہ دھیما تھا۔

"آپ کو تو فضول واہمے پریشان کرتے ہیں۔"

"میری سوچ غلط نہیں ہوتی۔ وہ یقیناً تارا سے ملا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو کبھی بھی......"

"آپ تارا کو بلا کر پوچھ لیں۔"

"کیا پوچھوں؟" وہ غرائے۔

"یہی، جو واہمہ آپ کو پریشان کر رہا ہے۔"

"تمہاری حد سے زیادہ ڈھیل نے یہ دن دکھائے ہیں۔ یہ صرف تمہاری وجہ سے ہے، انیسہ! میں نہیں چاہتا تھا، وہ پڑھے، گھر سے دُور رہے۔ مگر تمہاری ضد نے میرے خاندان کی عزت پامال کرنے کی بنیاد رکھی ہے۔"

"آپ غلط بات کیوں سوچتے ہیں......؟ میں تارا کی ماں ہوں۔ مجھے پتہ ہے، وہ ضدی ہے، ہٹ دھرم ہے، منہ پھٹ ہے۔ مگر وہ کبھی غلط حرکت نہیں کر سکتی۔" انیسہ نے یقین سے کہا۔

"میں نے کب کہا کہ اس نے غلط حرکت کی ہے۔ یہ ابتدا ہے انیسہ! اور میں طوفان کی دھمک سن رہا ہوں۔ بس، بہت ہو گئی۔ اب میں رضیہ سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی امانت لے جائیں۔"

"ابھی سے؟" انیسہ بیگم کانپ گئیں۔

"اگلے ماہ پورے بیس برس کی ہو جائے گی، تارا۔"

"مگر وہ ایم۔ اے تو کر لے۔" وہ بولیں۔

"بس، جتنا پڑھنا تھا، پڑھ لیا۔ اگر وہ صحیح رہتیں تو شاید میں تمہاری خواہش کا احترام کرتا۔ مگر اب نہیں۔ ابھی تو......"

"ابھی اعجاز کی تعلیم تو مکمل ہو جائے۔"

"ہو جائے گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔" علی احمد کچھ مطمئن سے ہو گئے۔ اور تبھی ستارا آ گئی۔ فیروزی پلین لینن کے سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ قمیض پر چوڑی چوڑی گلابی لیس لگی ہوئی تھی، جس نے سادے سوٹ کو بھی حُسن بخش دیا تھا۔ اُس نے گلابی اسکارف باندھا ہوا تھا، جس میں سے اُس کے سنہری بال نکل کر چہرے پر آ گئے تھے۔ بغیر میک اَپ کے بھی اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

"ماں! یہ لینڈ اسکیپ کون لایا ہے؟ بہت ہی خوب صورت ہے۔" ایک دم ہی وہ آگے بڑھی۔ "یہ مجھے دے دیں۔ میں اپنے کمرے میں لگاؤں گی۔ وہ ماں اور باپ سے بے نیاز سی، تصویر میں کھو گئی۔

علی احمد اُسے لہو رنگ آنکھوں سے گھور رہے تھے۔

"ماں! یہ کون لایا ہے؟" اس نے پھر انیسہ بیگم کو مخاطب کیا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ بولیں۔ پھر وہ علی احمد کی طرف بڑھی اور ان کے بازو کو پکڑا تو انہوں نے اس کا ہاتھ اس

طرح پرے جھٹکا، جیسے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔

''اب...... بی......'' مارے تحیر کے، ستارہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ علی احمد نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اُن کی اُنگلیاں اُس کے بازوؤں میں دھنسی جا رہی تھیں۔

''میں...... تمہیں اپنی عزت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا...... تارا! تم کتنی بھی پڑھ لکھ جاؤ، جس قدر بھی دلیلیں دو، مگر تمہارا جرم ناقابلِ معافی ہے۔ تم نے میری شان کو روندا ہے۔''

''ابی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اس کی آواز بمشکل ہی نکل سکی تھی۔

وہ حیران تھی، اس نئی افتاد پر۔

بھلا کب اُس نے سوچا تھا، والدین کی عزت سے کھیلنے کا۔

پھر کون سا جرم کیا، جو ناقابلِ معافی تھا۔

اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

''ابی! کھل کر بات کریں۔'' وہ اب سنبھل چکی تھی۔

''کیا کھل کر بات کروں؟ سر اُونچا کرنے کے قابل چھوڑا ہے تم نے؟'' علی احمد کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

''ابی! بے شک اس گورچانی ہاؤس میں مجھے بے تحاشا گھٹن ہوتی ہے، دم گھٹتا ہے میرا یہاں، مگر میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی بھی یہاں کی اُونچی دیواریں پھلانگنے کی خواہش کرنا تو درکنار، سوچا بھی نہیں۔ پھر آپ کا سر کیوں نیچا ہو گیا ہے؟''

''کب سے جانتی ہو تبریز جمال کو؟'' ایک دم ہی وہ پھٹ پڑے۔

''اوہ! آئی سی۔'' ستارہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔ ''اب میں سمجھی، معاملہ کیا ہے۔ تو یہ لینڈ اسکیپ اے سی صاحب نے بھیجا ہے اور آپ کا خون کھول گیا، اتنی سی معمولی بات پر۔ ابی! آپ......'' وہ انتہائی بے پروائی سے بول رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے، تم کس سے بات کر رہی ہو؟''

''بالکل پتہ ہے، میں نے کوئی جرم نہیں کیا، جو آپ مجھے پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیں۔''

''تارا......!'' وہ گرجے۔

''سن رہی ہو انیسہ؟'' سردار علی احمد ایک دم ہی بیوی کی طرف پلٹے۔ ''یہ ہے تمہاری

خواہشوں کی تکمیل۔''

''ابھی بچی ہے۔'' وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولیں۔

''پلیز اماں! آپ میرا مقدمہ نہ لڑیں۔'' ستارہ نے ماں کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں بچی ہوں اور ہر غلط بات کا جواب دے سکتی ہوں۔ میں اپنا دفاع کر سکتی ہوں۔ ابی! اپنے ترکش کے سارے تیر نکالیں۔''

''تم انتہائی بدلحاظ ہو، تارا! مگر اس بار میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ آئندہ تم گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔''

''یہ نہیں ہو سکتا، ابی!''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''میں باہر نہ جاؤں تو گھٹ جاؤں گی۔ مجھے زندگی پیاری ہے۔ میں جینا چاہتی ہوں، ابی! مجھے مت روکیں، اس حویلی میں قید نہ کریں۔''

''زارا اور زدیا نے تو کبھی نہیں کہا، وہ قید میں ہیں، انہیں گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔'' وہ لفظ چبا چبا کر بولے۔

''وہ ذہنی طور پر خود کو ایڈجسٹ کر چکی ہے۔ اگر مجھے بھی اس حویلی کے قوانین پڑھائے جاتے تو میں ان دونوں سے زیادہ فرمانبردار ہوتی، ابی! میں تنہائی کے شکنجے میں ایک پل کے لئے بھی نہیں جکڑی رہنا چاہتی۔ مجھ پر پابندی نہ لگائیں۔''

''آزاد چھوڑ دوں۔ تاکہ ہر ایرا غیرا تمہیں تحائف بھیجے؟'' وہ گرجے۔

''وہ ایرا غیرا اس حویلی میں آپ سے ملنے آتا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''اور وہ تم سے ملنے آیا کیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' وہ گھبرائے بغیر بولی۔

''تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ بتاؤ کیا تعلق ہے تمہارا تبریز جمال سے؟'' سردار علی احمد گورچانی کے لہجے میں آگ تھی۔

شک تھا۔

زہر تھا۔

اُس لہجے میں سوال ہی سوال تھے۔ ستارہ اُن سارے سوالوں کو سن رہی تھی، سمجھ رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا، شک کا زہر تیزی سے اُس کی شریانوں میں اُتر رہا ہے۔ باپ کے لہجے کی آگ اُس کے دل کو سلگانے لگی تھی اور وہ ششدر سی تھی۔

"بتاؤ، کیا تعلق ہے؟"

"ابی! جو تعلق آپ سمجھ رہے ہیں، وہ نہیں ہے۔ مگر...... مگر آپ نے مجھ پر شک کر کے اچھا نہیں کیا، ابی!" اُس نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر رُکی نہیں۔ تیزی سے کمرے سے نکلتی چلی گئی اور اپنے کمرے میں آ کر اُس نے دروازہ زور سے بند کیا اور بند دروازے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ہونٹ کچل ڈالے۔

"تو ابی! یہ ہے آپ کی سوچ۔

اُف ابی! مجھ پر شک کرنے سے پہلے کچھ سوچا تو ہوتا۔

بھلا کوئی اولاد پر اس طرح بھی چھینٹے ڈالتا ہے؟...... آپ نے تو میری پگڑی ہی داغ دار کر دی ہے۔

ابی! بہت اُونچائی سے دھکا دیا ہے، آپ نے مجھے۔

ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔

ریزہ ریزہ تو آپ بھی ہوئے ہیں۔

ہاں، میرے دل میں ایستادہ، آپ کا بُت جو میرے گرنے سے ٹوٹ گیا ہے، کچھ نہیں بچا ابی!...... آپ نے مجھ سے میرا فخر، میرا اعتبار، میرا اعتماد، سب کچھ ہی تو چھین لیا ہے۔

مجھے بے آسرا کر دیا ہے...... اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔

میں...... میں کس قدر چھوٹی ہو گئی ہوں، ابی!...... کاش ابی! آپ مجھ پر شک نہ کرتے۔"

میں تو آپ کو بہت کھلے ذہن اور کھلے دل کا سمجھتی تھی...... سارا علاقہ آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہے۔

سب آپ کو چاہتے ہیں۔

مگر...... مگر انہیں نہیں پتہ کہ بغیر کسی جواز اور ثبوت کے، آپ نے کیسی غلط بات سوچ ڈالی۔ اور وہ غلط بات بھی کسی اور کے بارے میں نہیں، اپنی ہی بیٹی کے بارے میں۔

ستارہ کا ذہن کھول رہا تھا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر لڑھکتے آ رہے تھے۔ بہت تکلیف ہوئی تھی اُسے۔

⊛......⊛......⊛

وہ اتنی ضدی کیوں تھی؟ کبھی کسی نے اس سوال کا جواب نہ چاہا تھا۔ حالانکہ اس سوال کا جواب پا لیا جاتا تو ستارہ علی احمد کھل جاتی۔

اُسے یاد تھا، جب سردار علی احمد اُسے مری کانونٹ چھوڑنے جا رہے تھے تو نہایت خوش خوش وہ سب سے ملتی پھر رہی تھی۔ کتنی دیر تک وہ تاج ماں کے گلے کا ہار بنی رہی تھی۔ تاج ماں کو سختی سے منع کیا گیا تھا کہ وہ نہ روئیں۔ اور کتنا ضبط کیا تھا، تاج ماں نے اپنے آنسوؤں پر۔ پھر علی احمد اُسے بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک ہفتہ بعد آنے کا کہہ کر گئے، مگر پورے چار ماہ بعد آئے کہ کچھ نجی اور سیاسی مصروفیات میں اُلجھ گئے تھے اور انہی چار ماہ میں وہ معصوم سی ستارہ مر گئی۔ اُس کے اندر ایک ضدی اور ہٹ دھرم سی ستارہ پیدا ہو گئی۔

سردار علی احمد بھی اُسے دیکھ کر ایک لمحہ کو تو حیران ہوئے تھے کہ وہ از حد کمزور اور چڑچڑی ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اُسے ساتھ لے چلیں، مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"میں پڑھنا چاہتی ہوں، ابی!...... اور گھر جانے سے میری پڑھائی کا حرج ہو گا۔"

نہایت آسانی سے اُس نے گھر جانے سے انکار کر دیا تھا اور یہ اُس کی پہلی ضد تھی، جو مانی گئی۔ پھر تو ضد کرنا اُس کا شیوہ ہو گیا۔ گھر آتی تو زارا اور زویا کو پیار کرنے کے بجائے دُھنک کر رکھ دیتی۔

روز تنگ کرتی کہ اُسے واپس بھیجا جائے۔

اتنی ہٹ دھرم تھی کہ انیسہ بیگم اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گئیں کہ تاج ماں کے پاس وہ نہ جایا کرے۔ مگر وہ تاج ماں کے پاس گھسی رہتی اور آخر ایک روز انیسہ بیگم نے اسے دوسرے طریقے سے سمجھایا تھا۔

"تم تاجور کے پاس نہ جایا کرو، وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔ کسی روز کچھ کھلا دے گی اور تم مر جاؤ گی۔"

یہ زہر جیسا وسوسہ انیسہ بیگم نے ستارہ کے ذہن میں اُنڈیلا، مگر یہ بات اس کے دل کو نہ لگی۔ تب اُس نے محبت کرنے والی صابر سی تاج ماں سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ میری ماں ہیں نا؟"

"ہاں!"

"پھر ماں آپ کو سوتیلی ماں کیوں کہتی ہیں؟"

تاجور کوئی جواب نہ دے سکیں، لیکن ان کے دل میں برچھی سی اُتر گئی۔

"کیا واقعی آپ مجھے زہر دے دیں گی؟"

"خدا نہ کرے کہ میں کبھی ایسا بھی سوچوں۔" تاجور نے اسے سینے سے لگالیا۔

اور ستارہ اتنی معصوم تھی کہ روز ہی وہ ان سے یہ سوالات کرتی۔ تاج ماں اُسے کوئی جواب ہی نہ دے سکتیں۔

بھلا وہ ایسے سوالوں کے جواب کیسے دیتیں، جو کبھی اُن کی سوچ میں بھی نہ اُترے تھے۔ وہ سوچتیں۔

پتہ نہیں، بعض عورتیں سب کچھ پا کر بھی بے چین کیوں رہتی ہیں؟

ناشکری۔

تھڑدلی سی۔

اور......اور کی ہوس اُنہیں بے چین رکھتی ہے۔

قناعت اُن میں نہیں ہوتی، ایسی ہی عورتوں سے انیسہ بیگم بھی تھیں۔ تاجور سوچتیں۔

میں نے سردار علی احمد خان گورچانی کے چھن جانے پر زیادہ نہ کم واویلا نہ مچایا تھا۔ شادی کے تیرہ برس بعد تک جب تاجور ماں نہ بن سکیں تو وہ خود انیسہ بیگم کو بیاہ کر لائی تھیں۔ لغاری خاندان کی انیسہ اپنے حُسن میں یکتا تھیں۔

نئی نکور لڑکی، انیسہ نے سردار علی احمد کو اپنے حُسن و جوانی کے حصار میں ایسا مقید کیا کہ انہیں تاجور سے کئے عہد یاد نہ رہے کہ "دوسری شادی کے باوجود وہ تاجور کے حقوق پورے کریں گے۔" وہ تو انیسہ بیگم کے حُسن کے دریا میں ایسے ڈوبے کہ مدتیں لگ گئیں اُبھرتے۔ وہ تو ہفتوں تاجور کی طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ تاجور پھر بھی صبر کے گھونٹ بھر کے شوہر کے لئے دعائیں کرتیں۔ ایک حویلی میں رہتے ہوئے وہ شوہر سے بات کرنے کے لئے ترستی تھیں اور جب ڈیڑھ برس بعد ستارہ کی قلقاریاں حویلی میں گونجی تھیں تو کتنی بار ہی اُن کا دل چاہا، وہ ستارہ کو سینے سے لگائیں۔ مگر انیسہ بیگم کے خوف سے انہوں نے اپنی خواہش کو کچل ڈالا۔ اور پھر جب ستارہ پاؤں پاؤں چلنے لگی تو ایک روز خود ہی سونے کی پازیبیں چھنکاتی ہوئی اُن کے کمرے میں چلی آئی۔ اور انیسہ بیگم کو پتہ چلا تو وہ ستارہ کی آیا پر ہی برس پڑیں۔ پھر بھی بہت احتیاط کے باوجود بھی ستارہ اُن کے کمرے میں آجاتی تو وہ اسے بانہوں میں سمیٹ کر اپنی بانجھ ممتا کو سکون پہنچا لیتیں۔

پھر ستارہ بڑی ہوتی گئی۔ بولنے لگی۔ مگر سمجھنے کے لئے عمر چاہئے تھی۔ ستارہ ابھی

ڈھائی برس کی تھی کہ زارا آگئی۔ اور جب وہ چار برس کی تھی تو زویا کا اضافہ ہوا۔ انہی دنوں وہ بورڈنگ ہاؤس پہنچا دی گئی اور تاجور جانتی تھیں کہ یہ صرف ستارہ کو ان سے دُور کر کے پڑھائی کا بہانہ گھڑا گیا ہے۔

پھر دن گزرتے رہے۔ ستارہ چھٹیوں میں گورچانی ہاؤس آتی تو تاج ماں کے پاس ہی گھسی رہتی۔ انیسہ بیگم اس پر کنٹرول ہی نہ کر سکی تھیں۔ تاج ماں نہ جانے کیوں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔

اُن کا پیار کرنا۔

سنہرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا، ستارہ کو بہت بھاتا تھا۔

اور پھر جب وہ ساتویں کا امتحان دے کر آئی تو وہ اُداس آنکھوں، خاموش ہونٹوں والی تاج ماں اُسے نظر نہ آئیں۔ وہ سارے گھر میں تاج ماں......تاج ماں پکارتی پھری، تب آیا نے چپکے سے اُسے بتایا۔

"تمہاری تاج ماں مرگئی ہے، تارا!"

"کس نے مارا ہے انہیں؟" بے ساختہ ہی اس نے پوچھا۔

اور اس سوال کا جواب آیا کے پاس نہ تھا۔

"مجھے پتہ ہے، ماں نے میری تاج ماں کو مارا ہے۔"

یہ اُس کے اپنے ذہن کی اختراع تھی۔ اور یہ بات اس تیرہ سالہ ستارہ کے ذہن میں ایسی بیٹھی کہ نکل ہی نہ سکی۔

"ہائے تاج ماں! تم کیوں مرگئیں؟ میں نے تو بڑے خواب دیکھے تھے۔ میں بڑی ہو جاتی، جاب کرتی اور پھر تم کو یہاں سے لے جاتی۔

ہم اکٹھے رہتے۔

مگر تم مرگئیں......مجھے تنہا چھوڑ گئیں۔

وہ پہروں تاج ماں سے تصور میں باتیں کرتی رہتی۔ اُسے تاج ماں کی موت کا بہت دکھ تھا، اس لئے وہ انیسہ بیگم سے دور ہوتی گئی۔ بلکہ وہ گورچانی ہاؤس کے ہر فرد سے دُور ہوتی گئی۔ اُسے اپنے بھائی بہنوں سے بھی چڑ ہوگئی۔ بس جہاں زیب تھا، جس سے وہ بات کر لیتی۔ زیبو اُسے پیارا بھی لگتا تھا۔ شاید اکلوتا بھائی تھا، اس لئے بھی زارا اور زویا سے اُس کی کبھی نہ بنی تھی کہ وہ بھی ماں کی طرح تاج ماں سے نفرت کرتی تھیں۔ اور جو تاج ماں سے نفرت کرتا تھا۔ اُس کا ستارہ کے دل میں کوئی مقام نہ تھا۔ یوں بھی بہنیں

اُس سے دُور دُور ہی رہتی تھیں۔

پچھلے ماہ ہی وہ کنیئرڈ کالج سے بی۔اے کا امتحان دے کر گورچانی ہاؤس آئی تھی۔ رزلٹ کی منتظر تھی اور جرنلزم میں ایم۔اے کرنا اُس کا خواب تھا۔ مگر لگتا تھا، اب تو سارے خواب ہی جل گئے ہوں۔

علی احمد خان گورچانی کے شک کی آگ نے خوابوں کے سارے ہی کھیت جلا ڈالے تھے۔ وہ ایسی ٹوٹی تھی کہ دور تک بکھر گئی تھی۔ کوئی بھی اسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔

یہ حساس لوگوں کا المیہ ہے۔ ٹوٹتے ہیں تو جڑ نہیں سکتے۔ کانچ کے بلوریں گلاس ہوتے ہیں، ذرا سی ٹھیس نہیں برداشت کر سکتے۔ اور وہ بھی بکھر بکھر گئی تھی۔

ہائے ربا!...... یوں بھی ہونا تھا۔

وہ محبت کرنے والے ابیؔ مجھ پر شک کریں۔

رہ رہ کر اُس کے دل میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

کیا میں اتنی بے اعتبار ہوں؟

کیا ابیؔ کے دل میں میرے لئے اتنی ہی بے اعتمادی ہے؟

کبھی میں نے کوئی ایسا قدم اُٹھایا، جو بے اعتبار کہلوائی جا سکوں۔

''تارا! اُٹھو، کھانا کھا لو۔'' انیسہ بیگم اُس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولیں۔

''مجھے بھوک نہیں ہے، ماں!'' اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں فکر و اضطراب کے سائے لہرا رہے تھے۔

''تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔''

''بہت کچھ کھایا ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''غم، غصہ، خون کے گھونٹ پیئے ہیں، میں نے۔'' اپنی بے تحاشا اُداس مگر لہو رنگ آنکھیں اُس نے ماں کے چہرے پر ٹکا دیں۔

''دیکھ تارا بیٹا! تیرے ابیؔ تیرے دشمن نہیں۔''

''دشمن نہیں تو سجن بھی نہیں ہیں۔''

''پاگل ہوئی ہو؟''

''ماں! کاش جب ابیؔ نے مجھ پر شک کیا تھا تو میں پاگل ہو جاتی، ہوش و خرد سے بے گانہ ہو جاتی۔ کاش، میں کچھ نہیں سمجھتی، کچھ نہ جانتی اور نہ سنتی۔ ابیؔ نے تو کوئی لحاظ

کئے بغیر میری روح کو چھلنی کر دیا ہے۔''

''وہ غصے میں بول گئے ہیں۔ تم انہیں بہت پیاری ہو۔'' انیسہ بیگم نے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے پیار سے کہا۔

''ہونہہ، پیاری۔'' ستارہ کے لبوں پر زہرخند پھیل گیا۔ 'ہاں! مجھے پتہ ہے، جتنی میں پیاری ہوں۔ دھجیاں بکھیر دی ہیں، ابیؔ نے میری۔ مجھ سے اور بات نہ کریں۔''

''تم کیوں تنگ کرتی ہو ہمیں؟''

''آپ کیوں تنگ ہوتی ہیں؟''

''جوان اولاد، اَن من ہو تو کیا والدین پریشان نہیں ہوتے؟ آخر کیا کمی ہے تمہاری زندگی میں؟ قدرت نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔''

''مجھے سب کچھ نہیں ''کچھ'' چاہئے اور اپنی مرضی سے۔ اور ماں! آپ نہیں جان سکتیں کہ میری زندگی میں کیا کمی ہے...... میں جو ''کمی'' محسوس کرتی ہوں، آپ کو پتہ نہیں۔''

''مجھے بتاؤ گی تو پتہ چلے گا۔''

''بس ماں! میں سمجھتی ہوں، جیسے میں اس گھر میں، اس ماحول میں مس فٹ ہوں۔ پتہ نہیں کیوں، یہاں میرا دل گھبراتا ہے۔ جی چاہتا ہے، مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے سے گھر میں رہوں، جس کا آنگن اور دیواریں کچی ہوں۔ دیواروں پر توریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہوں، گھر کے سامنے میٹھے پانی کی ندی بہہ رہی ہو، اور......''

''تُو ناشکری ہے خدا کی۔''

''یہ ناشکرا پن نہیں ہے ماں!...... یہ میری خواہش ہے۔ مجھے خوف آتا ہے، بے تحاشا ڈیکوریٹڈ گھروں سے۔ اُونچی اُونچی دیواریں مجھے خود پر آتی محسوس ہوتی ہیں۔ بس آپ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔'' وہ نہایت ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''شاید یہی بات ہے۔''

''تو پھر علی چاہتے ہیں کہ شادی کر دی جائے تمہاری۔'' انیسہ بیگم نے بتایا۔

''یہ ممکن نہیں۔'' وہ تڑخی۔

''کیوں؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''ایک قفس سے دوسرے قفس میں چلی جاؤں؟''

"اعجاز بلوچ تمہیں خوش رکھے گا۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں، اعجاز سے۔"

"شادی تو تمہاری ہونی ہے۔"

"نہیں کرنی، میں نے شادی۔"

"دماغ تو خراب نہیں ہے تمہارا؟"

"ماں! کہہ جو دیا، مجھے تنہا رہنے دیں۔"

"زندگی ایسے گزرتی ہے بھلا؟"

"میں گزار لوں گی۔ میں تنہا رہنے کی عادی ہوں، وحشت ہوتی ہے مجھے شور سے، کسی کی قربت سے۔ مجھے زندہ رہنے دیں۔"

"کیوں اتنی بیزار ہے تُو اس دنیا سے؟" انیسہ بیگم جاننا چاہتی تھیں۔

"یہ آپ اب پوچھ رہی ہیں۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"یہ نئی بات تو نہیں ہے۔ میں تو شروع ہی سے تنہا رہنے کی عادی ہوں۔ آپ کے فرائض میں تو صرف مجھے پیدا کرنا شامل تھا۔ اور پھر تنہائی کی دلدل میں پھینک دیا۔"

"معلوم نہیں تُو کیوں غلط مفروضے گھڑتی ہے، تجھے احساس نہیں کہ ہم کس قدر چاہتے ہیں تجھے۔"

"تبھی خود سے دُور کر دیا تھا؟"

"مجبوری تھی۔"

"کیسی مجبوری؟"

"میں چاہتی تھی، تم کانونٹ میں پڑھو، فرفر انگریزی بولو، جو میرے خواب تھے، تم پورے کرو۔"

"آپ نے اپنے خوابوں کی بھینٹ مجھے چڑھا دیا۔ کون سا انصاف ہے؟ اصل میں آپ نے مجھے تاج ماں سے دُور کیا تھا۔"

"پتہ نہیں، تم ہر بات کا اُلٹ مطلب کیوں لیتی ہو؟" انیسہ بیگم جلبلا کر بولیں۔

"میں جو چاہتی تھی، تم وہ نہیں ہو۔"

"ماں! شاید آپ کو علم نہیں، آگہی کس قدر بڑا عذاب ہے۔ مجھے علم ہے، جو آپ چاہتی تھیں۔"

"میں رضیہ آپا کو بلواتی ہوں۔ آئیں اور اپنی امانت سنبھالیں۔"

"بالکل نہیں ماں!........ میں شادی نہیں کروں گی، اعجاز سے۔"

"کیا تمہارے ابّی کا شک درست ہے؟"

"ماں! آپ بھی........؟" ستارہ نے ہونٹ کچلے۔

"یہ بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولیں۔

"سنیں ماں!" ستارہ نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ "وعدہ کہ نہ اعجاز بلوچ، نہ کوئی اور۔ ہاں ماں! یہ میرا وعدہ ہے، میں نے شادی نہیں کرنی کسی سے بھی۔ میری جو عادات ہیں، وہ آپ لوگ برداشت نہیں کر پاتے تو کوئی اور کہاں برداشت کرے گا۔ اس سے پہلے کہ میں طلاق کا کلنک لے کر آ جاؤں، بہتر ہے کہ کہیں جاؤں ہی نہیں کہ میں نے اپنی عادات نہیں بدلنی۔ میرا انداز نہیں بدلے گا۔"

انیسہ بیگم ہونٹ کچلنے لگیں۔

ہمیشہ ہی اُس کے پاس بیٹھ کر انہیں سوائے دُکھ کے اور کچھ نہ ملا تھا۔ کیسے کیسے لفظوں کے نشتر وہ چبھوتی تھی کہ دُکھ ان کی رگ رگ کو کاٹتا۔ لفظ زہریلے تیروں کی طرح سیدھے دل کی سرزمین میں کھب جاتے۔ وہ گھٹ کر رہ جاتیں اور تاجور کو دل ہی دل میں کوستیں، جس نے ان کی ہیرے جیسی بیٹی کو اس قدر خودسر اور ضدی بنایا تھا۔

"اچھا اُٹھو! کھانا تو کھا لو۔"

"کھانا، مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ اسی ہٹ دھری سے بولی۔

انیسہ بیگم چند لمحے اُسے دیکھتی رہیں اور پھر اسے اپنی بات پر اڑے دیکھ کر خواب گاہ سے نکل آئیں۔

اور پھر تہمینہ کو انہوں نے بھیجا تھا، جس کی بہت زیادہ منت سماجت سے وہ میز پر تو نہ آئی، البتہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھانے کے لئے راضی ہو گئی۔ اور یہ بھی بہت تھا۔ ورنہ تین وقت سے تو وہ بھوک ہڑتال کئے بیٹھی تھی۔ تہمینہ وجہ پوچھ رہی تھی مگر وہ "موڈ نہیں ہے" کا بہانہ کر کے ٹال گئی۔

بھلا کوئی اپنے زخم خود بھی دکھاتا ہے۔

اپنی جان پر پڑنے والے کوڑے وہ کیسے تہمینہ کو دکھاتی؟........ اور تہمینہ بھی اس کی عادتوں سے واقف تھی، اسی لئے زیادہ مجبور نہ کیا۔ اور پھر تہمینہ کے جانے کے بعد وہ کمرے سے نکلی تھی۔ باہر لاؤنج میں کوئی بھی نہ تھا اور وہ چپکے سے فون اٹھا کر اپنے کمرے

میں چلی آئی۔ جلدی جلدی اس نے نمبر ڈائل کیے تھے۔ سلسلہ ملنے پر بولی۔

"اعجاز بلوچ بول رہے ہیں؟"

"ہوں۔" دوسری طرف سے ہنکارا ابھرا گیا۔

"میں ستارہ بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ!........ کیسے مزاج ہیں؟ اور تیمی کیسی ہے؟ خوش تو ہے نا؟"

"اپنے مزاج بتاؤں یا تیمی کی خوشی، اُداسی؟"

"چلیں، اپنے مزاج بتا دیں۔"

"اعجاز بلوچ! سنا ہے کہ ہم بچپن سے ایک دوسرے کے منگیتر ہیں؟"

"بالکل!"

"مگر اعجاز! آپ کے نام نے کبھی میرے قلب و ذہن میں ہلچل نہیں مچائی، کبھی بھی آپ کے نام سے میری آنکھوں میں کوئی خواب نہیں اُترا۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"صرف اتنا کہ آپ مجھ سے شادی سے انکار کر دیں۔"

"وجہ........؟" وہ حیران تھا۔

"وجہ یہ کہ میں دلی اور ذہنی طور پر آپ سے کبھی ایڈجسٹ نہیں کر سکوں گی اور زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

"کیا آپ کسی اور کو........؟"

"ارے نہیں اعجاز بلوچ!" وہ اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔

"میں کسی کو چاہ ہی نہیں سکتی۔ میرے اندر یہ حس ہی نہیں ہے۔ میں تاحیات آپ کی ممنون رہوں گی اعجاز! اگر آپ انکار کر دیں۔ مجھے یہ احساس خوشی دے گا کہ اس دنیا میں کوئی تو ہے، جسے میری خوشی کا احساس ہے۔ پلیز اعجاز! انکار نہ کریں۔" اپنی عادت کے خلاف وہ انتہائی ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

"اگر میں انکار نہ کروں تو؟"

"تو شاید مجھے آپ پھر بھی نہ پا سکیں۔"

"ستارہ! مجھے مشکل میں نہ ڈالو۔"

"یہ مشکل ہے؟"

"آپ کو علم نہیں ستارہ! کہ میرے انکار پر کیسا طوفان آئے گا۔"

"کوئی طوفان وفان نہیں آتا۔ دو چار روز میں سب نارمل ہو جائیں گے۔"

"بے جی اگر کہہ دیں کہ وہ مجھے دودھ نہیں بخشیں گی، تو؟"

"بھئی نہیں کہیں گی۔ آپ بس انکار کر دیں۔"

"مجھے انکار کی وجہ بتا دیں۔ یقین کریں، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا اور راستہ بدل لوں گا۔ ہر دیوار سے ٹکرا جاؤں گا۔ وعدہ........!"

"آپ کسی سے نہیں کہیں گے؟"

"یہ مرد کا وعدہ ہے ستارہ!" آواز نہایت مضبوط تھی۔

"تو سنیں اعجاز بلوچ! مجھے پتہ ہے، جسے میں چاہتی ہوں، اسے بھی نہیں پا سکتی۔ مگر میں اس سے بھی دھوکا نہیں کر سکتی۔"

"کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے؟"

"جنہیں چاہا جائے، ان کے نام نہیں بتائے جاتے۔ وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور........ اور مجھ پر بھی ابھی ابھی یہ انکشاف ہوا ہے کہ میں اُسے بے حد و بے حساب چاہتی ہوں۔ سن رہے ہیں نا آپ؟"

"ہاں........ ہاں........" وہ چونک کر بولا۔

"تو آپ انکار کر دیں گے نا؟"

"ہاں کر دوں گا۔"

"مگر........" ستارہ کی آواز میں خدشہ تھا۔

"بے فکر رہیں۔ سارے الزام اپنے سر لے لوں گا۔" اعجاز بلوچ نے نہایت اعتماد سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

ستارہ نے بھی مسکرا کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

⊛......⊛......⊛

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، اعجاز........؟" رضیہ بیگم نے ایک دم ہی پاؤں سکوڑ لئے تھے۔

"بس بے جی! میں کسی صورت بھی ستارہ کو نہیں اپنا سکتا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔" وہ ہٹ دھری سے بولا۔

"جس فیصلے سے انحراف کر رہے ہو، اسے ہوئے پورے بیس برس ہو گئے ہیں۔ ستارہ پیدا ہوئی تھی اور میں نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ستارہ کے ساتھ ساتھ

میرا فیصلہ بھی جوان ہوا ہے۔" رضیہ بیگم نہایت رسانیت سے بولیں۔

"مگر بے جی! وہ میرے لائق نہیں۔"

"تم اُس کے لائق ہو۔"

"چلیں، یہ سمجھ لیں کہ میں خود کو اُس کے قابل نہیں سمجھتا۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"وجہ؟" رضیہ بیگم جاننا چاہتی تھیں۔

"کوئی وجہ نہیں۔" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"کوئی دلیل نہیں انکار کی، اور انکار کر رہے ہو۔"

"بے جی! آپ کو پتہ ہے۔ وہ بہت ضدی ہے، خودسر ہے۔"

"بھابی اور لالہ کے لاڈ نے اُسے ضدی بنا دیا ہے۔ شادی ہو جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی بچی ہے۔"

"میں اُس بگڑی ہوئی بچی کے ساتھ ساری عمر نہیں گزار سکتا۔ بے جی! یہ میرا فیصلہ ہے۔ اگر آپ نے زبردستی کی تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔" اعجاز بلوچ بھی ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

"گھر چھوڑ دو گے؟" رضیہ بیگم نے پوچھا۔

"جی۔" اعجاز اطمینان سے بولا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"بالکل۔"

"تو چھوڑ دو۔ مجھے ناخلف اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آخر ستارہ میں ایسی کون سی خوبی ہے جو........"

"وہ میری زبان ہے، اعجاز! اور میں لالہ علی احمد کو زبان دے چکی ہوں۔ تم مجھے شرمندہ کروانا چاہتے ہو۔"

"آپ مجھے ساری زندگی عذابوں کی بھٹی میں جلانا چاہتی ہیں؟" اعجاز بھی ترش لہجے میں بولا۔

"تم سوچ لو، جذباتی نہ ہو۔" رضیہ بیگم ٹھنڈی پڑ گئیں۔

شاید بیٹے کے تیوروں سے ڈر گئی تھیں۔

"تم سوچ لو اعجاز! یہ نہ ہو، کل کو پچھتاوا ہو۔ میں میکہ نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر کوئی تمہاری پسند ہے تو اُسے بھی نہیں اپنا سکتی۔"

"بے جی! میری کوئی پسند نہیں۔ مجھے ستارہ کی سرکشی سے خوف آتا ہے۔ آپ........ آپ ماما کو منا لیں۔ زارا کے لئے میں انکار نہیں کروں گا۔" اعجاز نے نہایت اطمینان سے فیصلہ سنایا اور رضیہ بیگم دیکھتی رہ گئیں۔ کتنا آسان سمجھا تھا اُس نے۔

ستارہ نہ سہی، زارا سہی۔ رضیہ بیگم کے لئے دونوں برابر تھیں۔

مگر رضیہ بیگم پریشان تھیں کہ بھائی کو کس طرح سمجھائیں گی۔

کس دلیل سے؟

کس جواز سے نئے رشتے کی طرح ڈالیں گی؟ اُن کے دل میں تو پنکھے لگ گئے تھے اور دماغ سُن ہو گیا تھا۔

⊛......⊛......⊛

بس اِک نظر میں اُتر گیا ہے جو میرے دل میں
میری محبت ہے یا ضرورت، خبر نہیں
میں چھو کے دیکھوں تو اُس کی خوشبو، رنگ جاگیں
وہ خواب ہے یا کوئی حقیقت، خبر نہیں

ہاں مجھے پتہ نہیں کہ تم خواب ہو یا حقیقت۔

مجھے لگتا ہے، جیسے اُس شام میں نے کوئی خوب صورت خواب دیکھا تھا۔

یوں ہی سرِ راہ۔

چلتے چلتے۔ تم ملی تھیں، خواب میں۔

سپنوں میں ایسا ہوتا ہے نا۔

ہم اپنے تخیل میں، اپنی تخلیق دیکھ لیں۔

مگر نہیں، میں نے کوئی خواب کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں حقیقت میں دیکھا۔

کوئی حسین چہرہ اپنی کی طرح میرے دل میں نہیں گھبا۔

میں نے کبھی سوچا نہیں ہے کہ میں محبت کر سکتا ہوں۔

ہاں، مس علی احمد گورچانی! یقین کرو، تبریز جمال نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا۔ محبت تو فضول شے لگتی تھی۔

مگر مجھے تو لگتا ہے، جیسے میں برسوں سے تمہیں چاہتا چلا آ رہا ہوں۔

تم پر نثار ہو رہا ہوں۔

تمہاری خوشبو مجھے بے خود کئے دے رہی ہے۔

تھی بھی یہ حقیقت کہ تبریز جمال خود کو اس کی خوشبوؤں میں ڈوبا ہوا پاتا۔ وہ تنہا ہی بار بار اس جگہ گیا تھا، جہاں وہ اسے ایک بار ملی تھی۔ مگر گھنٹوں وہ اس جگہ کو تکتا رہتا، تصور میں اس سے باتیں کرتا اور لوٹ آتا۔

اُس کا خیال تھا، شاید وہ پھر کبھی آئے۔ مگر وہ نہ آئی تھی۔ پھر اُس نے لینڈ اسکیپ اپنے ڈرائیور کے ذریعے بھجوایا تھا اور تبریز جمال کا خیال تھا کہ وہ ضرور فون کر کے شکریہ ادا کرے گی۔ پر ایسا بھی نہ ہوا۔ دو روز سے وہ ہر گھنٹی پر جلدی سے نہایت بے تابی سے ریسیور اُٹھاتا اور پھر مایوس ہو جاتا۔ لگتا تھا، مایوسی اُس کا مقدر ہو گئی ہے۔ اتنی بے مروّت تو نہیں لگتی تھی۔

شاید گھر میں نہ ہو۔

اور وہ لینڈ اسکیپ اُس کو نہ ملا ہو۔

طرح طرح کی دلیلوں سے وہ خود کو بہلا رہا تھا۔

سمجھا رہا تھا۔

مگر دل تھا کہ ضدی بالک بنا ہوا تھا۔ وہ مس علی احمد کے قرب کا تمنائی نہ تھا۔ فی الحال آنکھیں اُسے ایک بار دیکھنا چاہتی تھیں۔ اور وہ تھی کہ صرف ایک بار اپنی چھب دکھلا کر چھپ گئی تھی۔ نام تک تو اُس نے نہ بتایا تھا کہ وہ کسی کومل احساس سے اُسے مخاطب بھی کر سکتا۔

تُف ہے تم پر، تبریز جمال! تم........ تم نے دل اٹکایا بھی تو کہاں؟........ جہاں تک پہنچنے کی معاشرہ اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی روایات۔ لوٹ آؤ........ کہ ان راہوں پر کانٹے ہیں۔ زخمی ہو گئے تو کوئی بھی پاؤں سے وہ کانٹے نہ نکالے گا۔

تلوؤں سے لہو بہے گا تو کسی مہ رُخ کا آنچل صاف نہ کرے گا۔

محبت میں صرف ذلت ہے۔

رُسوائی ہے۔

خواری ہے۔

بے تابئ دل صرف تڑپ ہی تڑپ ہے۔

محبت عذاب ہی عذاب ہے۔

محبت آنسو ہے۔

دُکھ ہے۔

کرب ہے۔

اور یہ فضول اور فالتو لوگوں کی راہ ہے۔ تم مت چلو، اس راستے پر۔

تم اپنی ماں کے خوابوں کی تعبیر ہو۔

ماں کے دُکھوں کا مداوا ہو۔ ماں کی تڑپ کا دارو ہو۔ ہاں تبریز جمال! بہت سے خواب تمہاری ماں کی پلکوں تلے تڑپ رہے ہیں۔

کتنی مشکلوں سے وہ تم کو اس مقام تک لائی ہے۔ کس قدر بے آسرا تھی وہ تبریز! مگر اُس نے حوصلہ نہیں ہارا۔

ذہن تھا کہ خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک کے بعد ایک خیال تبریز کے ذہن میں تواتر سے آ رہا تھا۔

اور تب ہی ذہن کے پردے پر ایک منظر اُجاگر ہوا۔ عجیب سے ہیولے تھے۔ دو عدد سیاہ اندھیرے جیسے ہیولے۔

عجیب کرّ و فر اور شان تھی ایک ہیولے کی۔ اور دوسرا ہیولہ اُس شان والے ہیولے کے قدموں میں تھا۔

یہ پرچھائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ منظر واضح نہ تھا، مگر تبریز جمال کی مٹھیاں بھنچتی جا رہی تھیں۔ اکثر ہی تنہائی میں وہ یہ منظر دیکھا کرتا تھا، ان پرچھائیوں کی شکلیں واضح نہ ہوتی تھیں۔ مگر اُسے ایک پرچھائیں کی پہچان تھی۔ یہ ایک پرچھائیں اُس کی ماں تھی۔ اور دوسری پرچھائیں یقیناً اُس کے باپ کی رہی ہو گی۔

ابتدا میں جب یہ پرچھائیاں اُس کے ذہن کے پردے پر مثل فلم چلتیں تو وہ سہم جاتا تھا۔ ان پرچھائیوں والی فلم کا ساتھ اتنا ہی پرانا تھا، جتنی اُس کی عمر تھی۔ یہ رشتہ اُس کے قد کے ساتھ ساتھ بڑھا تھا۔

اُسے ماں کی شکل یاد تھی۔ تبھی وہ ہیولے میں بھی پہچان لیتا تھا۔ پھر ماں تو ہمیشہ ساتھ رہی تھی۔

تنہائی میں۔

خلوت میں۔

جلوت میں۔

وہ ماں کی انگلی پکڑ کر چلا تھا۔ اس لئے اُسے اس پرچھائیں فلم میں ماں کو پہچاننے میں کبھی دقت نہ ہوئی۔ البتہ باپ کا نقشہ کبھی واضح نہ ہو سکا۔ اسے پتہ تھا کہ اُس کی ماں

جس پر چھائیں کے قدموں میں ایک بار جھکتی ہے، وہ اُس کے باپ کی ہے۔ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ اس کا باپ بہت اکھڑ تھا۔ اس نے کبھی بھی ماں سے اپنے باپ کی بابت بات نہ کی تھی۔

گھر میں ماما تھے جو مہوش، سحرش، فاران اور عمران کے ''ابو'' تھے۔ مگر تبریز کے لئے ماما جانی تھے۔

مظہر زیدی نے کبھی بھی تو کوئی فرق نہ جانا تھا۔ مگر ایک احساس تھا، جو دل کی گہرائیوں میں اُترا ہوتا۔

میرے ابو کہاں ہیں........؟

بارہا تبریز نے سوچا، مگر ماں سے پوچھنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔

البتہ اویس نے دو چار بار پوچھا تو ماں نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ۔

''جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تمہارے ابو آجائیں گے۔''

تبریز کو بھی آس تھی۔ یہی جملہ اُس کی زندگی کی اساس تھا۔ مگر وہ بڑا ہوتا گیا اور وہ شخص نہ آیا، جس کا نام اُس کے نام کے ساتھ لگ کر اسے مکمل کرتا تھا۔ اور یہ بات خود بخود ہی تبریز کے ذہن میں آگئی کہ اس کے والدین میں اختلاف ہوا، پھر علیحدگی ہوئی۔ کیوں؟ یہ تو اُسے پتہ تھا، نہ ہی اُس نے کبھی ماں کو کریدا۔

مگر یہ پرچھائیاں اُس کا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ تھیں۔

ماہ و سال گزرتے رہے اور یہ پرچھائیاں ویسے ہی جوان رہیں۔ وہ اپنا مقام بنانے کی سعی کرتا رہا۔

اپنے نام سے پہچانا جانا اُس کا خواب تھا، اسی لئے تو وہ جدوجہد میں مصروف رہا تھا۔ ذہن میں کبھی کوئی خیال ہی نہ آیا۔ وہ یونیورسٹی میں بھی پڑھا تھا۔ ایک سے ایک حسین گلبرگ کی اور شادمان کی لڑکیاں موجود تھیں، مگر کسی نے بھی اس کے دل کے تار مضطر نہ چھیڑے تھے۔ وہ اپنے آپ میں مست الست رہا تھا۔ وہ براؤن آنکھوں اور گندمی رنگت والی فرح حیدر تو تبریز جمال کی دیوانی تھی۔ اور کلاس کی وہ واحد لڑکی تھی، جسے تبریز کی دوستی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بس فرح حیدر سے وہ بات چیت کر لیتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ فرح کے والد حیدر زمان، اُس کے ماما مظہر زیدی کے کولیگ تھے۔ اس طرح ان کے گھر آنا جانا رہتا تھا اور وہ فرح حیدر سے بات کر لیتا۔

فرح کو لگتا، جیسے قارون کا خزانہ اُسے مل گیا ہے۔ اکثر فرح اُسے پک اینڈ ڈراپ

دے دیتی تھی۔ سائرہ خاتون کا بھی خیال تھا، شاید وہ فرح کو پسند کرتا ہے۔ مگر ایسا تو نہ تھا۔ اگر وہ پسند کرتا تو اظہار کر سکتا تھا۔ اس بارے میں اُس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ وہ یہ پسند اور محبت وغیرہ کو فضولیات سے تعبیر کرتا تھا اور کبھی اس چکر میں نہ پڑا۔ مگر اب بالکل ہی اچانک وہ امیرزادی، مس علی احمد گورچانی اُس کے دل کی تہوں میں اُتر گئی تھی۔

اُس نے تو تبریز جمال کے دل کے سمندر میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا، جیسے اُس کا اندر بالکل ہی خالی ہو کر رہ گیا ہو۔

بھلا ایسا کب سوچا تھا؟

یوں کب چاہا تھا؟

⊛......⊛......⊛

سرسوں کے پیلے پیلے پھول تاحدِ نظر پھیلے ہوئے تھے اور ان کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں کے درمیان چلتے ہوئے تبریز نے ایک دم ہی اپنے ساتھ چلتی ہوئی من موہنی لڑکی کو دیکھا، جو آج اتفاقاً ہی اسے دوبارہ نظر آگئی تھی اور وہ اسے دیکھ کر رہ نہ سکا تھا، اُس کے پاس چلا آیا تھا۔

''مجھے اپنا نام تو بتا دیں۔''

''ضروری ہے؟'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''آخر کس نام سے پکاروں؟'' تبریز نے کہا۔

''جس نام سے دل چاہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' تبریز نے حیرت سے کہا۔

''میں ذرا منفرد لڑکی ہوں۔''

''ذرا نہیں، بہت۔''

''چلیں، پتہ تو چل گیا نا۔'' وہ ہنسی۔

''مجھے پہلے بھی پتہ تھا۔''

''اچھا........؟'' اس نے تبریز کی طرف دیکھا۔

''ہاں........نام تو بتا دو۔''

''سنیں تبریز! آپ مجھے جو بھی نام دے دیں، میرے لئے سمجھیں، وہی نام ہے۔ آپ رکھ دیں میرا نام۔''

''نیا جنم لیا ہے؟'' تبریز نے پوچھا۔

''ہاں........آج ''گورچانی ہاؤس'' میں ایک نئی لڑکی نے جنم لیا ہے۔ اور وہ نئی لڑکی یہاں موجود ہے۔ ورنہ میں نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تن تنہا کسی مرد سے میں اس طرح ملوں گی۔''

''واقعی؟''

''مجھ پر کبھی شک نہ کرنا۔''

''اپنی زندگی پر بھی کوئی شک کرتا ہے، سوہنی؟'' بے اختیار ہی تبریز جمال نے اُسے سوہنی کہہ دیا اور وہ مسکرا دی۔

''اب میں اتنی سوہنی بھی نہیں ہوں۔''

''میری نظر سے دیکھو۔ اور یوں بھی حُسن تو نظر میں ہوتا ہے، سوہنی........اور میری نظر میں تو تم جیسا کوئی بھی نہیں۔'' تبریز کا لہجہ محبت کی مٹھاس میں بھیگا ہوا تھا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔'' اس کے لب مسکرائے۔

''مگر آپ نے جو مجھے نام دیا ہے نا، وہ........''

''پھر اصل نام بتا دو۔''

''کہا نا، نیا جنم ہے۔''

''تو پھر سوہنی درست ہے۔'' تبریز نے فائنل بات کر دی اور وہ کندھے اُچکا کر رہ گئی۔

''میں نے وہ لینڈ اسکیپ بھیجا تھا، پسند آیا؟''

''ہوں........بے حد۔''

''آپ کے والد کو تو نہیں پتہ چلا؟''

''نہیں۔'' اس نے دھڑلے سے جھوٹ بولا۔

''میں نے غفار سے کہا تھا۔''

''کیا........؟'' ستارہ نے پوچھا۔

''یہی کہ وہ آپ تک ہی تحفہ پہنچائے۔''

''مگر تبریز صاحب! آپ کو کیا علم تھا ''گورچانی ہاؤس'' میں تو میرے علاوہ بھی بہت سی لڑکیاں ہیں۔''

''آپ جیسی منفرد تو کوئی نہیں۔''

''پتہ ہے آپ کو؟''

''بالکل پتہ ہے۔''

''بعض مرتبہ اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔''

''خیر، سردار صاحب کو تو پتہ نہیں نا؟''

''آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر اُن کو پتہ چل جاتا تو آپ یہاں نِکلے ہوئے ہوتے؟''

''ہاں........اب تک ٹرانسفر آرڈر آ گئے ہوتے۔''

''پھر بھی پوچھ رہے ہیں؟''

''یونہی پوچھا تھا۔ اب تو میں تاحیات اسی شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔''

''اتنا پسند ہے؟''

''تم جو ہو یہاں۔''

''میری خاطر رہنا ہے؟''

''بالکل جناب!''

''اگر میں یہاں نہ رہوں، تو........؟''

''جہاں بھی جاؤ گی، میرے ساتھ ہی جاؤ گی۔''

''ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ہو نہیں سکتا، مگر ہو گا۔''

''تبریز جمال!'' ستارہ نے کیکر کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی اور اپنی بے تحاشا اُداس مگر خوب صورت آنکھوں سے تبریز کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ایسے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں، جن کی تعبیریں بہت بھیانک ہوں۔''

''میرے خواب کی تعبیر بھی تمہارے جیسی سوہنی ہو گی۔'' تبریز جمال نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں، جہاں ڈوبتے سورج کی آخری شعاعیں پڑتے ہوئے اُس کے چہرے کو مزید خوب صورت بنا رہی تھیں اور اُس سے تبریز جمال کو لگا، جیسے زندگی ٹھہر گئی ہے۔

وقت منجمد ہو گیا ہے۔

جی چاہ رہا تھا، کوئی کچھ نہ کہے۔

کوئی نہ چھیڑے۔

کہ محبوب کے قرب کا لمحہ ہی خزانہ قارون ہوتا ہے۔

''تم بہت خوب صورت ہو، سوہنی!'' بے ساختہ ہی تبریز جمال کے لب وا ہوئے۔

"کتنی بار کہو گے یہ جملہ؟"

"تا حیات...... ہمیشہ کہتا رہوں گا کہ تم سا کوئی نہیں ہے۔ کتنی تمناؤں کے بعد تمہارا دیدار نصیب ہوا ہے۔" تبریز کا ایک ایک لفظ سچائی میں گندھا ہوا تھا۔

"تمہیں شوق نہ تھا مجھ سے ملنے کا؟"

"میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔" وہ بولی۔

"واقعی؟" تبریز کو حیرت تھی۔

"میں جھوٹ نہیں بولتی۔" وہ بولی۔ اور یہ سچ ہی تو تھا۔ وہ تو تبریز جمال سے سرِ راہ ہونے والی ملاقات بھلا بیٹھی تھی۔ پھر یاد رکھنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ یہ تو سردار علی احمد کے "شک" نے اُسے......

اگر اپنے پھر کوئی ایسی بات کریں تو افسوس نہ ہو۔ اپنے قصور کا پتہ تو ہو۔ اتنی تکلیف تو نہ ہو۔ پتہ نہیں کیوں، ستارہ کو یہ احساس ہوا تھا کہ اب تبریز جمال کے نام سے اُس پر سختیاں ہوں گی۔ وہ شاید اذیت پسند ہو گئی تھی۔ اور اس لئے وہ تبریز جمال کی طرف بڑھی۔ مگر اُسے پتہ نہ تھا کہ......

تبریز جمال کا خوب صورت لہجہ، اُس کا دل کش انداز اُس کے اندر اُتر جائے گا۔ اور تبریز جمال اُسے اچھا لگنے لگے گا۔ تبھی تو بہت جلد ہی تبریز اُس کے خیالوں پر چھا گیا۔ اس کے باوجود کہ تبریز کی محبت بہت شدید تھی۔

بے حد طاقت تھی اس محبت میں۔ وہ جملے اور جذبے اُس پر ہر ملاقات میں نچھاور کرتا۔

فون کرتی تو اُس کی دلکش آواز اُس کے چاروں طرف پھول کھلا دیتی۔ مگر دل کی دھرتی ویسے ہی بنجر تھی۔

وہاں کوئی پھول نہ کھلتا۔

وہ اُس کی باتوں کی بارش میں بھیگ بھیگ جاتی۔

لیکن دل کا آنگن ویسے ہی سوکھا رہتا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی۔

کیا میں واقعی تبریز جمال سے محبت کرتی ہوں......؟

مگر اُسے کوئی بھی جواب نہ ملتا۔

وہ خود کو ٹٹولتی۔

دنوں وہ تبریز کو فون نہ کرتی۔ وہ خفا ہو جاتا تو پروا نہ کرتی۔

تبریز کو اُس نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ وہ اُس کے گھر فون نہ کرے۔ اور پھر وہ فون کرتا بھی تو کیسے؟ اُسے تو اُس کا نام بھی پتہ نہ تھا۔ وہ تو تبریز کے لئے صرف سوہنی تھی۔

کئی بار تبریز اُس سے خفا ہوا تھا۔

"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، تبھی نام نہیں بتاتیں۔"

"نام پتہ چل جائے گا، جس روز میں مروں گی۔"

"تم مرنے کی باتیں مت کیا کرو، سوہنی!"

"کیوں، مرنا نہیں؟"

"مجھے خوف آتا ہے ایسی باتوں سے۔"

"لو، مرنا میں نے ہے، خوف تمہیں آتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" وہ ہنس دیتی اور تبریز اُسے گھور کر رہ جاتا کہ جس کی کوئی بھی کل تو سیدھی نہ تھی۔

مگر وہ پھر بھی اُسے بے حد پیاری تھی۔

وہی تو تھی، جو اُس کی ویران اور سپاٹ زندگی میں بہار بن کر اُتری تھی۔ اُس کا جی چاہتا، ایک ایک کو پکڑ کر بتائے۔

یہ ہے میری جان۔

یہ ہے میری زندگی۔

میری محبت...... میرا پیار...... میری سوہنی۔

⊛......⊛......⊛

اعجاز بلوچ کے انکار نے "گورچانی ہاؤس" میں بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ رضیہ بیگم، بھائی سردار علی احمد کے قدموں میں جھکی کہہ رہی تھیں۔

"لالہ! آپ میری مجبوری سمجھیں۔ اعجاز کہتا ہے، وہ زارا کو اپنانے کو تیار ہے۔ ستارہ سے گزارا نہیں کر سکتا۔"

"کیا ستارہ میری بیٹی نہیں؟"

"بے شک ہے۔ مگر اُس کی ضدی طبیعت سے وہ خوف زدہ ہے۔"

"یا کوئی اور وجہ ہے؟"

"یقین کریں، یہی وجہ ہے۔"

”مجھے سوچنے کا موقع دو۔“

”لالہ! میں آپ سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتی۔ آپ خود سوچیں، جوان اولاد کی نہ مانوں، تب مشکل ہے اور......اور......“ رضیہ بیگم کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا۔

”کہا نا، سوچنے دو۔“ سردار علی احمد کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ بھی اولاد والی مجبوری سمجھتے تھے۔

اُنہیں علم تھا کہ نافرمان اولاد کتنا دُکھی کر دیتی ہے۔

ستارہ کی ضد اور ہٹ دھری سے وہ بھی پریشان تو رہتے تھے۔ اور انہیں بہن کی مجبوری کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر اُن کے ذہن میں ”الارم“ بج رہے تھے۔ یقیناً بات کچھ ”اور“ ہی ہے اور یہی کچھ اور جاننے کے لئے وہ ستارہ کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ اپنے جہازی سائز بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی جھکی ہوئی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر بھی اُس نے سر نہ اُٹھایا۔

”ستارہ......!“

”جی......“ ایک ہی عادت اُس میں اچھی تھی کہ مخاطب کو بے شک دیکھتی نہ، مگر صدا کا جواب ضرور دیتی تھی۔ اُس کی نگاہیں ہنوز میگزین پر جمی ہوئی تھیں۔

”تمہیں پتہ ہے، تمہاری پھپھو آئی ہوئی ہیں؟“

”جی، میں سہ پہر کو ان سے مل چکی ہوں۔“ ستارہ نے کہا۔

”مجھے یہ بتاؤ گی کہ اعجاز سے شادی سے تم نے انکار کیوں کیا ہے؟“ انہوں نے ایک دم ہی مطلب کی بات کر دی۔ ستارہ کو لگا، جیسے اس کے چاروں طرف ریت کے بگولے اُڑ رہے ہوں اور ریت اُس کی آنکھوں میں دھنسی جا رہی ہو۔

اعجاز نے ”سچ“ بتا دیا؟

یہ ممکن نہیں ہے۔

ابیّ ٹل دے کر بات کر رہے ہیں۔ اُس کے ذہن نے جلدی سے فیصلہ سنا دیا۔ کہ تاخیر اُس کے لئے بری ثابت ہوتی۔

ستارہ ایک دم ہی سیدھی ہوئی اور اپنی بے تحاشا اُداس آنکھیں اُس نے علی احمد خان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ آنکھیں، جن میں درد کروٹیں لے رہا تھا۔

اُس کی بجھی بجھی آنکھوں میں ایک انجانا سا احساس لَو دے رہا تھا۔ سردار علی احمد

خان نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی جوت بجھی ہوئی تھی اور گالوں کے گلاب مرجھا گئے تھے۔

ستارہ کی آنکھوں میں تو رنگ جھلملاتے تھے۔ نیلے، پیلے، سرخ رنگ۔ اُس کے گالوں پر گلال بکھرتا تھا۔ اور......اور آج پدری شفقت عود آئی۔

”تارا......!“ وہ ایک دم ہی اُس کے قریب بیٹھ گئے۔ پورے ایک ماہ بعد انہوں نے اتنا قریب سے بیٹی کو دیکھا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ وہ پریشان ہو گئے تھے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ بڑا سپاٹ لہجہ تھا اس کا۔

”تم ایسی تو نہ تھیں۔“

”نہیں تھی، مگر آپ نے بنا دیا۔ آپ کے شک نے مجھے جلا ڈالا ہے۔“ بہت سرد لہجے میں وہ بولی تھی۔

”تارا بیٹے! آئی ایم سوری۔“

”کس بات کی معذرت کر رہے ہیں آپ؟“

”مجھے تبریز کی حرکت پر غصہ آ گیا تھا۔ اور......“

”اور وہ غصہ آپ نے مجھ پر نکال دیا۔“

”مجھے معاف کر دو، تارا!...... تمہیں پتہ نہیں، اپنے ابیّ کو تم کس قدر پیاری ہو۔ میری کتنی دعاؤں کا ثمر ہو تم......صبح ہی میں تمہیں کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ تمہارا لاہور چل کر چیک اپ کراؤں گا۔“

”نہیں ضرورت مجھے چیک اپ کی۔ آپ......آپ......اس قفس سے رہائی کا اعلان کر دیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”میں مزید تمہیں اب ہاسٹلز میں نہیں رکھ سکتا۔“

”تو پھر میری فکر نہ کریں۔“

”میں اب تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ مگر تم نے اعجاز سے کیوں کہا ہے؟“

”میں نے اعجاز سے کچھ نہیں کہا۔ اگر اس نے انکار کیا ہے تو اس کی مہربانی کہ مجھے پُل صراط پر چلنے سے بچا لیا ہے۔ میں اُس کی ممنون ہوں۔ اگر وہ انکار نہ کرتا تو شاید میں انکار کر دیتی۔“

"تارا! تم کیا چاہتی ہو؟"

"مجھے خود پتہ نہیں، میں کیا چاہتی ہوں۔ پھر انسان کے چاہنے سے ہوتا بھی کیا ہے؟ جب رب ہی نہ چاہے۔" ستارہ نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں نہ جانے کیسی شکستگی تھی کہ علی احمد خان لرز گئے۔

"تارا بیٹا! میں اپنی روایات سے انحراف کرلوں گا۔ میں........ میں تمہاری ہر بات مانوں گا، تارا! مگر تم اپنی حالت درست کرلو۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔" علی احمد خان نے اسے کھینچ کر سینے سے لگایا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولے۔ "میں آئندہ تجھے اس حالت میں نہ دیکھوں۔"

اور پھر وہ اس کے کمرے سے چلے گئے۔ تب ستارہ نے نہایت حیرت سے خود کو سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا، جیسے پہلی بار خود کو دیکھ رہی ہو۔

سُتا ہوا چہرہ۔

اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، جن کے گرد سیاہ حلقے پھیل گئے تھے۔ گالوں کے اُبھار نمایاں ہو گئے تھے اور رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ لوگ تو کہتے ہیں، انسان محبت کرنے لگے تو خوب صورت ہو جاتا ہے۔ میں تو مرجھاتی جا رہی ہوں۔ کیسی ہے، تمہاری محبت تبریز جمال!

"مگر تم تبریز کو چاہتی کب ہو؟"

اس کے اندر ہی کوئی زور سے ہنسا۔

میں اُسے چاہتی نہیں۔ مگر وہ مجھے اچھا لگتا ہے، اُس کی باتیں اُس کا لہجہ، اُس کے جملے اور........ اور اُس کا کہنا "سوہنی"........ کتنے خوب صورت انداز میں بات کرتا ہے۔ مجھے پکارتا ہے۔ مجھے لگتا ہے، میں واقعی سوہنی کمہارن ہوں اور........ پھر بے ساختہ ہی وہ ہنس دی۔ اُس کی ہنسی کتنی دیر کمرے میں گونجتی رہی۔

اور پھر سردار علی احمد خان نے بہن کی خواہش پر اعجاز بلوچ کے لئے زارا کا پروپوزل قبول کرلیا۔ کہ انہیں دن کی روشنی کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ ستارہ کے انکار کرنے پر اعجاز نے انکار کیا ہے۔ اگر انکار کی وجہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ اس گھر کی دوسری لڑکی کو قبول نہ کرتا۔ مگر وہ اپنے دھڑے کو زبان دے کر مزید شرمندہ نہ ہونا چاہتے تھے۔

رضیہ بیگم بہت خوش تھیں کہ بھائی نے بات مان لی ہے۔ مگر انہیں پتہ نہ تھا کہ کس مجبوری نے بھائی کی زبان بندی کر دی ہے۔ سردار علی احمد نے کہہ دیا تھا کہ ایک ماہ کے

اندر اندر شادی کرلیں۔ رضیہ بیگم کو کوئی بھی تو اعتراض نہ تھا۔

⊛......⊛......⊛

پروفیسر سرجن خاور زبیر نے ستارہ علی احمد کے تمام ترٹیسٹ اور چیک اَپ کے بعد جو بات علی احمد خان کو بتائی، انہیں لگا جیسے کمرے کی چھت اُن پر آرہی ہو۔

"ڈاکٹر! یہ........ یہ کیسے ممکن ہے؟........ ستارہ ابھی صرف بیس سال کی ہے اور اتنی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے؟"

"حیرت ہے، آپ نے کبھی غور ہی نہیں کیا؟"

"اصل میں وہ رہی ہی ہم سے دُور ہے۔ ہاسٹل میں رہتی رہی ہے۔ ہمیں تو پتہ نہیں۔"

"آپ نے اس سے پوچھا تھا کہ کبھی وہ کوئی دوائی لیتی رہی ہے؟"

"وہ تو کہتی ہے، اُسے کبھی بخار بھی نہیں ہوا۔"

"کیا........ کیا یہ مرض اچانک ہو جاتا ہے؟"

"ہاں........ ایک دم ہی بیماری ظاہر ہوتی ہے۔ اور سردار صاحب! آپ کی بیٹی زیادہ سے زیادہ چھ ماہ زندہ رہے گی۔"

"نہیں، نہیں........ میں اس کا یورپ میں علاج کرواؤں گا۔"

"کیا وہاں اور خدا ہے؟"

"بہتر علاج اور خوراک سے کنٹرول ہو جائے گا۔"

"آپ بچی کو لے آئیں، یہیں ایڈمٹ کروا دیں تو........" ڈاکٹر خاور زبیر نہ جانے کیا کیا کہتے رہے، مگر سردار علی احمد خان گورچانی کی سماعتوں میں تو ان کا صرف ایک جملہ گونج رہا تھا۔

"صرف چھ ماہ اور زندہ رہے گی۔"

"تو میری ستارہ مر جائے گی؟........ میں خود اُسے منوں مٹی تلے دفن کروں گا؟"

"نہیں........ نہیں........" اُن کا پورا وجود پسینے میں ڈوب گیا۔

پچھلے ہفتے ہی تو وہ ستارہ کو زبردستی لاہور لائے تھے........ یہاں پر ڈاکٹر خاور زبیر سے اُسے چیک کروایا تھا، مختلف ٹیسٹ کروائے تھے۔ اور آج وہ رپورٹ لینے آئے تھے۔ کس قدر دل شکن رپورٹ تھی۔ اُن کے تو قدموں تلے سے زمین ہی کھسکتی چلی گئی تھی۔

⊛......⊛......⊛

"یار سوہنی! تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟" تبریز جمال اُس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

"کیا......؟" اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ گئی اور بجھی بجھی آنکھیں لو دینے لگیں۔

"تیرے چہرے کی رنگت زرد ہوتی جا رہی ہے۔ اور آنکھوں کے گرد کس قدر حلقے پڑ گئے ہیں۔" تبریز نے کہا۔

"ایسا تو نہیں ہے۔" وہ اس کی بات سے انحراف کرتے ہوئے بولی۔

"ہے ایسا...... جب تم مجھ سے پہلی بار ملی تھیں تو ایک شگفتہ پھول تھیں۔ اور میری محبت پا کر تم مرجھا گئی ہو۔"

"بہت تپش ہے نا تمہاری محبت کی۔" وہ ہنس دی۔

"شاید...... مگر شدتیں تو انسان کو خوش کرتی ہیں۔ اور تم......"

"فکر مند مت ہو، تبریز! وہ اصل میں میری بہن کی شادی ہے نا، اسی مصروفیت کی وجہ سے میں تھکی تھکی سی رہتی ہوں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"تبریز! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ پر شک کبھی نہ کرنا۔ میں جو کہوں، اعتبار کر لینا۔ ورنہ مجھے کھو دو گے۔"

"میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ تم سے بڑی بہن کی شادی ہے؟"

"چھوٹی ہے مجھ سے۔"

"اور تمہارا نمبر؟"

"اپنا نمبر میں نے اسے دے دیا ہے۔" وہ بولی اور پھر ساری تفصیل بتا دی کہ اعجاز بلوچ کو اس نے انکار پر مجبور کیا تھا۔

"کوئی وجہ تو ہو گی، انکار کی؟"

"اتنی بڑی وجہ جو ہے۔"

"سوہنی! اب میں گھر جاؤں گا، امی جان سے ذکر کر دوں گا تمہارا۔" تبریز نے بتایا۔

"کیا کہو گے؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہی کہ میں نے ان کے لئے بہو دیکھ لی ہے۔" تبریز بولا تو اس کے چہرے پر

رنگ بکھر گیا۔

"تمہاری امی مان جائیں گی؟" وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

"کیوں نہیں؟......اور سوہنی! کیا تم ہمارے گھر میں رہ لو گی؟ چھوٹا سا گھر ہے، جو میرے ماما نے بہت محبت سے ایک کنال پر بنوایا ہے۔ ہم سب اکٹھے رہتے ہیں۔"

"مجھے اونچی دیواروں سے خوف آتا ہے۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔

"تم اپنے آپ کو سیٹ کر لو۔ اتنی پھیکی پھیکی لڑکی میری ماں پسند نہیں کرے گی۔"

تبریز نے کہا تو وہ ہنس دی۔ اور پھر چلتے چلتے ایک دم ہی رک گئی۔ اسے لگا تھا، جیسے زمین گھوم رہی ہو، آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا ہو۔

"مجھے تھام لو، تبریز!" وہ گرنے کو تھی کہ تبریز نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا اور وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی گمشدہ ہمتیں جمع کرنے لگی۔

"کیا ہوا سوہنی؟...... مجھے بتاؤ۔" وہ گھبرائی گھبرائی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی چکر آ گیا تھا۔" وہ نارمل ہوتے ہوئے بولی اور تبریز پریشان سا اسے ساتھ لئے لئے گاڑی تک لے آیا۔

"تم ڈرائیو کر لو گی؟" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تو تبریز نے کہا۔

"ہوں......!" وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں...... میں ٹھیک ہوں۔"

"سوہنی! کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

"دکھا دوں گی۔" اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ پتہ نہیں کیوں اس سے تبریز کی پریشانی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ اور جب وہ گھر آئی تو پورچ میں ابی کی پجیرو موجود تھی۔

"تو ابی لاہور سے اتنی جلدی آ گئے۔ رات ہی تو گئے تھے۔"

گاڑی لاک کر کے باہر آئی تو اندر آتے ہی فضلاں سے ٹکرا ہو گیا۔

"کب آئے ابی؟"

"ابھی چند لمحے ہوئے ہیں...... اپنے کمرے میں ہیں۔" ملازمہ نے بتایا۔ اور وہ خود اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔

"گھر پہنچ کر مجھے فون کر دینا۔" تبریز نے چلتے چلتے اسے تلقین کی تھی۔

باہر لاؤنج میں آئی، جہاں ٹیلی فون رکھا تھا تو ابی کی خواب گاہ سے آتی سسکیوں کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی۔ لاؤنج کے ساتھ ہی اُن کا کمرہ تھا۔

''انیسہ! رو کر مجھے پریشان مت کرو۔''

''آپ......علی! آپ کسی اور سے چیک اپ کرائیں، تارا کا۔''

''پروفیسر خاور زبیر سے بڑا ڈاکٹر اور کوئی نہیں ہے۔''

''شاید ان کی تشخیص غلط ہو۔''

''کمپیوٹرائزڈ ہے اُن کا سارا نظام۔''

''مشین غلط بھی بول سکتی ہے۔''

''مگر مجھے یقین ہے، یہ تشخیص درست ہے۔''

''کیسے بھلا؟''

''تم تارا کی حالت دیکھو۔ دن بہ دن مرجھا رہی ہے۔ اور جیسا ڈاکٹر خاور نے کہا ہے، اگر اس رفتار سے اُس کی صحت گرتی رہی تو چھ ماہ کے بجائے بہت جلد ہمیں......''

انیسہ بیگم اُن کی بات کاٹ کر جلدی سے بولیں۔

''خدا کے لئے، ایسی خوف ناک باتیں مت کیجئے۔''

''میں...... میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں خود نہیں آتا، انیسہ! میں...... میں اپنی بیٹی کو مرتے کس طرح دیکھوں گا؟ نام ہی کس قدر خوف ناک ہے۔ اور میری بیٹی اس مرض میں مبتلا ہے۔''

''اوہ......!'' ستارہ نے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ تو ابّی، جان ہی گئے۔ اس نے تو یہ بات خود سے بھی چھپائی تھی۔ لاہور ہاسپٹل میں ہی وہ جان گئی تھی کہ دنیا میں اس کے قیام کا وقفہ بہت مختصر ہے، اسی لئے اپنی مرضی سے جینا چاہتی تھی۔

''تارا کہاں ہے؟'' سردار علی احمد پوچھ رہے تھے۔

''اپنے کمرے میں ہوگی۔'' انیسہ بیگم کی بھرّائی ہوئی آواز اُبھری۔

''اب اُس پر کوئی سختی نہ کیا کرو۔ گھومنے پھرنے دیا کرو۔ اور...... اور اُس کا رزلٹ آ جائے تو میں ایڈمیشن دلوا دوں گا۔ تم اُسے مت بتانا کچھ بھی۔ میں اُس کا علاج کرواؤں گا، ساری دولت خرچ کر دوں گا۔''

''میں علاج کرواؤں گی تو آپ کروائیں گے، ابّی!'' اُس نے نہایت سفاکی سے سوچا اور تبریز کو فون کئے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''میں زندہ نہیں رہنا چاہتی، ابّی!...... مجھے پتہ ہے، میں زندہ رہی تو میری خواہشیں بڑھیں گی۔ اور میں تو......

خواہشوں کو خوبصورت شکل دینے کے لئے
خواہشوں کی قید سے آزاد ہونا چاہئے

میں، اس قید سے آزاد ہونا چاہتی ہوں...... مجھے پتہ ہے، میری خواہشوں میں پہلی خواہش تبریز جمال ہوگا۔ آپ کبھی بھی میری یہ خواہش پوری نہ کریں گے۔

یہاں خاندانی روایات آڑے آئیں گی۔

آپ کی پگ نیچی ہوگی۔

بھلا آپ کب تبریز جمال کو خاطر میں لائیں گے، کہ نہ جس کے پاس اعلیٰ خاندانی نسب کی سند ہے، اور نہ ہی اس کے اجداد سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک ہیں۔ آپ تو چاہیں گے، یہ خواہش کرنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں۔ میری موت قبول کر لیں گے آپ......تو بہتر ہے کہ میں خود کیوں نہ ہنس کر موت کو گلے لگا لوں۔

آپ کا بھرم بھی رہ جائے گا، اور میرا بھرم بھی...... زندگی کا خوب صورت سفر تو اب شروع ہوا تھا کہ خاتمے کی نوید مل گئی۔ اُس کی آنکھیں بھرّا گئیں۔

⊛......⊛......⊛

زارا شادی کے بعد اعجاز بلوچ کے سنگ ''بلوچ ہاؤس'' چلی گئی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ تہمینہ کو دُکھ تھا کہ ستارہ سے اس کے بھائی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے وہ شادی کی تقریب میں بھی نہایت بجھی بجھی سی رہی تھی، جبکہ ستارہ نے شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ زارا کی شادی میں عمائدین شہر بھی شریک ہوئے تھے اور تبریز جمال کو بھی بلاوا آیا تھا۔ درِ محبوب پر وہ کشاں کشاں گیا، مگر اپنی سوہنی کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پایا تھا۔

جس کا اُس نے شکوہ کیا۔

''تم میرے سامنے نہیں آئیں؟''

''شوٹ کروانا تھا؟'' وہ بے ساختہ بولی تو تبریز ہنس دیا۔ ''تبریز! ایک بات کہوں؟''

''کہو۔'' وہ نثار ہوتے ہوئے بولا۔

''تم گھر جاؤ تو امی سے میرا ذکر نہ کرنا۔''

''کیوں......؟'' تبریز نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی وقت نہیں ہے، جب وقت آئے گا تو میں بتا دوں گی۔''

"وجہ تو بتا دو؟"

"چند ماہ صبر نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتا ہوں...... مگر وقت پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"تبریز!...... یہ وعدہ ہے کہ میں تمہاری نہ ہوئی تو کسی کی بھی نہیں ہوں گی۔"

اُس نے چپکے سے اپنی آنکھوں کے کونوں میں جمع ہو جانے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"سوہنی! مجھے بتاؤ، کیا پریشانی ہے؟"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، تبریز!...... بس مجھے تم سے بچھڑنے کا خوف کھاتا ہے۔"

"ہم کیوں بچھڑیں؟...... آسمانوں پر لکھا ہے ہمارا ملن۔" تبریز نے اس کا خوب صورت ہاتھ تھام کر کہا، جو سرد ہو چکا تھا۔ ستارہ اُسے صرف دیکھ کر رہ گئی۔

سردار علی احمد خان چاہتے تھے کہ وہ علاج کروائے، مگر ستارہ مان کر نہ دے رہی تھی۔

"آخر مجھے ہے کیا، جو آپ مجھے لاہور علاج کے لئے لے جانا چاہتے ہیں؟" وہ نہایت بے پروائی سے بولی۔

"ڈاکٹر خاور کا خیال ہے، معمولی ٹربل ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"میں ٹھیک ہوں، ابّی! مجھے علاج کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

امینہ بیگم بھی اسے سمجھا بجھا رہی تھیں...... اور علی احمد خان بھی۔ مگر اس نے عہد کیا تھا کہ علاج نہیں کروائے گی۔ پھر بھلا کیوں جاتی؟...... آخر علی احمد خان ہار گئے۔ گھر ہی میں اُس کا علاج ہونے لگا تھا...... یہ اور بات تھی کہ وہ دوائی نہ کھاتی۔ اُسے خود محسوس ہوتا، جیسے دن بہ دن وہ موت سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ تبریز سے ملتی تو وہ اسے محبت سے، پیار سے سمجھاتا۔

"آخر تم اپنا خیال کیوں نہیں کرتیں؟"

"مجھے کیا ہے؟"

"اپنی حالت دیکھو۔"

"بہت اچھی ہے۔" وہ بجھی بجھی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔

"مجھے نہیں لگتی، تمہاری حالت اچھی۔"

"مجھے تو تم بیمار لگتے ہو۔" اس نے کہا تو تبریز چونک گیا۔

کیا...... کیا میرے اندر کی توڑ پھوڑ کی اسے خبر ہو گئی ہے؟

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"لگتا تو نہیں۔" وہ شانے اُچکاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اور تبریز جمال واقعی ان دنوں پریشان تھا کہ سائرہ خاتون، بھائی کا احسان اُتارنے کے لئے مہوش کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔

وہ گندمی رنگت اور سیاہ آنکھوں والی مہوش زیدی...... اگر سوہنی اُس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی تو تبریز کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر وہ تو تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ سوہنی سے بچھڑنا اُس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ مگر ایسا ہو ہی گیا۔

سائرہ خاتون کے کتنے ہی بلاوے آئے۔ وہ معروفیت کا بہانہ کر کے نہ گیا۔ مگر ان کی بیماری کا بلاوا، وہ رُک نہ سکا تھا اور اگلے روز ہی ستارہ نے مقامی اخبار میں پڑھا تھا، کہ تبریز جمال کا ٹرانسفر سرگودھا ہو گیا ہے۔

وہ اخبار لئے سردار علی احمد کی خواب گاہ میں آ گئی۔

"اوہ...... ابّی! آپ نے پھر چال چل دی۔ آپ کو میری اتنی سی خوشی نہیں بھائی۔ اور آپ نے تبریز کا ٹرانسفر کروا دیا۔"

"تارا! یہ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ حیرت زدہ تھے۔

"ابّی! آپ...... آپ رُکوا دیں اس کا ٹرانسفر۔ میں وعدہ کرتی ہوں، میں آئندہ تبریز سے نہیں ملوں گی، اسے فون بھی نہیں کروں گی۔" ستارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور سردار علی احمد تو حیران تھے۔

وہ کس قدر بیٹی کے جذبوں سے بے خبر رہے۔

اس کا انہیں اب احساس ہوا تھا۔

"تبریز تمہاری خوشی ہے، تارا؟"

"جی ابّی!...... مگر ایسی خوشی، جسے میں نے ساری عمر کے لئے جھولی میں ڈالنے کی خواہش کبھی نہیں کی۔" ستارہ کی آواز بھرا گئی۔

"تمہاری یہ خواہش بھی پوری کی جا سکتی ہے، تارا!" وہ بولے۔

"ابّی......!" وہ ششدر رہ گئی۔

"ہاں تارا! تم غلط سمجھتی رہی ہو مجھے...... تمہاری خوشی جی جان سے پیاری ہے۔ اور میں تبریز کا ٹرانسفر رکوانے کی کوشش کرتا ہوں۔" انہوں نے ستارہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر

کہا تو وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

"ابّی! مجھے سب پتہ ہے، میں اپنے مرض سے لڑوں گی ابی!...... مجھے تو آپ کے شک نے توڑ ڈالا تھا۔"

"پھر وہ شک سچ تو ہے نا؟" وہ مسکرائے۔

"نہیں ابی!...... یہ تو میں نے بغاوت کی ہے، اس وقت تو میں تمریز سے صرف ایک بار سرِ راہ ملی تھی۔" ستارہ نے سچ اُگل دیا اور بیٹی کی معصومیت پر سردار علی احمد ہنس دیئے۔

اگلے روز ہی ستارہ نے تمریز جمال کے آفس سے اُس کا لاہور کے گھر کا نمبر حاصل کیا اور عجیب سرمستی کی سی کیفیت میں اس نے نمبر پُش کیے تھے۔

تیسری بیل پر ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

"ہیلو......!"

"ہیلو، تمریز......!" ستارہ جلدی سے بولی۔

"میں تمریز کا بھائی اولیس ہوں۔" اُدھر سے آواز آئی۔

"اوہ، سوری...... آواز بہت ملتی ہے۔"

"جی فرمائیں؟"

"تمریز کو بلا دیجیے۔"

"وہ تو نہیں آسکتے یہاں۔"

"کیوں؟"

"یہ آپ شور کی آواز سن رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں، خیر تو ہے؟"

"خیر سے بھائی جان کا آج نکاح ہے۔ ماموں زاد مہوش زیدی سے۔" اولیس خوشی خوشی بتا رہا تھا۔ اور ستارہ کو لگا، جیسے خواب آلود سرگوشیاں اس کے کانوں میں مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہوتی جا رہی ہوں۔

"آپ کون ہیں......؟"

"کہہ دیجیے گا، سوہنی نے مبارک باد دی ہے، جو بحرِ عشق میں ڈوب گئی...... سوہنی کا مقدر ڈوبنا ہے، پھر بھلا میں کیسے کنارے لگتی؟" ستارہ کی آواز بھرّا گئی۔ اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ دل میں ایسا درد اُٹھا تھا، جس سے وہ آج سے پہلے آشنا ہی نہ

تھی۔ اُس کا سر جھکتا چلا گیا اور اُس کی پیشانی فون کے ریسیور پر ٹِک گئی۔

⊛......⊛......⊛

ناشتے کی میز پر سب ہی موجود تھے، سوائے مہوش کے، جو تمریز سے نکاح کے بعد پردہ کرنے لگی تھی۔ سائرہ خاتون کی خواہش پر نکاح ہوا تھا۔ وہ ہر صورت بیٹے کو بھائی کے احسانوں کا بدلہ اُتارنے کا وسیلہ بنانا چاہتی تھیں۔ تمریز نے بہت سر پٹخا، مگر سائرہ خاتون کی ایک ہی ضد تھی۔

"مہوش ہی میری بہو بنے گی۔ تمہیں کیا پتہ کہ بھائی کے مجھ پر کس قدر احسان ہیں۔"

"میں ہی قربانی کا بکرا ہوں؟" وہ چیخ پڑا۔

"کچھ بھی جانو، تمریز! جب تمہارے باپ نے مجھ سے گھر کی چھت چھینی تو مظہر نے ہی مجھے پناہ دی۔ اور یہ مظہر کی خواہش ہے۔ پھر تمہارے باپ نے تو کبھی پوچھا تک نہیں۔ وہ اپنی پسند کی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش ہے۔ مجھ سے یہ چھت نہ چھینو اور مجھے احسان فراموش نہ کہلواؤ۔ میں بھائی سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

"امی! میں بھی کسی سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"کیا مجھ سے زیادہ عزیز ہے تمہیں وہ؟"

"امی! آپ کی اہمیت اپنی جگہ، مگر وہ بھی مجھے بہت عزیز ہے۔"

"تو جاؤ، اُسے اپنا لو۔ مگر لوٹ کر نہ آنا۔ سمجھنا، ماں مر گئی ہے۔" سائرہ خاتون رونے لگیں۔ اور یہی وہ لمحہ تھا، جب وہ ہار گیا تھا۔ اور ماں کے آنسوؤں نے اسے جکڑ لیا تھا۔

اس کے مانتے ہی دوسرے روز سادگی سے اس کا مہوش سے نکاح کر دیا گیا تھا۔ اور اس کی محبت اس کے دل میں بہت ہی قریب روتی رہتی تھی، سسکتی رہتی تھی۔

اب بھی وہ خاموشی سے ناشتے میں مصروف تھا۔

"چ...... چ...... چ......" اولیس بہت افسوس کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" تمریز نے دیکھا، وہ اخبار پڑھ رہا تھا۔

"کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں، جن پر بے اختیار دکھ ہوتا ہے۔"

"کون مر گیا؟"

"مر گئی ہے۔ دیکھو، کتنی حسین لڑکی ہے۔" اولیس نے اخبار اس کی طرف بڑھایا۔

سحرش بالکل ہی تبریز کے برابر میں بیٹھی تھی۔

"دیکھیں تو بھائی! کتنی پیاری لڑکی ہے۔" سحرش جھک کر پوری خبر پڑھنے لگی۔

"ضلع کونسل ڈی، جی خان کے چیئرمین سردار علی احمد خان گورچانی کی بڑی صاحبزادی ستارہ علی احمد خاں انتقال کر گئیں۔ وہ......."

تبریز نے جلدی سے اخبار تقریباً چھین ہی لیا۔ سامنے ہی اُس کی سوہنی، مسکراتی آنکھوں والی تصویر تھی۔

"سوہنی.......!" تبریز کو لگا، جیسے کوئی اُس کا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔

"میری سوہنی مر گئی۔" وہ بڑبڑایا۔ مگر اُس کی آواز کوئی بھی نہ سن سکا تھا۔ اس کے قریب ہی سرگوشیاں اُبھریں۔

"میرے مرنے کی خبر اخبار میں چھپے گی، اور پھر تمہیں میرے اصل نام کا بھی پتہ چل جائے گا۔"

"ستارہ علی احمد.......

تم ستارہ! میری زندگی میں روشنی بکھیر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھیاروں میں ڈبو گئی ہو مجھے۔

تم زندہ رہتیں تو مجھے خوشی ہوتی کہ ہوائیں تمہیں چھو کر آتی ہیں۔

فضاؤں میں تمہاری خوشبو رچی بسی ہے۔

میں چاند کو تکتا تو احساس ہوتا، تمہاری نگاہوں کا محور بھی یہی ہے۔ تم مجھے ہر احساس سے عاری کر گئیں۔"

تبریز جمال اخبار اُٹھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور پھر اُس نے بار بار وہ خبر پڑھی، جیسے اس خبر کی سچائی پر اُسے شک ہو۔ اور پھر اُس نے ستارہ کی تصویر پر ہونٹ رکھ دیئے۔

"تارو.......تارا! بے شک تم بہت دور چلی گئی ہو، مگر میرے پاس نہ ہونے کے باوجود بھی تم میرے پاس ہو۔ اور جب تک میں زندہ ہوں، تمہیں میں اپنے بہت قریب پاؤں گا۔ میرے لئے یہی احساس بہت ہے کہ تم میری نہیں ہوئیں تو کسی اور کی بھی نہیں ہوئیں.......کتنا خود غرض ہوں میں۔

مگر نہیں تارا!.......میں خود غرض نہیں کہ محبت کبھی بھی خود غرض نہیں ہوتی۔ یہ تو غرض سے پاک جذبہ ہے۔

میں بھی شاید مہوش کو وہ سب کچھ نہیں دے سکوں گا، جس کی وہ آرزو مند ہو گی۔

کہ جذبوں اور محبتوں کی پٹاری سب کے لئے نہیں کھلتی۔

محبت کی بارش میں ہر کسی کو نہیں بھگویا جا سکتا۔

عشق کی آگ میں بار بار بھی نہیں جلا جاتا۔

تم میرا عشق ہو۔

مہوش میری مجبوری.......مہوش کا ساتھ.......میری ماں پر کئے گئے احسانوں کی بمعہ سود واپسی۔

اور میں مطمئن ہوں کہ مہوش شکوہ کرنے کے قابل نہیں ہو گی۔ میرے پاس تمہاری خوشبو ہر دم، ہر ساعت پھیلی رہے گی۔ اور میں زندگی کے دن گزارتا رہوں گا کہ اب تو زندگی میں اس کے علاوہ کوئی چارم ہی نہیں رہ گیا۔

کتنے ہی آنسو تبریز جمال کی آنکھوں سے ٹپکے اور ستارہ علی احمد کی تصویر میں جذب ہو گئے۔ اب بھلا وہ اپنی محبت کی موت پر روتا بھی نہ.......؟

❀......❀......❀

روشن رہیں گھر کے چراغ

"بس نصیر! میں جا ہی نہیں سکی۔ میری طبیعت بہت خراب ہے۔" تمکین آپا نے ہلکا سا کھانس کر کہا۔ "اب تمہیں کیا بتاؤں، تم وہاں اکیلے ہو، پریشان ہو گے۔" انہوں نے دھڑلے سے جھوٹ بولا۔ بیچ میں اماں بھی ٹھوکے دینے سے باز نہ آ رہی تھیں۔

"اب بھی دیکھو، چچی جان سے یہ نہ ہو سکا، میری طبیعت پوچھنے آ جاتیں۔ چلو، مجھے نہ پوچھیں، حرا کے لئے ہی آ جاتیں۔" تمکین آپا کی آواز خوانخواہ ہی بھرا گئی۔ نصیر بھائی یقیناً دوسری طرف سے انہیں دلاسے دے رہے تھے اور وہ سسکیاں بھر رہی تھیں۔

تب اماں نے تمکین آپا کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور بولیں۔

"چھوڑ دو بیٹا! تم پریشان نہ ہونا۔ اکیلے ہو وہاں۔ اور تمکین کی تم فکر نہ کرو۔ ہم ہیں نا۔"

"ارے بیٹا! احسان کیسا؟ یہ بتاؤ، کب آؤ گے؟"

اماں ڈلار سے کہہ رہی تھیں اور تمکین آپا اپنے مگرمچھ والے آنسو صاف کرنے کے بعد پھر فون پر بات کرنا چاہ رہی تھیں۔

"اے لو میاں!........ بیوی سے بات کرو۔" اماں نے ریسیور پھر تمکین آپا کو پکڑایا اور ساتھ ہی پیٹھ بھی تھپکی۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ "ڈٹی رہو۔"

"حرا آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ ہر وقت پپا، پپا کی رٹ لگائے رہتی ہے۔ آپ کی تصویر لئے پھرتی ہے۔" تمکین آپا اب حرا کی چھوٹی چھوٹی باتیں بتا رہی تھیں۔ اور یقیناً ادھر نصیر بھائی خوش ہو رہے تھے۔

شرمین کاپیاں اُٹھا کر باہر آنگن میں چلی آئی اور چارپائی پر بیٹھ کر اس نے پھر کاپیاں چیک کرنی چاہیں، مگر اُس کا ذہن تو تمکین آپا اور نصیر بھائی میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

اُسے ہمیشہ دُکھ ہوتا تھا، اپنی بہن اور ماں کی چال بازیوں پر۔ بے چارے نصیر بھائی یک طرفہ "الزام" سن کر اب اپنی ماں بہنوں سے جھگڑیں گے۔

توبہ، نصیر بھائی کو تو کوئی سوجھ بوجھ نہیں۔ شاید دماغ کہیں گروی رکھ دیا ہے۔

شرمین نے کئی بار کی سوچی ہوئی بات پھر سوچ ڈالی۔

اُسے پتہ تھا، ہمیشہ کی طرح ادھر سے بات پوری ہوتے ہی نصیر بھائی اپنے گھر پر فون کر دیں گے اور پھر کل ہی چچی جان آ موجود ہوں گی۔

اور پھر دونوں طرف سے دھواں دھار شکوے، شکایتیں ہوں گی، اماں اچک اچک کر بولیں گی۔

تمکین آپا بھی روتے ہوئے مظلوم بنیں گی۔ مگر اس مظلومیت میں بھی وہ ساری بھڑاس ساس نندوں پر نکالیں گی۔ اور پھر ہمیشہ کی طرح ہار چچی جان ہی کی ہو گی۔ اور اماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیں گی، کہیں گی۔

"بس صابرہ بی! تم جیتیں، میں ہاری۔ ارے تم نے بیٹی نہیں بیاہی، بلکہ میں نے بیٹا رخصت کر کے یہاں بھیجا تھا۔ میں ہمیشہ بھول جاتی ہوں۔ آئندہ میں تمہاری دہلیز پر قدم رکھوں تو میرے پاؤں جل جائیں۔"

"ہم بھی تمہیں بلانے نہیں جاتے۔" اماں تو بدلحاظی کی انتہا کر دیتیں۔ اور پھر چچی جان روتی ہوئی چلی جاتیں۔ اماں کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔

"بڑی آئیں مجھ سے لڑنے۔ ابھی تو میں نے گھر آئی کا لحاظ کر لیا، ورنہ وہ سناتی کہ یاد رکھتیں۔"

اماں اتنا کچھ کرنے پر بھی "حسرت زدہ" ہی رہتی تھیں اور تمکین آرا کہتیں۔

"اماں! اگر انہوں نے نصیر کو کہا تو؟"

"ارے کہنے دو، میں سنبھال لوں گی۔ تم کہنا، وہی لڑنے آئی تھیں۔ اور بھئی، ہم تو ان کے گھر نہیں گئے۔ تم دب کر نہ رہو، ورنہ یہ تمہیں کھا جائیں گی۔" اماں اور شہ دیتیں اور تمکین آرا سر ہلا کر رہ جاتیں۔

⊛......⊛......⊛

"اے فلاسفر صاحبہ! کیا ہو رہا ہے؟"

"ارے آپ توقیر بھائی! کیسے ہیں؟" شرمین ایک دم ہی چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔" وہ کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئے۔

"میں کاپیاں چیک کر رہی تھی۔"

"لیٹ کر؟" توقیر احمد کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"نہیں......بس ذرا تھک گئی تھی تو کمر سیدھی کرنے لگی۔"

"اب کب تک کمر سیدھی کرو گی؟" اماں کی تیز آواز پر شرمین نے پلٹ کر دیکھا۔

"السلام علیکم، تائی جان!" توقیر، اماں کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"وعلیکم السلام!" اماں نے لٹھ مارنے کے انداز میں کہا اور شرمین سے مخاطب ہوئیں۔

"اُٹھو، چاول پکا لو رات کے لئے، دوپہر کا قیمہ کریلے اور دال پڑی ہے، آٹا بھی گوندھ لینا۔" اماں نے کہا تو وہ تنک کر بولی۔

"مجھے کاپیاں چیک کرنی ہیں۔ آپا سے کہیں۔ میرے پاس وقت نہیں۔"

"اے لو......اپنے غیروں سے بات کرنے کا وقت ہے، ذرا کچن میں جاتے موت آتی ہے۔" اماں نے کہا تو شرمین کو لگا جیسے ڈھیروں پانی اس پر پڑ گیا ہو۔ توقیر ان سنی کر کے مٹھو کے پنجرے کے پاس کھڑے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ تب ہی ابا میاں بھی مغرب کی نماز پڑھ کر آ گئے۔

"ارے توقیر میاں! کیسے ہو؟......کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں......سوچا، حرا کو دیکھتا جاؤں۔ اماں بھی کہہ رہی تھیں کہ پوچھتے آنا۔"

"کیا ہوا حرا کو؟" ابا میاں حیران تھے۔

"بخار ہو گیا تھا۔" اماں نے بتایا اور پھر توقیر سے مخاطب ہوئیں۔

"تمہیں بھیج دیا اماں نے، کیا ان کے مہندی لگی ہے؟ پوتی کو دیکھنے خود نہیں آ سکتی تھیں؟ دُور بیٹھے بس چونچلے کرنے آتے ہیں۔" اماں طنز سے باز نہ آئیں۔

"مہندی تو نہیں لگی، البتہ اماں کے گھٹنوں میں درد ہے، اس لئے نہیں آ سکیں۔" نہایت رسان سے توقیر نے جواب دیا۔ شرمین کو ان کے حوصلے پر حیرت تھی کہ کس قدر قوتِ برداشت تھی، اُن میں۔

"جاؤ بیٹا! توقیر کے لئے چائے تو بنا لاؤ۔" ابا بولے۔

"رہنے دیں، تایا ابو!" توقیر احمد بولے۔

"ارے بیٹا! تمہارے طفیل ہم بھی پی لیں گے۔" ابا میاں ہنسے اور دالان میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ شرمین نے اندر جاتے جاتے دیکھا تو توقیر احمد بھی ابا میاں کے پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔

پھر اس نے چائے بنائی، ساتھ ہی کباب بھی فرائی کر لئے تھے۔ اسے پتہ تھا، توقیر احمد آفس سے سیدھے آئے ہیں۔ پھر خالی چائے دینا اچھا نہ لگتا تھا۔

تب ہی اماں آ گئیں۔

"کباب تلنے ضروری تھے؟"

"اماں! آہستہ بولیں۔ توقیر بھائی سن لیں گے۔" شرمین گھبرائی۔

"تو سن لے۔ ان ہی مسٹنڈوں کے لئے بنا کر رکھتی ہوں؟"

"ان کا بھائی پیسے بھیجتا ہے۔" شرمین نے کہا۔

"نصیر اپنے بیوی بچوں کے لئے بھیجتا ہے۔ اور ادھر بھی تو ڈرافٹ آتے ہیں۔ تمہاری چچی سانپ بن کر بیٹھی ہیں، ہم تو نہیں جاتے کھانے۔" اماں باقاعدہ لڑ رہی تھیں۔

"پلیز اماں!" شرمین روہانسی ہو گئی اور ٹرے اُٹھا کر باہر آ گئی۔

ابا میاں اور توقیر احمد سیاست پر بحث میں مصروف تھے۔ شرمین نے سوچا، شکر ہے، توقیر بھائی نے اماں کی باتیں نہیں سنیں۔ مگر وہ سن بھی لیتے تو کیا کرتے۔

⊛......⊛......⊛

اسرار احمد، انوار احمد اور ابرار احمد تین بھائی تھے۔ بہن ایک ہی تھیں، خالدہ۔ سب ہی شادی شدہ تھے۔ اسرار احمد کے تمکین، سفیان، شرمین، مہرین، امبرین اور سبحان تھے۔ انوار احمد کی اولادوں میں نصیر احمد، توقیر احمد، طلعت اور مقدس تھیں۔ نصیر احمد کی شادی اپنے تایا کے گھر تمکین سے ہوئی تھی۔

نصیر شادی کے ڈیڑھ سال بعد دبئی چلے گئے تھے تو اسرار احمد کی بیگم یعنی صابرہ بیگم، تمکین کو میکے لے آئیں کہ جب اس کا میاں ہی گھر نہ تھا تو تمکین سسرال میں رہ کر کیا کرتی۔ پھر یہیں حرا پیدا ہوئی تھی اور اب حرا بھی دو سال کی تھی، مگر صابرہ بیگم نے بیٹی کو سسرال نہ بھیجا تھا۔ نصیر احمد سال بعد ایک ماہ کی چھٹی آئے تو تمکین سسرال گئی تھی۔ پھر میاں کے جاتے ہی میکے آ گئی۔

نصیر احمد کی بہن طلعت کی شادی حیدرآباد میں ان کے خالہ زاد محسن سے ہوئی تھی اور

وہ حیدرآباد میں رہتی تھیں۔ ابرار احمد کے صرف دو ہی بیٹے تھے۔ شعیب اور سیف۔ جبکہ خالدہ کی بڑی بیٹی نرگس تھی اور پھر تنویر اور منیر تھے۔

سب بھائی بہن شادی شدہ تھے اور اپنے گھروں میں خوش۔ اسرار احمد کی بیگم کی سسرال سے کبھی بھی نہ بنی تھی۔ زبان کی تیز تھیں اور کوئی بھی ان کی زبان کے تیروں سے محفوظ نہ رہتا تھا۔ انوار دُلہن رضیہ خاتون ان کی چچازاد تھیں، مگر صابرہ بیگم کی دیورانی سے کبھی نہ بنی۔

اصل میں وہ انوار کے لئے اپنی بہن نفیسہ کو لانا چاہتی تھیں، مگر بڑی بھابی کی زبان کی تیزی دیکھ کر انوار احمد نے اپنی ماں سے کہا تھا۔

''اماں! جب بڑی بہن ایسی ہے تو چھوٹی بھی ایسی ہی ہوں گی۔ میں یہاں شادی نہیں کروں گا۔ باقی جہاں چاہیں۔''

تب قرعہ رضیہ خاتون کے نام نکلا تھا اور وہ پہلے روز سے ہی رضیہ خاتون کے لئے شمشیر برہنہ رہیں۔ رضیہ خاتون بڑی صابر خاتون تھیں۔ کبھی پلٹ کر جیٹھانی کو جواب نہ دیا تھا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم تھا، سب اکٹھے رہتے تھے۔ اور رضیہ خاتون کے کاموں میں میخ نکالنا صابرہ بیگم کا کام تھا۔

پھر جب ابرار اور خالدہ کی بھی شادی ہوگئی تو وہ سب علیحدہ ہوگئے۔ پرانا مکان، ابرار کے حصے میں آیا تھا۔ جبکہ اسرار احمد اور انوار نے الگ گھر بنوائے تھے۔

یونہی وقت گزرتا رہا۔ بڑے بوڑھے اور بچے جوان ہوتے گئے۔ تب اسرار احمد نے ہی تمکین کا رشتہ نصیر احمد سے کر دیا کہ انہیں نصیر بہت پیارا تھا۔

انوار احمد کو اس میں کوئی اعتراض نہ تھا۔

اور یوں صابرہ بیگم کے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ شادی ہوگئی تھی۔ مگر رضیہ خاتون سے جو ایک چپقلش شروع سے آرہی تھی، اس نے انہیں چین نہ لینے دیا تھا۔

اور اس کا بدلہ انہوں نے یہ لیا کہ شادی کے بعد بھی تمکین اکثر ان کے پاس رہتی۔ ویسے بھی وہ ماں کی لاڈلی تھی۔

اسرار احمد کے کہنے کے باوجود بھی وہ بیٹی کو سسرال نہ بھیجتی تھیں۔ اسرار احمد چپ کر جاتے کہ وہ بہت کم گو اور صلح جو سے بندے تھے۔ انہیں لڑائی جھگڑے سے خوف آتا تھا، جبکہ صابرہ بیگم کا تو طرۂ امتیاز ہی لڑنا تھا۔

خاندان میں ان کی کسی سے بنی ہوئی نہ تھی۔ رضیہ خاتون سمجھتی تھیں، سمدھن بن کر

ٹھیک ہو جائیں گی۔ مگر کبھی عادتیں بھی بدلی ہیں جو ان کی عادتیں بدلتیں۔ نصیر احمد کو الگ بھگاتیں اور وہ ایسے کانوں کے کچے کہ ساس کی بات کا اعتبار کر کے ماں سے جھگڑ بیٹھتے۔ اور نصیر کے جانے کے بعد سے رضیہ خاتون کتنی مرتبہ بےعزتی کروا چکی تھیں، اپنے بیٹے کے دکھ نے انہیں ہائی بلڈ پریشر کا مریض بنا دیا تھا۔ مگر صابرہ بیگم ان کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہوتی تھیں۔

⊛......⊛......⊛

''اُف توبہ!''

گرمی کے مارے بری حالت تھی۔ لگتا تھا، آسمان آگ اُگل رہا ہو۔ لُو کے تھپیڑے چہرے کو جھلسا رہے تھے۔ وہ بس اسٹاپ پر ایک طرف کھڑی اپنے روٹ کی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسکول کی اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

''اتنی گرمی میں تو چھٹیاں دے دینی چاہئیں۔ کیوں مس شرمین؟'' مسز وقار نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں میڈم! اتنی گرمی میں تو بندہ نیم جاں ہو جاتا ہے۔''

''ہاں...... گھر جاؤ تو پھر جت جاؤ۔ ساس نندیں تو سمجھتی ہیں، ہم اسکول پڑھانے نہیں، تفریح کے لئے جاتے ہیں۔ کاش مجھے تو کوئی کہے، میں آج نوکری چھوڑ دوں۔'' مسز عابد نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''میری ساس بھی صرف ہانڈی پکا لیتی ہیں اور روٹیاں مجھے جا کر پکانی ہوتی ہیں۔ سچ، دوپہر کو تو کچن میں جانا یوں لگتا ہے، جیسے تنور میں جا پڑے ہو۔'' مسز وقار کو پھپھولے پھوڑنے کا موقع ملا۔

''تو تنور سے روٹیاں لگوا لیا کریں۔'' مسز حمید نے مشورہ دیا۔

''ہماری ساس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے؟ آخر بہو کس لئے ہوتی ہے؟'' مسز عابد جل کر بولیں۔ تب ہی مسز وقار کے روٹ کی بس آگئی اور وہ فوراً بس کی طرف لپکی تھیں۔

''تم اچھی ہوں، شرمین! ان جھنجٹوں سے تو جان بچی ہوئی ہے۔'' مسز عابد کا رخ اب اس کی طرف ہو گیا تھا۔

''ہاں بھئی، فی الحال اس معاملے میں، میں خوش قسمت ہوں۔ آپا اور اماں دوپہر کا کھانا تو تیار رکھتی ہیں اور...'' ابھی وہ کچھ اور کہتی کہ ایک موٹر سائیکل اس کے پاس آ کر رُکی۔

"ارے توقیر بھائی........!" وہ خوشی سے بولی۔

"ہاں........ میں گھر جا رہا ہوں۔ چلتی ہو؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ؟" شرمین نے کہا اور پھر مسز عابد سے بولی۔

"یہ میرے چچا زاد بھائی ہیں اور تمکین آپا کے دیور۔"

"اچھا، اچھا........ جاؤ تم۔ دھوپ سے تو جان چھوٹی۔" مسز عابد نے نہایت محبت سے کہا۔

شرمین نہایت سمٹ سمٹا کر توقیر احمد کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔" تھوڑا آگے جا کر توقیر احمد نے بائیک کی رفتار کم کر لی۔

"مجھ سے........؟" شرمین حیران تھی۔

"ہاں۔" وہ بولے۔

"تو گھر چل کر کر لیں۔" شرمین نے کہا۔

"گھر میں تو تمہاری اماں اور تمکین بھابی ہوں گی۔ اور وہ کب تمہیں میرے پاس بیٹھنے دیں گی؟"

"پھر........؟" شرمین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"یہیں کولڈ اسپاٹ سے جوس پیتے ہیں۔ پھر جو مجھے کہنا ہے، وہ کہہ دوں گا۔ ٹھیک ہے؟" انہوں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" شرمین نے سر ہلا دیا اور پھر توقیر کون سا غیر تھے جو اُسے ڈر لگتا۔

"بلوچ آئس کریم" پر اُس نے بائیک روکی اور وہ اندر آ گئے۔

"میں تو فالودہ کھاؤں گی۔"

"چلو، جو دل چاہے۔" توقیر احمد مسکرائے، پھر آرڈر دینے کے بعد کہنے لگے۔

"آج بہت گرمی ہے۔"

"جی ہاں۔ آپ کو کیا بات کرنی ہے؟ پلیز توقیر بھائی! آپ تمکین آپا کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔ وہ مکمل طور پر اماں ے قبضے میں ہیں، ان پر کسی کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ یقین کریں، جب اماں اور وہ چچی جان سے لڑتی ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔" وہ شرمندہ سی تھی۔

"یہ تو سب نصیر بھائی کی کمزوری ہے۔" توقیر احمد بولے۔

"بالکل صحیح کہا آپ نے۔ اور پھر ایک بار میں نے کہہ دیا تھا کہ آپ آپا کی بات پر آنکھ بند کر کے اعتبار نہ کیا کریں تو انہوں نے آپا سے کہہ دیا۔ یقین کریں، وہ گھر میں دنگل پڑا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اماں نے سو سو صلواتیں سنا دیں۔ اور تو اور نصیر بھائی کا فون سننے پر پابندی لگ گئی۔ پھر مجھے بھی شوق نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا، ذرا سی بات دل میں نہیں رکھ سکتے تھے؟"

شرمین نہایت دکھ سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے خلوص اور سادگی پر توقیر احمد مسکرا دیئے اور وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ نصیر بھائی کو سمجھائیں۔"

"انہیں سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں جو کچھ بھی کہتا ہوں، وہ فوراً تائی جان اور بھابی تک پہنچ جاتا ہے۔ اب تو میں نے بھی تمہاری طرح ان سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا، جب ہی اماں آپ کو دیکھتے ہی چراغ پا ہو جاتی ہیں۔" شرمین کو اماں کا اُکھڑا اُکھڑا انداز سمجھ میں آ گیا۔

"اب کھاؤ، تمہارا فالودہ گرم ہو جائے گا۔" توقیر احمد نے کہا تو اس نے گلاس اپنی طرف بڑھا لیا۔

"ویسے اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ایم۔اے کے فارم جمع کرا دیئے ہیں۔"

"بی ایڈ تو کر لیا نا؟" وہ بولے۔

"جی ہاں........ پچھلے سال کر لیا تھا۔ اب تو میں سیکنڈری اسکول میں آ گئی ہوں۔" وہ خوش خوش بتا رہی تھی۔

"گڈ........ ویسے کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، تم اور تایا ابا اس گھر میں مِس فٹ ہو۔"

"نہیں، ایسی تو بات نہیں۔" وہ بولی۔

"ہے ایسی بات۔" توقیر وثوق سے بولے۔

"ویسے سفیان اور سبحان بھی مختلف ہیں۔" شرمین نے بتایا۔

"یہ تو ہے۔" انہوں نے تائید کی۔

"اب سفیان ایم بی اے کے فائنل میں ہے، سبحان انٹر کر رہا ہے اور گھریلو سیاست کو وہ سمجھتے تو ہیں، مگر اماں کے سامنے بولتے نہیں ہیں۔ فضول کی ٹینشن اُن کی پڑھائی پر

اثر انداز ہوگی۔ گھر میں بھی کم ہی رہتے ہیں۔ سبحان کالج سے آتا ہے تو شام کو ٹیوشن پڑھنے چلا جاتا ہے۔ سفیان بھائی تو آتے ہی رات کو ہیں۔ رہی مہرین اور امبرین، وہ بھی اماں کے قریب ہیں۔"

"سفیان کوئی جاب کر رہے ہیں شاید؟"

"پتہ نہیں........کبھی پوچھا نہیں۔" شرمین بولی۔

"گھر کے افراد سے اتنی بے نیازی؟" توقیر بولے۔

"وہ خود ہی لئے دیئے رہتے ہیں۔" شرمین نے آہستہ سے کہا، پھر بولی۔ "ارے، دیر ہو رہی ہے۔ گھر چلیں۔"

"مگر میری بات۔" وہ بولے۔

"اوہ ہاں، جلدی سے کریں بات۔"

"تم........تم مجھ سے شادی کرو گی؟" ایک دم ہی توقیر احمد نے کہا تو شرمین کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"جی........جی........!"

"ہاں شرمین!"

"وہ........گھر چلیں۔" شرمین گھبرا رہی تھی۔

"میری بات کا جواب دو۔" وہ جواب چاہتے تھے۔

"کیا جواب دوں؟" وہ بولی۔

"تمہیں میرا ساتھ منظور ہے؟"

"یہ فیصلے ہمارے والدین کرتے ہیں، توقیر بھائی!" شرمین نے کہا۔

"تم اپنی رائے دو۔ والدین سے بھی بات ہو جائے گی۔" وہ بے پروائی سے بولے۔

"کون کرے گا؟" شرمین نے کہا۔

"میں خود۔"

"آپ کے گھر والے مان جائیں گے؟" شرمین نے پوچھا۔

"ان کو منانا میرا کام۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔ چچی جان کی جو پذیرائی ہوتی ہے ہمارے ہاں، وہ اس گھر سے دوسری بہو کبھی نہیں لیں گی۔" شرمین نے وثوق سے کہا۔

"یہ باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو، شرمین! میں نے اپنے ذہن میں اپنی شریک زندگی کے لئے جو تصویر بنائی ہے، اس پر تم پوری اُترتی ہو۔ یقین کرو شرمین! نصیر بھائی کی شادی سے پہلے ہی میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ یوں بھی اس وقت میں پڑھ رہا تھا اور وہ وقت مناسب نہ تھا بات کرنے کے لئے۔ میں چاہتا تھا، میری جاب وغیرہ ہو جائے تو تم سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ناپسند تم بھی مجھے نہیں کرتیں۔"

توقیر احمد نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس سے تو نظریں ہی نہیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ دل پسلیوں کے درمیان دُگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"تم سوچ لو۔ میں اماں سے بات کر لوں گا۔ میرے گھر والوں کی طرف سے تم پریشان مت ہونا۔ مجھے پتہ ہے، انہیں منانا مشکل ہے، مگر ناممکن نہیں۔ مگر ایک بات ہے۔" توقیر احمد نے جملہ ادھورا چھوڑا تو ان کے خاموش ہونے پر اس نے ایک دم ہی ان کی طرف دیکھا۔

"وہ...... بات یہ ہے کہ تم تمکین بھابی کی طرح اپنی اماں کے بہکاوے میں مت آنا۔" توقیر احمد بولے۔

"جی۔" وہ حیرت زدہ تھی۔

"ہاں، عاقبت نااندیش ماؤں کی بیٹیوں کے گھر اُجڑتے جلدی ہیں۔"

توقیر احمد کے لہجے میں زہر تھا۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی تھی مگر اسے پتہ تھا کہ توقیر احمد غلط نہیں کہہ رہے۔

"چلو چلیں۔ تم سوچ لو۔ تمہارے جواب پر ہی میں آگے بات بڑھاؤں گا۔" انہوں نے میز سے بائیک کی چابی اٹھائی اور باہر آ گئے۔

واپسی پر اسے توقیر کے ساتھ بیٹھتے ہوئے جھجک سی ہو رہی تھی۔ آتے ہوئے تو ایسا کچھ محسوس نہ ہوا تھا، مگر اب........مگر جانا بھی تو ضروری تھا۔ اور یوں بھی آج دیر ہو چکی تھی۔

واپسی پر ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ توقیر احمد نے اسے گھر سے دُور اُتارا اور پھر ہوا ہو گئے تھے۔ وہ انہیں جاتا دیکھتی رہی اور پھر طویل سانس لے کر گھر کی طرف چل دی۔

"السلام علیکم اماں!" گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اماں پر پڑی، جو مرغیوں کے کٹوروں میں پانی رکھ رہی تھیں۔

"اتنی دیر کر دی؟" وہ تیوریاں چڑھا کر بولیں۔

"پتہ ہے، دھوپ کی وجہ سے ٹریفک کم ہو جاتی ہے۔ اور آپ کورش کا تو پتہ ہے۔" اس نے بات بنائی اور اندر آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے فل اسپیڈ سے پنکھا چلایا تو ذرا جان میں جان آئی۔ پھر واش روم میں گھس گئی۔ چہرے پر خوب ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے تو چہرے پر تو ٹھنڈک محسوس ہونے لگی مگر آنکھیں ہنوز جل رہی تھیں۔

"تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

اُس کے قریب ہی سرگوشی اُبھری۔

"تمہیں میرا ساتھ منظور ہے؟"

پھر کوئی بہت نزدیک ہو کر بولا تھا۔

تب وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ توقیر احمد اسے کبھی بھی برے تو نہ لگے تھے۔ یوں بھی وہ سوبر سے توقیر احمد، جن میں کمال کا ضبط اور تحمل تھا، اماں کی کڑوی کسیلی باتوں کو کس طرح مسکرا کر برداشت کرتے تھے۔ ان کی برداشت پر کبھی کبھی تو شرمین کو بھی حیرت ہوتی۔ اماں کس طرح طعنے تشنے کرتی ہیں۔ مگر مجال ہے کہ کبھی آگے سے جواب دیا ہو۔ بلکہ بات بدل دیتے۔ یا پھر حرا کو لے کر گھر سے چلے جاتے۔ جب حرا واپس آتی تو ٹافی اور چپس کے پیکٹ اس کے ہاتھ میں ہوتے۔

"چاچو! اش کیم کھائی۔" وہ یونہی توتلی زبان میں بولتی تھی۔ تب اماں کہتیں۔

"اچھا، تمہارے چاچو نے کوئی احسان نہیں کیا۔ حق ہے تمہارا۔" اماں اس معصوم کو ڈانٹ دیتیں تو وہ سہم جاتی اور توقیر احمد مسکرا کر کہتے۔

"مجھے پتہ ہے کہ میرا فرض ہے۔ حرا ہمارے گھر کی پہلی منی سی خوشی ہے۔ اگر وہاں ہوتی تو سب اس کے لاڈ اُٹھاتے۔"

"کیوں یہاں بھوکوں مرتی ہے۔" اماں فوری کہتیں۔

"میں نے یہ کب کہا؟" توقیر احمد گڑبڑا جاتے۔

"میاں! تمہارا مطلب تو یہی تھا۔ اب بات کو جس قدر بھی گھما پھرا لو۔" اماں تنک کر کہتیں اور توقیر احمد کو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی اور ایسا اکثر ہوتا تھا۔

وہ ہمیشہ سوچتے۔ آئندہ وہ حرا کو نہیں لے جائیں گے۔ کچھ نہیں دلائیں گے۔ مگر جب آتے، بھتیجی کی محبت آڑے آتی اور لے کر کالونی کی مارکیٹ میں چلے جاتے اور واپسی پر

اماں کی بے بھاؤ کی سننی پڑتیں۔

اور اتنی عزت افزائی کے باوجود وہ اسی اماں کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے تھے، جنہیں وہ ایک آنکھ نہ بھاتے۔

آخر ایسی بھی کیا مجبوری ہے۔

مجھ میں کیا ہے؟

کہیں اماں سے انتقام کی خاطر تو مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟ پھر گن گن کر بدلے لیں۔ ناگ جیسا وسوسہ اُس کے ذہن میں در آیا۔

نہیں، توقیر بھائی ایسے نہیں ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ماں باپ کی غلطیوں کی سزا اولاد کو ملے۔ اور اگر ایسی بات ہوتی تو شاید مجھ سے "محبت کا کھیل" کھیلتے اور پھر دھتکار دیتے۔

اماں سے انتقام لینے کے اور تھوڑے طریقے ہیں؟

اپنے وسوسے کو اس نے خود ہی دُور کر دیا۔

"ویسے توقیر احمد کا ساتھ زندگی کو خوشگوار کر سکتا ہے۔"

اس نے سوچا اور پھر شرما گئی۔ اس کے چہرے پر دھنک اُتر آئی تھی اور آنکھوں میں جلن کی جگہ توقیر احمد کی شبیہ نے لے لی تھی۔

"شرمین! کیا کھانا نہیں کھانا؟" اماں کی کڑاکے دار آواز اُسے پھولوں کے دیس سے واپس لے آئی۔ بھوک تو نہیں تھی، مگر کھانا نہ کھانے سے جو ناگواری ہوتی، اسے بھگتنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

امبرین دسترخوان لگا چکی تھی۔ مہرین پھلکے بنا رہی تھی۔ جبکہ تمکین آپا، حرا کو دلیہ کھلا رہی تھیں۔

"کیسی ہیں آپا! بہنیں کالج، اسکول سے آ کر کام کریں اور یہ آرام سے بیٹھی رہتی ہیں۔"

"شرمین باجی! جلدی سے بتائیں، میں نے کریلے قیمہ کیسا بنایا ہے؟" مہرین نے پانی کا جگ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، بتاؤ بھئی اسے۔ آخر تم تو کچن ایکسپرٹ ہو۔" اماں بولنے سے باز کہاں آنے والی تھیں۔

"اور کیا شرمین باجی کا ٹیسٹ اور ابا میاں کا سب سے منفرد ہے۔" مہرین بھلا کہاں

چپ رہنے والی تھی۔

''اچھا بابا! چپ کرو۔'' شرمین نے اسے چپ کرایا۔ اماں اور تمکین آپا نے سالن اپنی پلیٹوں میں نکالا تو پھر شرمین نے بھی ڈونگا اپنی طرف سرکایا۔

یہ اس گھر کا اصول تھا کہ اگر سب گھر میں ہوتے تو پہلے ابا میاں کی پلیٹ میں اماں سالن ڈالتیں، پھر سفیان اور سبحان کو دیتیں، اس کے بعد تمکین آپا کا نمبر ہوتا، پھر باقی جو بھی لے لیتا۔ مگر جب گھر کے مرد دسترخوان پر نہ ہوتے تو اماں اور تمکین آپا پہل کرتیں۔

''بھئی واہ، مزا آ گیا مہرین! تمہارا انعام پکا۔'' شرمین نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''چپ کر کے کھانا کھاؤ، سر پہ کھڑی رہی ہوں تو پکایا ہے۔'' تمکین آپا تنک کر بولیں۔

''وہ تو آپ حرا کے لئے دلیہ بنا رہی تھیں۔'' مہرین منمنائی۔ ''ورنہ آپ اتنی گرمی میں اور کچن میں کھڑی ہوں۔''

''ہاں، ہاں......کام کی شوقین تو تم ہی ہو۔'' تمکین تڑخ کر بولی۔

اس سے پہلے کہ مہرین کچھ کہتی، شرمین نے اس کا ہاتھ دبا دیا اور ادھر اماں شروع ہو گئی تھیں۔

''شرم نہیں آتی، بڑی بہن سے زبان چلاتے۔ زبان کھینچ لوں گی۔'' اماں کا کہنا تھا کہ مہرین کھانا چھوڑ کر اُٹھ گئی۔ شرمین کے روکنے کے باوجود بھی وہ کمرے میں جا چکی تھی۔

''اماں! کیا تھا اگر وہ خوش ہو رہی تھی۔ اس کی حوصلہ افزائی سے اس کا دل بڑا ہو جاتا۔''

''ہاں، ہاں......تم فضول کی طرف داریاں کیا کرو۔''

''طرف داری کی بات نہیں۔ بچی ہے، دل رکھ لینے سے خوش ہو گی۔''

''بس، بی بی! تم ہی جھوٹ موٹ دل رکھا کرو۔ ہم سے یہ چونچلے نہیں ہوتے۔''

تمکین آرا منہ بنا کر بولیں اور شرمین نے خاموشی میں ہی عافیت جانی کہ توپوں کا رخ اس کی طرف ہو رہا تھا۔

تب ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''نصیر کا فون آ گیا۔'' تمکین آپا لپک کر اُٹھی تھیں۔

مگر دوسری طرف چچی جان تھیں۔ تمکین آرا کا موڈ ہی آف ہو گیا تھا۔

حرا سو رہی تھی۔

''بچوں کے سونے کا کوئی وقت تو نہیں ہوتا۔'' وہ انتہائی بدتمیزی سے بولیں۔

''کل تو نہیں، پھر کسی روز بھیجئے گا۔ کل ہم بڑے ماموں کے ہاں جائیں گے۔''

''پھر میں بتا دوں گی۔ خدا حافظ!'' تمکین آرا نے کھٹ سے ریسیور کریڈل پر رکھا۔

''ساس تھیں تمہاری؟'' اماں نے پوچھا۔

''جی ہاں، کہہ رہی تھیں، کل چھٹی ہے۔ وہ توقیر کو بھیجنا چاہ رہی تھیں، ہمیں لینے کے لئے۔'' تمکین نے بتایا۔

''کیوں؟'' اماں غرائیں۔

''حرا کے لئے اُداس ہیں۔''

''حرا کی ماں کے لئے اُداس نہیں ہیں؟'' اماں سلگ کر بولیں۔

''چھوڑیں اماں!......آپ چلی جائیں آپا! آخر ان کا بھی تو دل کرتا ہے، اپنے بیٹے کی اولاد سے کھیلنے کو۔'' شرمین نے کہا۔

''بس، تمہاری نصیحتیں شروع۔ بھئی میری مرضی، میں جاؤں یا نہ جاؤں اور اپنی بچی کو ملنے دوں یا نہیں۔''

''بڑے ماموں کے ہاں جانے کا کب پروگرام بنا؟'' امبرین نہایت اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''فون سنتے سنتے۔'' شرمین نے کہا تو آپا اسے خشمگیں نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

اور شرمین نے دسترخوان سے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔

⊛......⊛......⊛

دن یونہی پھیکے سے گزر رہے تھے۔ گرمیاں عروج پر تھیں اور ایسے میں توقیر احمد کا خیال اس کے سوچوں کے آسمان پر دھنک بکھیر دیتا۔ اس کی آواز تن من میں ٹھنڈک بن کر اُتر جاتی۔

توقیر احمد دو تین مرتبہ آئے تھے، مگر وہ ان کے سامنے نہ گئی تھی، بلکہ امبرین کے ہاتھ چائے بنا کر بھیج دی تھی۔

اس روز شام کو وہ پائپ لگا کر صحن دھو رہی تھی۔ اماں اور تمکین آپا، شکیلہ خالہ کے ہاں میلاد میں گئی تھیں۔ امبرین تو کل شام ہی سے گئی ہوئی تھی۔ مہرین اوپر چھت پر اپنے کل

کے پریکٹیکل کی تیاری کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

یہ مخصوص دستک تو وہ ہزاروں میں پہچان لیتی تھی۔ توقیر احمد کبھی بیل نہیں دیتے تھے، ہمیشہ دستک دے کر اندر آ جاتے۔ اسے اپنا حلیہ آج پہلی مرتبہ عجیب سا لگا۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار، جس کے پائنچے گیلے تھے، دوپٹہ کمر سے بندھا ہوا تھا، ایک ہاتھ میں جھاڑو اور ایک میں پائپ پکڑے وہ کھڑی تھی اور دروازہ کھلا ہونے کی بنا پر توقیر احمد اندر چلے آئے تھے۔

"السلام علیکم!" جھاڑو پھینک کر اس نے جلدی سے سلام داغا۔

"وعلیکم السلام، اچھی لگ رہی ہو۔" وہ مسکرائے۔

"وہ......میں نے سوچا، فرش ہی دھو ڈالوں۔" شرمین نے دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا۔ "چائے لاؤں؟"

"آج سب کہاں گئے؟" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"خالہ کے ہاں میلاد تھا، سب وہیں گئے ہیں۔ ابا دکان سے نہیں آئے، سفیان بھائی حسب معمول رات کو آئیں گے۔ سبحان ٹیوشن پڑھنے گیا ہے۔"

"چلو، تو پھر بات ہو سکتی ہے۔" توقیر احمد نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو اسے پسینے چھوٹ گئے۔

"میں آتی ہوں۔"

"پہلے بھی تم غائب رہتی ہو۔ پتہ ہے، کتنی بار آیا؟" وہ بولے۔

"جی......!" وہ کچھ نہ بول سکی۔

"بیٹھو اب۔ شرمانے کو عمر پڑی ہے۔" توقیر احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے لگا جیسے اس کی پوری ہستی جھٹکوں کی زد میں آ گئی ہو۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی، مگر توقیر احمد کی گرفت مضبوط تھی اور وہ کہہ رہے تھے۔

"سنو...... ہاتھ اس لئے پکڑا ہے کہ تم بھاگ نہ جاؤ۔"

"میں نہیں جاتی۔ آپ چھوڑیں نا۔"

"چھوڑنے کے لئے تو نہیں تھاما یہ ہاتھ۔" توقیر احمد کا لہجہ اور انداز ایک دم ہی بدل گئے تھے۔

"وہ دیکھیں نا......" مارے گھبراہٹ کے اس سے کچھ بولا ہی نہ جا رہا تھا۔

"کیا دیکھوں؟" وہ اس کی کیفیت کا مزا لیتے ہوئے بولے۔

"پلیز توقیر بھائی!" وہ روہانسی ہو گئی۔ اُس کی پریشانی سے حظ اُٹھاتے ہوئے ایک دم ہی انہیں اس پر ترس آ گیا۔

"اچھا......وہ جو کام کہا تھا، وہ تم نے کیا؟"

"کون سا کام......؟" نہایت حیرت سے اس نے توقیر احمد کو دیکھا اور پھر ان کی آنکھوں میں چمک سی دیکھ کر اسے کام یاد آ گیا۔

"دیکھیں......" شرمین نے کہنا چاہا۔

"دکھاؤ۔" وہ شوخی سے بولے۔ شرمین نے خود پر قابو پا لیا تھا اور نہایت رسان سے کہہ رہی تھی۔

"آپ نے سوچ لیا ہے؟"

"سوچا تھا تو تم سے بات کی تھی۔" توقیر احمد بولے۔

"اور آپ کے گھر والے......" شرمین نے کہنا چاہا۔

"یہ میرا مسئلہ ہے۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔

"کہیں......کہیں میرے ساتھ زیادتی نہ ہو۔"

"شرمین! تم میری محبت ہو، میری خواہش ہو۔ اور کوئی بھی اپنی محبت کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور نہ ہی کسی کو زیادتی کرنے دیتا ہے۔ مجھے گزرے چند دنوں میں احساس ہوا ہے کہ تم میری زندگی کی بہت بڑی خوشی ہو اور میں اسی خوشی سے اپنے دل کے ساتھ اپنا گھر بھی منور کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر دیر کاہے کی؟" شرمین بولی۔

"تمہاری اجازت درکار ہے۔" وہ مسکرائے۔

"میری طرف سے اجازت ہے، توقیر بھائی!"

"پلیز! بھائی تو نہ کہو۔" وہ منہ بنا کر بولے۔

"وہ......" شرمین گڑبڑا گئی۔ اور پھر ایک دم ہی اندر بھاگ گئی۔ توقیر احمد کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ گھر سے نکل آئے۔

⊕......⊕......⊕

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، توقیر!......میں اور صابرہ بیگم کی دوسری بیٹی بہو بنا کر لاؤں؟ گھاس کھا گئے ہو؟" رضیہ خاتون سلگ کر بولیں۔

"اماں! شرمین بہت مختلف ہے۔" توقیر بولے۔

"تمکین بھی مختلف ہی تھی، مگر دیکھ لو، اپنی اماں کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ اور تو اور مجھ سے بیٹا اور پوتی بھی دُور کر دیئے ہیں۔" رضیہ خاتون کی آواز بھرا گئی۔

"اماں! یہ میری خوشی ہے۔ کیا آپ کو بیٹے کی خوشی عزیز نہیں؟"

"میری جان!...... مجھے اولاد کی خوشی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ توقیر بیٹا! سوچو، مجھ میں دوسرا بیٹا گنوانے کا حوصلہ نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو، نصیر نے کس طرح آنکھیں پھیری ہیں۔ جو اسے ساس اور بیوی کہہ دے، وہی اس کے لئے حدیث۔ ہم جھوٹے۔"

"آپ کو مجھ میں اور نصیر بھائی میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔" توقیر احمد بولے۔

"شادی کے بعد تم بھی بدل جاؤ گے۔ صابرہ بیگم کو ہاتھ میں کرنے کے گُر آتے ہیں۔"

"پھر اتنے سال آپ ان کے ساتھ رہیں، آپ نے یہ گُر کیوں نہ سیکھے؟" توقیر نے شرارت سے کہا۔

"ہم تو بھئی خدا پر ہر بات چھوڑ دیتے ہیں۔"

"اچھا...... میرا مسئلہ تو حل کریں۔" توقیر نے کہا۔

"آخر ایسی کیا بات ہے، شرمین میں؟" رضیہ خاتون بولیں۔

"پتہ نہیں، اماں!...... مگر مجھے وہ پسند ہے اور یقین کریں وہ آپ کی بہترین بہو ہو گی۔ اور......"

"اماں! طلعت آپی آئی ہیں۔" مقدس نے کمرے میں آ کر اطلاع دی اور پھر پلٹ گئی۔

"اے ہے، طلعت آئی ہے۔" اماں باہر جانے کو تھیں کہ طلعت آپی بمعہ اپنے گول مٹول ٹیپو کے ساتھ اندر آ گئیں۔ توقیر نے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ٹیپو کو لے لیا۔ جب کہ طلعت، اماں سے لپٹ گئی تھیں۔

"پورے چھ ماہ بعد شکل دکھائی ہے۔ اب ایسی بھی کیا مصروفیت؟" اماں کا شکوہ محبت بھرا تھا۔

"بس اماں! محسن کو فرصت ہی نہیں ملتی اور نہ ہی چھٹی ملتی ہے۔ اب بھی آفس کے کام سے کراچی آ رہے تھے تو میں بھی چل پڑی۔"

"تو آپا! آپ ٹرین پر وہاں سے بیٹھ جایا کریں، یہاں پر توقیر بھائی اسٹیشن سے

لے آیا کریں گے۔ اب حیدر آباد زیادہ دُور نہیں۔" مقدس نے مسئلہ کا حل بتایا۔

"چل ہٹ۔ جیسے سہولت ہو، آئے جائے۔ بس گھر میں خوش رکھے اللہ۔"

اماں نے مقدس کو ڈانٹا اور طلعت کو دعا دی۔ تب ہی محسن بھی توقیر کے ہمراہ آ گئے تھے۔ اماں نے داماد کی بلائیں لیں اور پھر باہر آ گئیں کہ اب کھانے کا اہتمام بھی کرنا تھا۔ اور طلعت تھی کہ آتے ہی کام میں جت گئی۔

"اب گھر میں بہو ہوتی تو آتے ساتھ تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"چلیں اماں! کوئی میں غیر ہوں؟" طلعت محبت سے بولی۔

"بھئی ہو تو تم غیر۔" انہوں نے کہا۔

"اماں!" طلعت بچوں کی طرح ٹھنک کر بولیں تو اماں نے ان کی پیشانی چوم لی۔

"اب تمہارا وہی گھر ہے۔ یہاں تو تم مہمان ہو۔"

"اماں! پھر اس گھر کی یاد دل سے کیوں نہیں جاتی؟ یہاں کے مکینوں کی محبت ہر دم دل کو کیوں کسک میں مبتلا کرتی ہے؟ جب یہ گھر میرا نہیں تو یہ یاد کیوں آتا ہے؟ کوئی دن نہیں ہوتا، جب مجھے سب یاد نہ آئیں۔" طلعت نے کہا تو اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔

واقعی، میکے کی یاد تو عورت کے پلّو سے بندھی ہوتی ہے۔ یہ گرہ نہ کھلتی ہے اور نہ ہی ڈھیلی ہوتی ہے۔ عورت کے لئے میکہ ایک قلعہ ہے۔ کہتے ہیں، جس عورت کا جس قدر مضبوط میکہ، اُس کی سسرال میں اتنی ہی قدر ہو گی۔ اور یہ سچ بھی ہے۔

⊛......⊛......⊛

دوپہر کے کھانے کے بعد طلعت تو اماں کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ جبکہ محسن، توقیر احمد اور ابا جی (انوار احمد) کے ساتھ بیٹھک میں آرام کر رہے تھے کہ وہاں روم کولر تھا، جہاں دن کو چاندنی پر تکیے رکھ کر گھر کے مرد سو جاتے تھے۔

"اور اماں! کوئی نئی تازی......؟ نصیر بھائی کب آ رہے ہیں؟" طلعت نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ بولیں۔

"کیوں، فون نہیں آتا؟" طلعت نے کہا۔

"آتا ہے۔ مگر تب، جب ماں کی کھنچائی کرنی ہو۔" رضیہ خاتون مسکرائیں۔

"کیا مطلب؟"

"صابرہ بیگم کی عادت کا تو تمہیں پتہ ہے۔ پتہ نہیں، کیا کیا اسے کہتی ہیں اور وہ ادھر

چڑھائی کردیتا ہے۔"

"آپ بات کریں۔"

"ایک تو وہ غصے میں سنتا نہیں۔ تمہیں علم تو ہے اس کے غصہ کا۔ پھر پردیس میں ہے میرا بچہ۔ یونہی پریشان ہو، میں کچھ نہیں کہتی۔ آئے گا تو سب بات ہوگی۔" وہ بولیں۔

"پھر بھی اماں! زیادتی ہے، تائی کی اور بھابی کی۔" طلعت نے کہا۔

"چھوڑو بیٹا! میرا نصیب ہے۔ اور دوسرے کی سنو، شرمین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" رضیہ خاتون نے ہولے ہولے ساری بات بتادی۔

"کبھی نہیں۔" طلعت فوراً بولی۔

"میں نے بھی یہی کہا، مگر وہ مانتا ہی نہیں۔"

"کیوں نہیں مانتے؟ بھائی کو احساس نہیں ہے کہ پہلی بہو نے ہماری کیا درگت بنائی ہے۔ اب دوسری آئے گی تو گھر سے ہی نکال دے گی۔ اماں! اب چھوٹے بھائی کی سوچ سمجھ کر شادی کرنی ہے۔"

"وہ مانے، تب نا۔ اسے تو شرمین سے بہتر کوئی لڑکی نظر نہیں آتی۔ اور ویسے بھی شرمین سلجھی ہوئی تو ہے۔" رضیہ خاتون تعریف سے باز نہ آئیں۔

"رہنے دیں، اماں! شادی کے بعد وہ بھی بڑی بھابی کی طرح پَر پُرزے نکال لے گی، پھر......" طلعت نے ڈرایا۔

"اچھا، دیکھیں گے۔" رضیہ خاتون نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ جس کا مطلب تھا وہ اب سونا چاہتی ہیں۔

اور پھر یہ ہوا کہ جو توقیر احمد چاہتے تھے، وہی ہوا۔ رضیہ خاتون مان تو گئی تھیں، مگر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ پہلے وہ فون پر صابرہ بیگم سے بات کریں گی، پھر جائیں گی رشتہ لے کر۔"

اور اتنا ہی کافی تھا۔ توقیر احمد تو خوشی سے سرشار ہو گئے۔

⊕......⊕......⊕

حرا کے لئے نصیر بھائی نے سوتے جاگنے والی بڑی سی گڑیا بھیجی تھی۔ جو روتی تھی اور پھر کہتی تھی۔ "ما...... ما...... ما۔"

امبرین اور مہرین اس کے ساتھ لگی بیٹھی تھی، جبکہ اماں اور تمکین آپا اس خاتون کی آؤ بھگت کر رہی تھیں، جو دو روز قبل دبئی سے آئی تھیں اور آپا کے لئے ڈھیروں سامان لائی

تھیں، جو نصیر بھائی نے بھیجا تھا۔ وہ نصیر بھائی کے دوست یاسر کی والدہ عشرت جہاں تھیں۔

سوٹ پیس، کمبل، فوڈ فیکٹری اور حرا کے لئے کھلونے...... دو نگوں والے خوب صورت سیٹ۔

"میرا بیٹا یاسر اور نصیر ایک ہی کمپنی میں ہیں۔ نصیر مجھے بالکل یاسر کی طرح پیارا ہے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔

تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔

"شاید نصیر کا فون ہے۔" آپا کو ہر بیل پر نصیر بھائی کے فون کا گمان ہوتا تھا، خواہ وہ اسی وقت نصیر بھائی کا فون سن کر ہی بیٹھی ہوتیں۔

"چچی!...... چچی جان! السلام علیکم۔" آج شاید پہلی بار تمکین آپا نے ساس کی آواز سن کر محبت سے کہا تھا۔ یقیناً رضیہ خاتون حیران تھیں۔

"حرا کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ امبرین کے ساتھ کھیل رہی ہے۔" وہ بولیں۔

"ذرا اپنی اماں سے بات کراؤ۔" انہوں نے کہا۔

"اماں! آپ سے چچی جان بات کرنا چاہتی ہیں۔" تمکین کا لہجہ نرم تھا۔

"ہاں بھئی، خیریت تو ہے رضیہ!" اماں نے میٹھے لہجے میں کہا۔

"خیریت ہی ہے۔" وہ بولیں۔

"کیسے یاد کیا......؟"

"ایک بات کہنی ہے، بھابی! چھوٹا منہ، بڑی بات ہے، مگر کہوں گی نہیں تو کیسے پتہ چلے گا کہ شرف قبولیت ہے یا نہیں۔"

"کہو۔" اماں بولیں۔

"میں آنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا!"

"ہاں...... اپنے توقیر کے لئے شرمین کو مانگنے آنا چاہتی ہوں۔ یہ میرے توقیر کی خواہش ہے اور میری بھی خوشی ہے۔ پرانے جھگڑوں کو ختم کریں اور نئے رشتے قائم کریں۔ پھر میں کب آؤں؟" وہ محبت سے پُور لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"میں فون کر کے بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے......جیسے آپ کی مرضی۔" رضیہ خاتون نے کہا اور ادھر سے صابرہ بیگم نے فون بند کر دیا۔

مہمان خاتون بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں کہ انہیں کہیں اور بھی جانا تھا

"رات کا کھانا کھا کر جایئے گا۔" اماں بولیں۔

"پھر سہی۔"

"پھر کب آئیں گی؟" اماں محبت سے بولیں۔

"اِن شاء اللہ! جلد ہی آؤں گی کہ اب میں یہیں رہوں گی۔"

"کیوں؟"

"بھئی، وہاں سارا دن اکیلے رہنا پڑتا ہے۔ میں بوڑھی جان، میں نے تو یاسر کو کہہ دیا ہے، میاں! اپنا بندوبست کرلو۔ میں نہیں رہ سکتی تمہارے ساتھ۔"

انہوں نے ہنس کر کہا تو اماں بھی ہنس دیں اور پھر انہیں باہر آپا اور اماں سی آف کرنے گئی تھیں۔

⊛......⊛......⊛

شرمین، دری پر کاپیاں پھیلائے چیک کر رہی تھی کہ تب ہی اماں آندھی اور طوفان کی طرح لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں اور شرمین کو دو تھپڑ مارنے کے بعد گویا ہوئیں۔

"تو اس گھر میں میری ناک کے نیچے اس مردود توقیر سے عشق و معاشقی کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ ارے تُو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی؟...... مجھے ذلیل و خوار کرا دیا...... میری عزت مٹی میں رول دی۔"

"اماں! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ......" شرمین ہکا بکا تھی۔

"اور وہ جو تیرے سگے کی ماں کہہ رہی تھی، بیٹی کو قابو میں رکھو صابرہ بیگم! میرے بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ اس بھول میں مت رہنا کہ میں اسے بہو بنالوں گی۔ نکیل ڈال کر رکھو۔"

اماں تو نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں، شرمین کو لگ رہا تھا جیسے اس کے اوپر پتھروں کی بارش ہو رہی ہو...... اماں اسے لفظوں کے پتھروں سے سنگسار کر رہی ہوں۔

تمکین آپا بھی لفظوں کے تیر لئے آموجود ہوئیں۔

"تب ہی روز روز آتا تھا۔ بہانہ تھا حرا کو ملنے آتا ہوں اور معاملہ کچھ اور تھا...... بڑی بھاگ بھاگ کر اس کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ہم کام کہہ دیں تو فوراً فرصت نہیں ہے کا

راگ الاپا جاتا ہے۔"

آپا نے بھی مورچہ سنبھال لیا تھا اور شرمین کے لئے جائے امان تھی تو صرف اپنا کمرہ۔

"چچی جان نے ایسا کہا؟"

"ان کے منہ میں اماں کی زبان کیسے آگئیں؟"

شرمین کا تو سوچ سوچ کر ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے...... رشتہ نہ لاتیں۔ مگر مجھے یوں سرِ عام رسوا تو نہ کرتیں۔

چچی جان! مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی۔

کوئی گرم گرم چیز اس کے چہرے کو بھگونے لگی۔

اسے رضیہ خاتون ہمیشہ اچھی لگتی تھیں۔ دودھیا رنگت والی رضیہ خاتون، جن کے ہاتھ اتنے نرم تھے کہ شرمین گھنٹوں ہاتھ میں لے کر ان کے نرم لمس کو محسوس کرتی رہتی۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی، کبھی گالوں سے۔ اور پھر انہیں چوم لیتی۔ اور رضیہ خاتون اس کی محبت پر نثار ہو جاتیں۔

اور آج انہوں نے یہ سب کہا۔

میرے خدا!...... مجھے موت دے دے۔

میں کس طرح سب کے سامنے سر اونچا کر کے رہوں گی؟

کیسے جیوں گی؟

"چچی جان! آپ نے تو مجھے بے وقعت کر ڈالا۔ کیسا تیر میرے دل میں اُتارا ہے؟ نکالوں تو بھی تکلیف ہوتی ہے اور نہ نکالوں، تب بھی۔"

رات کے کھانے پر بھی نہ کوئی اُسے بلانے آیا، نہ اس کا جی چاہ رہا تھا۔

رات کو مہرین اور امبرین کمرے میں سونے کے لئے آئیں تو وہ بیڈ پر بیٹھی چھت کو گھور رہی تھی۔

"باجی......!" امبرین نے پکارا۔

"پلیز مہرین! سو جاؤ۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"آپ بھی تو سوئیں۔"

"میں سو جاؤں گی۔"

"ویسے ہے اماں کی زیادتی، انہوں نے......" امبرین نے کہنا چاہا تو وہ اس کی

بات کاٹ کر بولی۔

''امبرین! کچھ مت کہو۔ اماں کا قصور نہیں ہے۔ غلطی چچی جان کی ہے۔ اور پھر میرا کیا قصور، اپنے بیٹے کو سمجھاتیں۔ لے کے میرے بخیے اُدھیڑ دیئے ہیں۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''آپ کو کیا پتہ، اماں تو......'' مہرین نے کہنا چاہا۔

''رہنے دو، مہرین! اماں ہماری ماں ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں بہتر ہی سوچتی ہیں۔ اور وہ تو نصیر بھائی کے دوست کی والدہ نہ آئی ہوتیں تو چچی جان کو دن میں تارے دکھا دیتیں۔''

''وہ تو دکھا دیئے۔'' مہرین ہولے سے بولی۔ مگر شرمین نہ سن سکی۔

''اب سو جاؤ، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' اس نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔'' امبرین بولی۔

''بھوک نہیں ہے۔'' شرمین نے چہرے تک چادر اوڑھ لی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

⊛......⊛......⊛

ساری رات پریشانی کی وجہ سے اسے نیند نہ آئی تھی، بلکہ بار بار چچی جان کے جملے، جو اماں کی زبان سے سنے تھے، اس کا کلیجہ چھلنی کرتے رہے تھے۔

آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگتا رہا تھا۔

صبح اُٹھی تو پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ آنکھیں بھی بوجھل سی تھیں۔ ہمت کر کے اُٹھنا چاہا تو چکر آ گیا اور وہ پھر لیٹ گئی۔

صبح ناشتہ کی ذمہ داری اُسی کی ہوتی تھی، مگر آج تو لگتا تھا، ہاتھ پاؤں میں جان ہی نہ ہو۔

مہرین اور امبرین نہ جانے کب اُٹھ کر باہر جا چکی تھیں۔ شاید کالج جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

''اے بی! کب تک ناکام محبت کا سوگ مناؤ گی؟ اب اٹھ بھی جاؤ۔'' اماں نے کمرے میں آ کر پھر باتیں سنانا شروع کیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہ بولی۔ تب وہ آگے بڑھیں، بازو پکڑ کر اٹھانا چاہا تو لگا جیسے انگارہ چھو لیا ہو۔

''اُوئی، تمہیں تو بہت تیز بخار ہے......کوئی گولی لی؟'' انہوں نے پوچھا۔

شرمین نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''لو، کچھ کھایا ہو تو گولی بھی لو۔ میں ابھی لاتی ہوں، تمہارے لئے دودھ ڈبل روٹی۔ کھا لو تو پھر گولی دوں گی۔'' اماں کا لہجہ ایک دم ہی ریشم ہو گیا تھا۔ شرمین اماں کے بدلتے رنگوں پر حیران تھی۔

پھر اماں گرم گرم دودھ اور سلائس لے آئی تھیں، جو اس نے اماں کے خوف سے کھا لئے۔ ورنہ دل تو نہ چاہ رہا تھا۔ اور اماں اس کے پاس بیٹھی محبت سے کہہ رہی تھیں۔

''دل پہ نہ لو، اپنی چچی کی بات کو۔ یہ شروع ہی سے ایسی ہے۔ میں نے یونہی قدم پیچھے نہیں کر لئے۔ اگر یاسر کی ماں نہ بیٹھی ہوتی تو وہ سناتی کہ یاد رکھتیں۔ تمہارے لئے رشتوں کی کیا کمی ہے، توقیر جیسوں کو تو میں اپنی چندا کی اُنگلی بھی نہ دیکھنے دوں۔ پتہ نہیں، خود کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں پاگل ہوں، جو اپنی پھول جیسی بچی کو دوزخ میں دھکیل دوں۔ وہ تو رشتہ مانگتی بھی تو میں نہ دیتی۔'' اماں بول رہی تھیں۔

اور شرمین کی سماعتوں میں ٹھنڈک اُترتی جا رہی تھی۔

''میں ناحق اماں سے ناراض ہوتی ہوں۔ اماں دل کی کتنی صاف ہیں۔ اور ایک چچی جان۔'' اس کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی اور اسے چچی جان کے علاوہ توقیر سے بھی بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔ ''اب سامنے تو آئیں، میں کیا حشر کرتی ہوں۔''

اماں نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں، مگر وہ وہاں کب تھی؟

''اسکول سے چھٹی کر لو۔ درخواست لکھ دو، میں سبحان کو دے دیتی ہوں۔ تم آرام کرو۔'' اماں نے اُسے کاپی اور پین اٹھا دیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ یوں بھی وہ بھلا جا کب سکتی تھی؟ اور وہ درخواست لکھنے لگی۔

⊛......⊛......⊛

شرمین چھٹی ہونے پر اسکول سے نکلی ہی تھی کہ سامنے توقیر احمد بائیک سے ٹیک لگائے کھڑے نظر آئے۔

وہ پورے تین روز بعد آج ہی اسکول آئی تھی اور ابھی وہ توقیر احمد کا سامنا نہ کرنا چاہتی تھی مگر وہ سامنے آ گئے تھے تو پلٹنا بھی اچھا نہ تھا۔

''جو بھی ہونا ہے، ہو جائے۔ میں انہیں سنا تو دوں۔''

وہ جو اتنے دنوں کی کھولن تھی، وہ پھر خون کو تپانے لگی تھی۔

''میرے ساتھ چلو۔'' توقیر احمد اس کے قریب آ کر بولے۔ موڈ ان کا بھی آف تھا۔

شرمین نے انکار نہ کیا اور ان کے پیچھے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک پارک میں موجود تھے۔

''مجھے ایک بات بتاؤ، تمہاری اماں کو ہمارے گھرانے کی بے عزتی کرنے کا خدا کی طرف سے پرمٹ ملا ہوا ہے؟'' توقیر احمد بہت غصہ میں تھے۔

''انہیں پرمٹ ملا ہوا ہو یا نہیں، مگر چچی جان نے میرے ساتھ زیادتی کیوں کی؟ انہوں نے مجھے اتنی پستی میں کیوں دھکیلا؟'' شرمین دکھ سے بولی۔

''کیا، کیا ہے اماں نے؟'' توقیر احمد نے اسے دیکھا۔

''کیا نہیں کیا؟...... میں تو چچی جان کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے اماں سے کہا، اپنی بیٹی کو قابو میں رکھو۔ میرے بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ میں نے آپ سے کچھ کہا کیا؟'' وہ جو غصے سے بات کرنا چاہ رہی تھی، لڑنا چاہ رہی تھی، ایک دم ڈھے گئی۔

''اماں نے یہ بات کہی؟'' توقیر نے پوچھا۔

''ہاں!'' شرمین بولی۔

''نہیں شرمین! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہاری اماں نے غلط بیانی کی ہے کہ......''

''انہوں نے غلط بیانی نہیں کی۔'' شرمین ان کی بات کاٹ کر بولی۔ ''جب...... جب چچی جان کا فون آیا، میں بھی موجود تھی۔ اماں تو ہکا بکا تھیں، کچھ بول ہی نہ سکیں۔''

''یہ ممکن ہے۔'' وہ مان نہ رہے تھے۔

''ہاں۔ اس روز ممکن تھا کہ نصیر بھائی کے دوست کی والدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں صرف ہوں ہاں کرتی رہی تھیں اور......'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

''تم یقین کرو گی، تم ابھی بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔'' توقیر احمد بولے۔

''کیسی غلط فہمی؟'' وہ چیخ پڑی۔

''شرمین! میں خود موجود تھا، جب اماں نے فون کیا۔ انہوں نے تو بہت محبت سے بات کی تھی، بلکہ اماں خود حیران تھیں کہ تائی اماں کے اندر نرمیاں کہاں سے آ گئیں۔''

''میری اماں جھوٹ کہتی ہیں؟'' شرمین نے پوچھا۔

''ہاں!'' توقیر احمد بولے۔

''شٹ اپ، توقیر احمد!'' شرمین ایک دم ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اپنی ماں کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی۔ میں جا رہی ہوں...... آئندہ نہ مجھ سے ملنا اور نہ ہی

ہمارے گھر آنا۔''

''تمہاری بات پر عمل ہوگا، شرمین آرا!...... مگر ایک بات میری بھی سن لو اور وہ یہ کہ محبت میں اعتماد پہلی شرط ہوا کرتا ہے۔ تم نے مجھ پر اعتبار نہ کیا، میری محبت کا خون کر دیا۔ مجھے دکھ تو یہ ہے کہ تم وہ نہیں جو میں نے سمجھا تھا۔ اور شکر ہے، وقت سے پہلے مجھے پتہ چل گیا، ورنہ نصیر بھائی جیسا حشر میرا ہوتا۔ سنو شرمین! اس روز جب اماں نے بات کی تو تمہاری ماں نے ہوں، ہاں میں جواب دیا تھا، مگر صرف پندرہ منٹ بعد انہوں نے وہ دھواں دھار تقریر جھاڑی کہ میری اماں کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جبکہ وہ تو طلعت کے ساتھ دوسرے روز تمہارے ہاں آنے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ تمہاری ماں نے جھوٹ موٹ نرمی سے بات کی اور میری بھولی ماں اسے سچ سمجھ بیٹھی اور چند لمحوں کی خوشی تائی نے یوں ملیامیٹ کی کہ اماں کا بی پی ایک دم شوٹ کر گیا۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔ میں تو صرف تم سے مل کر تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہارے والد نے کہا تھا، اگر شرمین راضی ہو تو وہ نکاح کر دیں گے اور بعد میں تمہاری اماں کو منا لیں گے، مگر......'' وہ خاموش ہو گئے۔

''مگر کیا؟'' شرمین جو حیرت سے سب سن رہی تھی، ان کے رکنے پر ایک دم بولی۔

''مگر اب نہیں۔ ہاں شرمین! اب نہیں۔ اب تم سونے کی بن کر بھی آ جاؤ تو میرے دل میں وہ جگہ نہیں پا سکتیں، جہاں سے ابھی تھوڑی دیر قبل تم گری ہو۔ اور مجھے یقین ہے، تم بھی پستی میں رہنا نہیں چاہو گی۔ اور میری ایک بات یاد رکھنا کہ کبھی کسی پر آنکھ بند کر کے اعتبار نہ کرنا، خواہ وہ ماں ہی ہو۔ پتہ نہیں، وہ کس کی کون سی بات کا انتقام اولاد سے کس وقت لے لے۔ ساری مائیں تائی جیسی نہیں ہوتیں، مگر جو مائیں تائی جیسی ہوتی ہیں، ان کی بیٹیوں کو خود اپنی زندگی جینا چاہئے۔ کبھی اپنی ماں کی بات کا اعتبار نہ کرنا، شرمین آرا! ورنہ تمکین کی طرح تمہارا گھر بھی نہ بس سکے گا۔ نصیر بھائی کے دل میں تمکین کے لئے جگہ ہو گی، مگر ہمارے گھر کے کسی فرد کے دل میں تمکین کے لئے ذرہ بھر بھی جگہ نہیں ہے۔ اب بتاؤ، میرے ساتھ چلو گی یا خود جاؤ گی؟'' وہ بولے۔

''توقیر! آپ......'' شرمین نے کہنا چاہا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

''بس، کچھ نہیں بچا شرمین! اب نہیں۔ میں جو فیصلہ ایک بار کر لیتا ہوں، اس پر ڈٹ جاتا ہوں۔ اصولوں پر سودے بازی نہیں کر سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا انتخاب غلط تھا۔ بس بھول جانا کہ کسی توقیر احمد نے تم سے محبت کی تھی۔''

شرمین نے دیکھا، اس کا چہرہ پتھر کی مانند تھا اور شرمین کچھ نہ بولی۔ اسے پتہ تھا کہ پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود ہی بندہ زخمی ہوتا ہے۔ پتھر کا کیا بگڑتا ہے۔

وہ اپنے روٹ کی بس سے گھر آ گئی تھی اور آتے ہی کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

اماں سمجھ گئی تھیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ مگر وہ بھلا کب ہار ماننے والوں میں سے تھیں۔ وہ کمرے میں آئیں تو شرمین پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے؟ کھانا نہیں کھانا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بھوک نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''وجہ؟'' اماں نے پھر کہا۔

''بس اماں! میرا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ خون کے رشتے اتنے ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں؟'' اس نے گھائل نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''میں نے جو کیا، تمہاری بہتری......''

''مت کریں بات میری بہتری کی۔'' وہ چیخی۔

''جہنم میں دھکیل دیتی تمہیں؟''

''نہ قبول کرتیں توقیر کا رشتہ، مگر چچی جان کو بے عزت کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں تھا۔ آپ نے تو مجھے جیتے جی مار دیا۔ آپ کو اندازہ ہے، آپ نے کیا، کیا ہے؟''

''جو میرا جی چاہے گا، میں کروں گی۔'' اماں اپنے کیے پر شرمندہ نہ تھیں۔

''بے شک، آپ وہی کریں، جو آپ کا جی چاہے مگر اولاد کو تو بخش دیں۔ مجھے آپ نے کیوں ذلیل کیا؟ میں نے تو نہایت مان سے توقیر سے کہا میری ماں غلط نہیں کہہ سکتی، مگر......''

''بکواس مت کرو۔ سیدھی طرح آؤ، کھانا کھانا ہے تو کھا لو، ورنہ مناؤ سوگ، چچی اور توقیر کا۔'' اماں تن فن کرتی چلی گئیں اور شرمین تکیوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

آج تو اس دن سے بھی زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔ توقیر احمد کا ایک ایک لفظ تلوار کی انی بن کر پورے وجود میں گھب رہا تھا۔

کاش! میں تمہاری نظروں میں اتنی بے وقعت نہ ہوتی۔

کاش توقیر احمد! میں پہلے تمہاری بات سن لیتی۔

اور......اور تمہارے کہے پر اعتبار کرتی۔

میں نے اماں کے صرف تین روز کے محبت بھرے ڈرامے کو حقیقت جان لیا اور اپنا

سب کچھ ہار بیٹھی۔

کیا ماں ایسی بھی ہوتی ہے؟

میری ماں نے تو مجھے ننگے پاؤں صحرا کی تپتی ریت پر چلا دیا ہے، جہاں حدِ نظر گرم ریت ہے، اور کچھ بھی نہیں۔

کہاں ہے میری منزل؟

کون سی جائے پناہ ہے؟

کاش اماں! آپ ایسا نہ کرتیں۔ میں معتبر تو رہتی۔ آپ نے تو مجھے توقیر احمد کے قدموں کی خاک بھی نہ رہنے دیا۔

وہ بلند آواز سے سر پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ امبرین اسے اس طرح روتے دیکھ کر مہرین کو بلا لائی تھی اور وہ روئے جا رہی تھی۔

''باجی!......باجی!'' مہرین نے اسے لپٹا لیا اور وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں لٹ گئی......میں رُل گئی......ارے میرا مول تو ایک رتی بھی نہ لگا۔ مہرین! میں کتنی بے وقعت ہو گئی ہوں......بے اعتبار ہو گئی ہوں۔ ابھی تو میرے دل کے آنگن میں محبت کی کونپلیں پھوٹی تھیں اور میں نے خود ہی انہیں مسل دیا۔ میری سوجھ بوجھ کہاں چلی گئی تھی؟''

''باجی! ہم تو اسی روز آپ کو بتانا چاہ رہے تھے کہ اماں نے چچی جان سے کیا سلوک کیا، فون پر جو انہیں بے بھاؤ کی سنائی ہیں، آپ سنتیں تو یقیناً بے ہوش ہو جاتیں۔ مجھے یقین ہے، چچی جان اتنی دکھی کبھی نہ ہوئی ہوں گی، جس قدر اس روز ہوئی ہوں گی۔ توقیر بھائی کو بھی انہوں نے کیا کچھ کہا۔ تمہارا بیٹا چھچھورا......گھروں میں نقب لگانے والا۔ بس پتہ نہیں، کیا کیا۔'' مہرین اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''آپ نے ہماری سنی ہی نہیں۔'' امبرین نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم مجھے زبردستی بتا دیتیں۔ میں اس طرح تنکے سے بھی ہلکی تو نہ ہوتی۔ وہ بھی توقیر احمد کے سامنے۔ اُن کی نظر میں تو میں سب سے مختلف تھی۔ انہوں نے واقعی مجھے چاہا، جس طرح چاہا جاتا ہے۔ تب ہی تو آنکھ بند کر کے میرے بارے میں کیا کچھ سوچ لیا اور سب اچھا ہی سوچا۔'' شرمین ہچکیوں کے درمیان بولی۔

''آپ بات تو کریں۔'' امبرین نے کہا۔

''اب کچھ نہیں بچا......میں نے تو ان کے خوابوں کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔ آج تو

میں نے اماں کی زبان بولی ہے اور........"

"آپ کہیں، غلط فہمی ہو گئی تھی۔" امبرین معصومیت سے بولی۔

"میں اب خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ ان کے سامنے جاؤں۔" شرمین کو اپنے چاروں طرف دیواریں نظر آ رہی تھیں۔

"میں توقیر بھائی سے بات کروں گی۔" امبرین سے بہن کے آنسو نہ دیکھے جا رہے تھے۔

"تم کوئی بات نہیں کرو گی۔" وہ بولی۔

"کیوں آخر آپ کی زندگی جہنم ہو جائے؟" امبرین نے کہا۔

"یہ جہنم میں نے خود خریدا ہے........ مجھے جلنے دو........ راکھ ہو جانے دو۔"

شرمین نے گھٹنوں میں ٹھوڑی ٹکا دی۔ وہ چھوٹی بہنیں اس کے لئے بے تحاشا پریشان تھیں اور اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھیں، مگر کر نہ پا رہی تھیں۔

"باجی! مجھے یقین ہے، توقیر بھائی آپ کو معاف کر دیں گے۔"

"نہیں مہرین! مجھے پتہ ہے، وہ کس قدر مضبوط قوتِ ارادی کے ہیں۔ وہ اپنا نقصان کر لیں گے مگر اپنے اصول سے نہیں ہٹیں گے۔ انہوں نے مجھے دھتکارا ہے۔ اگر وہ مجھ پر تھوک بھی دیتے تو مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا ہے، صحیح ہے۔ مجھ جیسی عقل کی اندھی کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔"

"مگر کیوں؟ آخر غلط فہمی تو ہو جاتی ہے۔" مہرین چیخ پڑی مگر وہ بولتی رہی۔

"میں نے بھی تو اماں کی بات مان لی، اماں کی عادتیں جاننے کے باوجود بھی کہ وہ شروع سے ایسی ہیں۔ کبھی کسی کے ساتھ مل کر نہیں رہیں اور........ اور میں نے اماں کی بات مان لی۔ کتنی بے وقعت ہو گئی ہوں میں۔" شرمین ہنس دی۔

"پلیز باجی! اس طرح مت ہنسیں۔" امبرین نے اسے لپٹا لیا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

پہلی پہلی محبت کا احساس دل میں جب جاگتا ہے تو بڑے روپہلے خواب آنکھوں میں اُتر آتے ہیں۔

آنگنِ دل میں محبوب کی آہٹوں کا گمان رہتا ہے۔

ہر طرف پھلواریاں نظر آتی ہیں۔

اس کے سارے خواب راکھ ہو گئے تھے۔

محبوب نے ایک دم ہی قدم موڑ لئے تھے اور محبت کی پھولوں بھری بگھیا میں آگ لگ گئی تھی تو وہ روتی بھی نہ؟

اور پھر روتے روتے شاید وہ تھک گئی تھی کہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ پھر اس سہ پہر جب اماں اور آپا سو گئی تھیں تو امبرین نے سب سے چھپ کر توقیر احمد کا نمبر ڈائل کیا، وہ آفس ہی میں تھے۔

"ہیلو توقیر بھائی! میں ہوں، امبر۔"

"کیسی ہو گڑیا؟"

"اچھی ہوں، توقیر بھائی! ایک بات کرنی ہے۔"

"شرمین کے بارے میں کوئی بات نہیں۔"

"پلیز توقیر بھائی! میری بات تو سنیں۔"

"وہ بات سننے کا فائدہ، جس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے؟" توقیر احمد کا لہجہ پتھریلا تھا۔

"باجی کو غلط فہمی........" امبرین نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"کچھ بھی ہے امبرین! مگر اب وہ میرے دل سے اتر گئی ہے۔ ایسی عاقبت نا اندیش لڑکی میری بیوی نہیں بن سکتی، جس کی اپنی سوچ نہ ہو، جو دوسروں کی باتوں پر عمل کرے۔"

"کیا گارنٹی ہے کہ کوئی لڑکی جو آپ کی بیوی بنے، اس میں یہ عادات نہ ہوں؟" امبرین بحث کر رہی تھی۔

"وہ میری پسند تو نہ ہو گی۔"

"محبت کرنے والوں کے دل تو بہت بڑے ہوتے ہیں، توقیر بھائی! آپ کی کیسی محبت ہے جو اتنی سی بات کو اگنور نہیں کر رہے؟"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے امبر گڑیا! تم نہیں سمجھو گی۔ ابھی چھوٹی ہو۔"

"جی نہیں........ میں نہ چھوٹی ہوں اور نہ ہی ناسمجھ۔" اُسے غصہ آ گیا۔ اُسے کوئی چھوٹا کہتا تو وہ غصہ میں آ جاتی کہ وہ تھرڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ یہ اور بات کہ لگتی تھی، جیسے سیکنڈری کلاس میں ہو۔

"اچھا بڑی بی! میں نے کہا نا کہ میں چھوڑے ہوئے رستوں پر نہیں چل سکتا۔" توقیر احمد نے رسانیت سے کہا۔

"سوچ لیں کہ پھر پچھتائیں۔"

"میں اپنے کسی فیصلے پر کبھی نہیں پچھتایا۔ اور یہ تو میری زندگی کا فیصلہ ہے، جسے میں وقتی جذبات کی نذر نہیں کر سکتا۔"

"آپ کو دکھ نہیں ہوا؟"

"ہوا ہے دکھ۔ راستہ بدلنے کا دکھ ہوا ہے۔ مگر گڑیا! اس نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ کیا وہ ماں کی عادات سے واقف نہ تھی؟........ بس یہی بات میں برداشت نہیں کر سکا۔ یا تو ماں کی یہ عادات نہ ہوتیں۔"

"کوئی راہ........"

"کوئی راہ نہیں۔ اب شرمین میری سوچ بھی نہ ہوگی، دل تو دُور کی بات ہے۔ میں وہ شخص ہوں، جو فیصلہ کرتا ہوں، اس پر ڈٹ جاتا ہوں۔ مجھے علم تھا کہ شرمین کا نام لینے پر میرے گھر والے مشکل سے مانیں گے، مگر میں نے اماں کو منا لیا۔ طلعت نے انکار کیا، اسے بھی منایا کہ مجھے خود پر یقین تھا۔ مگر شرمین کو مجھ پر یقین نہ تھا۔ تُف ہے ایسی محبت پر۔ اس طرح گر گر کر تو میں محبت نہیں کر سکتا۔ اب اس سے کہو، رونے دھونے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اپنے ہاتھوں سے جب کوئی کھلونا توڑا جائے تو دکھ نہیں کرنا چاہئے۔ اب نہ وہ میرے دل میں ہے، نہ ذہن میں اور نہ ہی دعاؤں میں........ اللہ حافظ!"

توقیر احمد کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ امبرین کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ہولے سے ریسیور رکھ کر پلٹ کر دیکھا تو شرمین اس کے قریب ہی سانس روکے کھڑی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں اتنی حسرت اور دکھ تھا کہ امبرین کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ آگے بڑھی اور شرمین کو لپٹا کر بولی۔

"باجی! توقیر بھائی آپ کے مقدر کا ستارہ نہ تھا۔"

اور پھر شرمین کے ساتھ خود بھی رو دی۔

⊛......⊛......⊛

پرکھنا مت، پرکھنے سے کوئی اپنا نہیں رہتا
کبھی بھی آئینے میں دیر تک چہرہ نہیں رہتا

توقیر احمد اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے باہر آسمان کی وسعتوں میں نجانے کیا تلاش کر رہے تھے۔

کئی روز سے وہ تایا کے گھر بھی نہ گئے تھے، بلکہ اب تو وہاں جانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ نہ حرا سے ملنا چاہتے تھے۔ اور نہ ہی شرمین کو دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔

پہلے کس طرح وہ آفس سے اُٹھ کر کشاں کشاں، تایا ابا کے ہاں پہنچ جاتے۔ کبھی سوچتے۔

"آج نہیں جاؤں گا۔" مگر شام کو اسی دروازے پر موجود ہوتے۔

تائی اماں کی کڑوی کسیلی باتوں کو وہ میٹھا گھونٹ بنا کر پی جاتے اور صرف شرمین کی خاطر۔

وہ اعتماد سے بات کرتی ہوئی لڑکی انہیں نجانے کب سے اچھی لگتی تھی۔

جس کی آنکھوں میں وفا کے دیے روشن نظر آتے تھے۔

وہ انہیں اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

سوچتے تھے، اس کے سنگ زندگی کس قدر خوشگوار ہوگی۔

انہیں پتہ تھا کہ اپنے گھر میں اس کے بارے میں بات کر کے اتنا ہنگامہ ہوگا۔ مگر وہ جانتے تھے، جیت ان کی ہوگی۔

اور وہ، جو ہر مقام پر جیتتے آئے تھے۔

ہارے بھی تو کس سے........ جو اُن کے دل کی مکیں تھی۔

سوچوں میں بستی تھی۔

خیالوں کی دنیا اس سے آباد تھی اور........

اسی سے وہ ہار گئے۔

دل ہارا تھا، پھر اپنا مستقبل بھی ہار دیا۔

"توقیر!" رضیہ خاتون کی آواز انہیں خیالوں سے کھینچ لائی۔

"جی اماں!" وہ ایک دم پلٹے۔ "آپ کیوں آئیں؟ مجھے بلوا لیتیں........ خیریت؟"

"لیٹے لیٹے تھک گئی تھی۔ اب تو میں ٹھیک ہوں، تم لوگ مجھے مریض بنائے ہوئے ہو۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"اللہ آپ کو صحت دے، اماں!" وہ ماں کے قریب ہی نیچے بیٹھ گئے۔

"اوپر بیٹھو۔" انہوں نے توقیر احمد کو اٹھانا چاہا۔

"نہیں اماں! آپ کے قدموں میں سکون ملتا ہے۔" انہوں نے اپنا سر ماں کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ ان کا دکھ رضیہ خاتون کا کلیجہ چیر رہا تھا۔

"توقیر!"

"جی اماں!" وہ ہولے سے بولے۔

"بیٹا! خود پر جبر کیوں کر رہے ہو؟"

"کیا مطلب، اماں؟" انہوں نے سر اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"محبت کے بچھڑنے کا دکھ اس کائنات کا سب سے بڑا دکھ ہے۔ میں جانتی ہوں، تم......" رضیہ خاتون نے کہا۔

"پلیز اماں! بھول جائیں کہ آپ نے کچھ کہا تھا، اپنی پسند کا اظہار کیا تھا، بھلا دیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"تم بھول گئے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جھوٹ نہیں بولوں گا، مگر ففٹی پرسنٹ بھول گیا ہوں۔"

"پھر دعویٰ کرو گے کہ مکمل بھول گئے ہو۔ مگر وہ جو ایک داغ رہ جائے گا، کلیجے پر تپتا ہوا، انگارے جیسا داغ، اُس کا کیا کرو گے، جو تا عمر سلگائے گا تمہیں؟" رضیہ خاتون ان کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگیں۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا......آپ مطمئن رہیں۔"

"تم معاف نہیں کر سکتے اپنی تائی کو؟"

"ممکن نہیں ہے۔"

"آخر شرمین کا کیا قصور ہے اس معاملے میں؟"

"وہ بھی ان ہی کی بیٹی ہے۔"

"یہ تو تمہیں پہلے بھی علم تھا، پھر محبت کیوں کی تھی؟"

"غلطی ہوگئی۔" وہ دکھ سے مسکرائے۔ وہ ماں کو نہیں بتا سکے تھے کہ شرمین نے انہیں جھوٹا کہا اور اماں کو سچا بنایا اور نہ ہی بتانا چاہتے تھے۔

"پھر بھی، توقیر!"

"پلیز اماں! مجھ پر رحم کریں......میں کوئی بھی ذکر سننا نہیں چاہتا۔ آپ نے دوائی لی؟" انہوں نے بات پلٹی۔

"ہاں......دوا لے لی تھی۔ اچھے وقت میں طلعت آ گئی، مجھے سنبھال لیا، ورنہ مقدس بے چاری اکیلی کیا کرتی؟"

"ہاں، خدا بہت کارساز ہے اماں! بس خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں کبھی خود کو

معاف نہ کرتا۔"

"چل پگلا!" وہ مسکرائیں اور پھر بولیں۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"کیسا ارادہ؟"

"کوئی اور لڑکی ہو تو بتاؤ۔" ان کے لہجے میں شرارت تھی۔

"اماں! آپ کی پسند سے آپ کی بہو آئے گی۔"

"واقعی......؟" وہ بولیں۔

"جی اماں!" انہوں نے کہا۔

"سوچ لو۔" انہوں نے کہا تو توقیر احمد نے چونک کر ماں کو دیکھا، ان کے چہرے اور آنکھوں کی چمک نے توقیر احمد کی چھٹی حس بیدار کر دی۔

"اماں! پسند آپ کی کوئی بھی ہو، مگر شرمین نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ تایا کے گھر کی کوئی بھی لڑکی نہیں۔ ورنہ شاید میں انصاف نہ کر سکوں گا۔" توقیر احمد بولے اور رضیہ خاتون حیران رہ گئیں۔

انہوں نے تو پل کے پل ہی سوچا تھا، وہ شرمین کو مانگ لیں گی۔ کیا ہے، ان کے بیٹے کی پسند ہے۔ مگر بیٹا تو ماں کے اندر گھسنے کا گر جانتا تھا۔

"توقیر! تم صابرہ بیگم سے متنفر ہو، مگر بعض لوگوں کی عادات ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کا بھی قصور نہیں ہوتا۔ تمہیں پتہ تو ہے، ہم دونوں فرسٹ کزن ہیں، ان کی اماں اور میری اماں میں کبھی نہ بنی۔ میری اماں تو نہیں، البتہ ان کی والدہ بیٹیوں کے ذہن میں زہر بھرتی رہیں۔ پھر وہ یہاں بیاہ کر آئیں تو چاہتی تھیں، تمہارے ابا سے ان کی چھوٹی بہن نفیسہ کی شادی ہو۔ مگر روز روز کی جو تم بیزار تمہارے والد گھر میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ قرعہ میرے نام نکلا۔ حالانکہ ہماری ساس ہماری سگی پھپھو تھیں۔ مگر شروع سے جو نفرت صابرہ بیگم کے دل میں بیٹھی، اب تک نہ نکل سکی۔"

"اور نہ نکل سکتی ہے۔" توقیر بولے۔

"پھر بیٹا! ماں کو دوش نہ دینا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ایک بار پھر سوچ لو۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔" رضیہ خاتون نے کہا۔

"ہاں......زندگی مجھے گزارنی ہے اور ایسی لڑکی ہو، جس کی ماں کو بھی میری ماں بہنیں پیاری ہوں۔"

"پھر نرگس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ خالدہ پھپھو کی بیٹی؟" توقیر نے پوچھا۔

"ہاں...... ماشاء اللہ، بڑی پیاری بچی ہے۔ سگھڑ، سلیقہ شعار۔ کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا۔"

"گونگی تو نہیں؟" انہوں نے شرارت سے کہا۔

"چل ہٹ، شریر!" رضیہ خاتون نے چپت رسید کی۔ توقیر احمد ہنس دیئے۔

"تم کہو گے کہ ابھی زخم تازہ ہے اور ماں کو شادی کی فکر پڑ گئی تو بیٹا! بات یہ ہے کہ مجھے لگتا ہے، اس گھر کو بہو کی ضرورت ہے۔ میری جان وہ نہیں رہی۔ بی پی ایک دم شوٹ کر جاتا ہے۔ اب اگر طلعت نہ ہوتی تو گھر اُلٹ پلٹ ہو جاتا۔"

"جی اماں!"

"تو پھر میں لے آؤں بہو؟" وہ کہہ رہی تھیں۔

"جیسی آپ کی خوشی۔" توقیر احمد نے سر جھکا لیا۔

"نصیر بھی اگلے ماہ آ جائے گا۔"

"ان کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔" توقیر بولے۔

"بری بات۔ بڑا بھائی ہے۔ اور پھر ہر ایک کو اپنا گھر عزیز ہوتا ہے۔ دیکھا نہیں تم نے، میری بیماری کا سن کر روز دن میں دو بار فون کرتا تھا۔ پیسے بھی بھیجے۔ کل بھی فون آیا تو کہہ رہا تھا، اماں! فکر نہ کرنا۔ علاج پر کتنا خرچ ہو، لگ کر علاج کروانا۔ پیسے کی فکر نہ کرنا۔" رضیہ خاتون کے لہجے میں بیٹے کی محبت بول رہی تھی۔

"آپ بہت سیدھی ہیں، اماں! کہتا تھا کہ یہ سب تمہارے سسرال والوں کا کیا دھرا ہے۔"

"رہنے دو...... آئے بھی تو یہ بات مت کرنا اس سے۔ یہ مشکل میرے نصیب میں لکھی تھی، پتہ نہیں، صابرہ بیگم بات نہ کرتیں تو کوئی اور بہانہ ہو جاتا۔"

"اور تائی کا بغض دیکھا...... آپ کو پوچھنے بھی نہ آئیں۔" توقیر احمد نے تلخی سے کہا۔

"اچھا چھوڑو۔ تمہارے تایا تو چکر لگاتے رہے۔ آخر وہی گھر کے سربراہ ہیں۔ سفیان بھی کئی بار آیا۔ اتنا ہی ہوتا ہے۔ اب ہم کسی کے جرم کی سزا کسی کو تو نہیں دے سکتے۔" رضیہ خاتون کہہ رہی تھیں۔ "بیٹا! دل بڑا رکھتے ہیں۔ جو برائی کرے، اسے برائی سے جواب نہیں دیتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

"اماں! میں گرما گرم چائے لاتی ہوں۔" طلعت ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور پھر میز پر ٹرے رکھ کر بولی۔

"بائی دا وے، میں نے آپ ماں بیٹے کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"اب ڈسٹرب کر ہی چکی ہو تو کہنے کا فائدہ؟" توقیر بولے۔

"اماں......!" طلعت، بچوں کی طرح ٹھنکی۔

"تنگ مت کرو، بہن کو۔"

"کون کہے گا، تم ٹیپو جیسے پیارے بچے کی ماں ہو؟"

"میں کہتی ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی تو رضیہ خاتون ہنس دیں۔

"محسن کا فون آیا تھا۔ آپ کی طبیعت پوچھ رہے تھے۔" وہ ماں کو کپ پکڑاتے ہوئے بولی۔

"اور یہ بھی کہا ہو گا، تم کب آؤ گی؟"

"جی نہیں...... انہوں نے کہا ہے، جب تک خالہ جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی، تم نہ آؤ۔ بلکہ بڑی خالہ بھی یہی کہہ رہی تھیں۔" طلعت نے بتایا۔

"رابعہ آپا سے میری بات کرواتیں۔" رضیہ خاتون بولیں۔

"آپ سو رہی تھیں۔"

"تو اٹھا دیا ہوتا۔"

"چلیں...... رات کو بات کر لیجئے گا۔" طلعت نے کہا۔

"بیٹا! اگر گھر میں کوئی مسئلہ ہے تو تم چلی جاؤ۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" رضیہ خاتون بولیں۔

"اماں! کوئی مسئلہ نہیں۔ نویدہ اور سمیرا کے امتحان ختم ہو چکے ہیں، کام کاج وہ کر لیتی ہیں۔ یوں بھی بڑی خالہ نے سب کے ذمہ کام بانٹے ہوئے ہیں، ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"اب تمہارے حصے کا کام کون کرتا ہو گا؟" رضیہ خاتون بولیں۔

"محسن بھائی کرتے ہوں گے۔" توقیر جلدی سے بولے۔

"بھائی......!" طلعت چلائی۔

"ویسے طلعت! یہ اپنے محسن بھائی ایپرن پہنے، ہانڈی بھونتے اور برتن دھوتے ہوئے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈی سی لگتے ہوں گے۔"

''ڈی سی!'' طلعت نے حیرت سے کہا۔ ''ہوٹل میں ڈی سی کب سے ہونے لگے؟''

''ہاں، وہ ڈش کلینز۔'' وہ نہایت بے پروائی سے بولے۔

''مار کھاؤ گے تم توقیر!'' رضیہ خاتون ہنس رہی تھیں اور طلعت روہانسی ہو رہی تھی۔

''پھر شام کو چلنا ہے ناں، خالدہ کے ہاں؟''

''بھائی مان گئے؟'' طلعت بولی۔

''اور کیا، مان گیا ہے۔''

''سچ بھائی! عین وقت پر تو......''

''میرا ہر فیصلہ اٹل ہوتا ہے، طلعت!'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولے اور بھائی کے بدلتے موڈ پر وہ حیران تھی کہ ابھی چند لمحے پیشتر وہ کیسے اس سے مذاق کر رہے تھے اور اب لگتا تھا، شوخی ان کے قریب سے بھی نہ گزری ہو۔ طلعت نے جلدی سے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

⊕......⊕......⊕

''سنتے ہو، وہ تمہاری بہن بیٹی دے رہی ہیں، توقیر کے لئے۔ چپ چاپ رشتہ کر بھی لیا اور ہمیں بتایا نہیں۔''

اماں نے اسرار احمد کے گھر میں گھستے ہی اطلاع پہنچائی اور چھالیہ کترنے لگیں۔

''اچھا...... پھر تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''ابرار کی دلہن نے بتایا مجھے کہ رضیہ رشتہ لے کر خالدہ کے ہاں گئیں اور انہوں نے فوراً رشتہ قبول بھی کر لیا ہے۔''

''پھر......؟'' وہ بولے۔

''میری تو نرگس پر کب سے نظر تھی، اپنے سفیان کے لئے۔''

''پھر اب کیا کریں؟'' اسرار احمد نے کہا۔

''تم جا کر خالدہ سے کہو کہ وہ یہ رشتہ ہمیں دیں۔''

''بیگم! کسی کا اچھا ہو رہا ہے تو تمہیں لازمی برا کرنا ہوتا ہے۔ اور ان کا رشتہ ہو گیا ہے، ٹھیک ہے۔''

''تمہیں اپنے بیٹے کا کچھ خیال نہیں؟'' اماں چمک کر بولیں۔

''جہاں اس کا نصیب ہوگا، ہو جائے گا۔''

''میں تو آج ہی جاؤں گی، خالدہ کے ہاں۔ آخر تم بڑے بھائی ہو۔ پہلا حق تمہارا

ہے، نہ کہ انوار کے بیٹے کا۔''

''تم نہیں جاؤ گی۔ کیونکہ مجھ سے پوچھ کر خالدہ نے ہامی بھری ہے۔''

''کیا......؟'' اماں کے ہاتھ سے سروتا چھوٹ گیا۔

''انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا، رضیہ بھابی نے بھی پوچھا۔ میں نے کہا، بسم اللہ کریں۔'' ابا میاں بے نیازی سے بولے۔

''اے لو، تمہیں اپنے گھر میں جوان جہان بیٹا نظر نہ آیا؟ اور پھر تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''تم مجھے کچھ بتاتی ہو کہ کیا کرتی پھر رہی ہو؟''

''میں نے کیا، کیا؟'' وہ معصوم بن گئیں۔

''تم نے توقیر کے رشتے سے انکار کیا، مجھے بتایا؟ تم نصیر کو اس کے گھر والوں کے خلاف بھڑکاتی ہو، کبھی مجھے بتایا؟ صابرہ بیگم! یہ مت سمجھو کہ مجھے کسی بات کا علم نہیں ہے۔ سب معلوم ہے مجھے۔ میں خاموش رہتا ہوں کہ لوگ نہ سنیں۔ ورنہ میں تم سے زیادہ اونچا بول سکتا ہوں۔'' اسرار احمد غصے سے بول رہے تھے۔ مگر وہ صابرہ بیگم ہی کیا، جو دب جاتیں۔

''یوں کہو، بھاوج تمہیں میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ آنے دو نصیر کو۔ بتاؤں گی اس کی اماں کے لچھن۔''

''وہ مجھے کیا بہکائیں گی؟ ...... میری آنکھیں بند ہیں یا مجھے نظر نہیں آتا؟ ارے میں تو اب جھولی میں بھی ڈالوں ثمرین کو تو، توقیر نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے، تایا ابا! میری گردن کاٹ دیجئے، مگر ثمرین سے شادی کا نہ کہیے۔ پتہ ہے، کتنی ضد اور خوشی سے اس نے ماں کو منوایا؟ مگر تم پتہ نہیں کیا چاہتی ہو۔ جو تمہارا وتیرہ ہے، تم اولاد کا گھر نہیں بسا سکتیں۔''

''یہ تم نہیں، تمہاری بھاوج کی زبان بول رہی ہے۔'' صابرہ بیگم گرجیں۔

''میں بول بھی خود رہا ہوں، جملے بھی میرے ہیں۔ ایک بیاہی ہے، اسے بھی گھر بٹھا رکھا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اے لو...... اس کا میاں خود یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔ اور یوں بھی شوہر گھر نہ ہو تو عورت سسرال کے جوتے کھائے، ان کی خدمتیں کرتی رہے۔ میری بیٹی ہے اور اس کا حق ہے یہاں رہنے کا۔ کون ہے، جو اسے جانے کا کہے؟'' صابرہ بیگم خم ٹھونک کر بولیں۔

''کوئی کہے بھی تو سسرال میں کون سی اس کے لئے جگہ ہے۔'' اسرار احمد کہتے ہوئے

اندر چلے گئے کہ انہیں علم تھا، جتنی دیر بیٹھیں گے، یونہی جھگڑا بڑھتا رہے گا اور ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

⊛......⊛......⊛

رضیہ خاتون نے نہایت دھوم دھام سے توقیر احمد کی منگنی کی تھی۔ ان کے گھر میں سے صرف ابا میاں یعنی توقیر کے تایا ہی شریک ہوئے، باقی اماں اور سب نے بائیکاٹ کیا تھا۔

رضیہ خاتون خود آئی تھیں بلانے، تمکین کو لینے۔ مگر حسب معمول عزت افزائی کروا کے گئی تھیں۔

"اے لو، جب رشتہ ہم سے پوچھے بغیر طے کرلیا تو منگنی بھی کرلو اور شادی بھی کر لینا۔ ہم نہیں آنے کے۔"

"اسرار بھائی سے پوچھا تھا۔" رضیہ خاتون بولیں۔

"پھر وہی جائیں۔ مجھ سے تو نہیں پوچھا تھا۔"

"اسرار بھائی غیر تو نہیں۔ بڑے ہیں ہمارے۔" رضیہ خاتون رسان سے بولیں۔ حیرت ہوتی تھی ان کے صبر وتحمل پر۔

"وہی لگے ہیں تو وہی جائیں گے۔" اماں اپنی بات پر ڈٹی تھیں۔

"آپ بھی تو میری سگی ہیں، میری تایا زاد ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ہم سمدھن بھی ہیں۔"

"بس بی بی! لاگ لپٹ رہنے دو...... تمہاری ان چپڑی باتوں سے اسرار ہی پگھلتے ہیں، میں نہیں۔ اور میں نہیں جانے کی۔"

اور پھر رضیہ خاتون آنکھوں میں آنسو لئے چلی گئیں۔

خالدہ پھپھو آئیں تو ان سے بھی یہی سوال نامہ دہرایا گیا۔

مگر ان میں رضیہ خاتون جیسا حوصلہ کب تھا؟

انہوں نے بھی بے بھاؤ کی سنائیں۔

"بڑی بھابی! تم ہماری ماں کی جگہ تھیں، مگر ماں بن نہیں سکیں۔ ارے نہیں آتیں تو نہ آؤ۔ تمہارے بغیر کیا میری بچی کی منگنی نہ ہوگی؟ کسی کے آنے نہ آنے سے کام رکتے نہیں۔ شریک ہوجاتیں تو ٹھیک تھا۔ آخر تمہاری بھی بیٹی ہے نرگس۔"

"بے شک۔ مگر اس طرح کوئی نہیں کرتا، عین وقت پر تم بلانے آگئیں۔" اماں نے

پینترا بدلا۔

"لو، پرسوں بات ہوئی۔ جمعہ کو منگنی کا دن مقرر ہوگیا۔ اب بتائیں بھلا کہ کتنے دن تھے؟ یوں بھی بڑے بھیا تو موجود تھے۔"

"میں تو تمہاری کچھ نہیں لگتی۔"

"آپ بھی بہت کچھ ہیں۔ یہ مردوں کی بات تھی۔"

"میری کتنی خواہش تھی، نرگس کو بہو بنانے کی۔"

"پہلے کہتیں۔"

"اب کیا گیا ہے؟"

"ایک چیز زبان ہوتی ہے، بھابی! اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ جیسا ہمارے لئے سفیان، ویسا توقیر۔ اگر آپ کی منشا ہے تو گھر کی بات ہے۔ نیلم کا بی اے فائنل ہے۔ وہ سہی۔"

"مجھے تو نرگس پسند ہے۔ اگر دینی ہے تو دو۔ ورنہ میرے میکے میں بہت لڑکیاں ہیں۔" اماں نے صاف کہا۔

"تو وہی لے آئیں۔ یوں بھی ہم لوگ آپ کے قابل نہیں۔" خالدہ پھپھو ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اب میں چلتی ہوں۔ آجایئے گا منگنی میں۔"

"ہم نہیں آنے کے۔" انہوں نے اعلان کیا۔

"بھابی! یہ مت سمجھنا کہ تم نہ آئیں تو میں بھی تمہارے بچوں کی خوشیوں میں شریک نہیں ہوں گی۔ نہیں بلاؤ گی، پھر بھی میں آؤں گی کہ وہ میرے بڑے بھائی کے بچے ہیں۔ آئی سمجھ؟" خالدہ تنک کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں اور پھر لاؤنج سے نکلتی چلی گئیں۔

"ہونہہ...... بڑی آئیں۔" اماں نے سر جھٹکا۔

"اس گھر میں کسی آئے گئے کی عزت ہے بھی؟ جو آتا ہے، بے عزت ہوکر جاتا ہے۔" امبرین جو ساری کارروائی دیکھ رہی تھی، غصے سے بولی۔

"تیری بھی زبان چل گئی ہے۔ کاٹ دوں گی، میرے آگے بولی تو۔" اماں کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں اور وہ کچن میں بھاگ گئی۔

⊛......⊛......⊛

اماں اگلے ہی روز اپنے بھائی کمال احمد کے ہاں سفیان کا رشتہ لینے پہنچ گئیں۔

رخشی بہت حسین نہ سہی، قبول صورت تھی۔ ہوم اکنامکس میں ایم ایس سی کر رہی تھی۔
کمال احمد چھوٹے بھائی تھے، وہ بھلا کب انکار کر سکتے تھے؟ انہوں نے فوراً ہاں کر دی اور ساتھ ہی شرمین کا رشتہ داؤد کے لئے مانگ لیا۔ ان کا بیٹا داؤد کمال مرچنٹ نیوی میں تھا۔
اور بھلا اماں کو کیا چاہئے تھا، دل میں تو خوش ہوئیں مگر بولیں۔
"بھئی کمال! یہ باتیں گھر آ کر کرنے کی ہوتی ہیں۔ تم نے تو........"
"آپا! گھر بھی آ جاؤں گا۔ بس آپ سے کہہ دیا ہے، شرمین میری بہو بنے گی۔ داؤد اور رخشی کی شادی ایک ساتھ کروں گا۔" وہ محبت سے بولے۔
"جیسے تمہاری خوشی۔" اماں تو بہت خوشی خوشی گھر لوٹی تھیں۔ مگر کمال احمد کی بیگم حمیدہ جبیں خوش نہ تھیں۔
"یہ ادلے بدلے کی شادی اچھی نہیں ہوتی۔"
"اپنوں میں کیا وٹہ سٹہ؟"
"کمال! ہم رشتہ لے لیتے ہیں، دیتے نہیں۔"
"کیوں......؟"
"کہنے کی بات تو نہیں۔ آپ کی آپا کا مزاج بہت تیز ہے۔"
"بیگم! آج کل ہر کوئی تیز ہے۔ تم کم ہو؟"
"یہ بات نہیں۔ روز ہی سنتی ہوں، وہ رضیہ آپا کی کس قدر بے عزتی کرتی ہیں۔ آپ کو شاید علم نہیں، یہ عورتیں باتوں تک خود ہی پہنچ جاتی ہیں۔ آخر رضیہ میری بڑی بہن ہیں۔"
"تمہیں اپنی بہن عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی بہن پیاری ہے۔ اور جو فیصلہ ہو گیا، بس ہو گیا۔" کمال احمد ترشی سے بولے تو وہ آنکھوں میں آنسو لئے شوہر کو دیکھ کر رہ گئیں۔
حالانکہ ساری عمر وہی ہوتا آیا تھا، جو کمال احمد اور اللہ بخشے ان کی ساس نے چاہا تھا۔
جب تک وہ زندہ رہیں، حمیدہ جبیں کو سکھ کا سانس میسر نہ آیا۔
میکے شکایت کرتیں تو ماں کہتیں۔
"بری بات۔ تائی ہیں تمہاری۔ خدمت سے دل جیت لو۔ میں تمہیں گھر بٹھانے کی نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے، بیاہی بیٹیاں گھر میں بیٹھ جائیں تو لوگ طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں۔ بیٹا! خود بھی بدنامی سے بچو اور ماں کو بھی دنیا کے تیروں سے بچاؤ۔"
اور حمیدہ جبیں نے ہمیشہ ماں کی بات پر عمل کیا تھا۔

ساس اگر ایک نالی بندوق تھیں تو تینوں نندیں دو نالی بندوق تھیں اور وہ صبر و شکر کرتی رہیں۔ میاں شروع سے ماں کے اثر میں تھے کہ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی، ماں کے لاڈلے۔ ہمیشہ وہ جذباتی بلیک میل کرتیں۔
"تمہارے علاوہ میرا اس دنیا میں کون ہے؟"
اور کمال احمد، ماں کے سامنے بچھ بچھ جاتے۔
نندیں آتیں تو ماں کے پاس تخت پوش پر بیٹھی رہتیں۔ مجال ہے، جو ہل کر پانی بھی پی لیں۔ البتہ بھابی سے فرمائشیں ہوتیں۔
صابرہ بیگم کو قورمہ پسند تھا۔ وہ کہتیں۔ "بھابی! قورمہ آپ زبردست پکاتی ہیں۔ آج تو کھلا دیں۔"
نفیسہ بیگم بریانی کا نعرہ لگاتیں۔
ثریا بیگم کو میٹھا پسند تھا۔ سردیوں میں گجریلے کی فرمائش ہوتی اور گرمیوں میں کدو کا حلوہ کھانے کو جی چاہتا۔
اور حمیدہ جبیں کا تو سارا دن کچن میں گزر جاتا، مگر مجال ہے کہ نندوں کو ان پر ترس آ جاتا۔ رات کو تھک ہار کر وہ جب سوتیں تو میاں جی کو پاؤں دبوانے یاد آ جاتے۔ اور ایسے میں دل چاہتا، دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ کبھی جو کمال احمد نے محبت سے کہا ہو۔
"تم تھک گئی ہو گی۔ کام بھی تو بہت کرتی ہو۔"
یہ جملہ سننے کو تو ترس ہی گئی تھیں۔ اور پھر اسی دوران تین بچے ہوئے۔ پہلا داؤد تھا، پھر رخشندہ تھی اور پھر بلال تھا، جو کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا تھا۔ تینوں بچے آپریشن سے پیدا ہوئے تھے۔ اور بچوں کا کوئی چانس نہ تھا۔ اور یہی بات ان کی ساس کو کھٹکتی۔
"ہائے........ میرا کتنا جی چاہتا ہے، کمال کے بچوں سے آنگن بھرا ہو۔ مگر اس نے تو جان بوجھ کر آپریشن سے بچے پیدا کرائے، تاکہ زیادہ بچے پیدا نہ کرنے پڑیں۔"
اپنے طور پر مفروضے گھڑنے میں ان کی ساس کو کمال حاصل تھا۔ اور تو اور وہ بیٹے کو دوسری شادی پر اُکساتی تھیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں، ہر بات ماننے والے کمال احمد نے ان کی یہ بات نہ مانی تھی۔
اور پھر چار سال قبل جب ان کی ساس اگلے جہاں کو سدھاریں تو حمیدہ جبیں کو سکون نصیب ہوا تھا۔ نندوں کا بھی آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ بے وقت کی فرمائشوں سے جان چھوٹ گئی تھی۔

اور اب ایک دم ہی رخشندہ کا رشتہ کمال احمد نے طے کر دیا۔ حالانکہ ان کی تو شروع سے منشاء تھی، بڑی آپا کے احسن کو رخشندہ دینے کی۔ اور یہ بات دونوں بہنوں میں طے تھی۔ مگر صابرہ بیگم نے تو شب خون مارا تھا۔ بھلا کیا کر سکتی تھیں؟

دل کا خون ہو گیا اور وہ دیکھتی رہیں۔

یوں بھی انسان جو چاہتا ہے، وہ کب ملتا ہے؟ ہوتا وہی ہے، جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

میری بچی کتنی معصوم ہے۔ اور وہ چلتر باز صابرہ بیگم........ خیر میں بھی ان پر انہی کے داؤ آزماؤں گی۔ آخر شرمین یہاں ہو گی۔ سارے داؤ پیچ مجھے بھی آتے ہیں۔ اب آزمانے کا موقع ملے گا۔ میری بیٹی میری طرح عذاب میں زندگی نہیں گزارے گی۔

میری طرح گھٹ گھٹ کر روز جینے مرنے کا کھیل نہیں کھیلے گی۔

ضروری تو نہیں، ہمیشہ جیت صابرہ بیگم کی ہو۔

حمیدہ جبیں نے ایک عزم سے سوچا اور اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگیں۔

❀......❀......❀

"دلہن!........ آج تمہاری شادی کو ہفتہ ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں تو چولہا چوکی سنبھال لو۔"

"جی ممانی جان! میں بھی یہی چاہ رہی تھی۔" شرمین نے کہا۔

"پھر رد کا کس نے؟"

"میں نے سوچا، آپ خود کہیں۔"

"ایسا کیوں سوچا؟"

"بس........" شرمین کوئی جواب نہ دے پائی۔

"آج کھیر پکا لو۔ شام کو سفیان اور رخشندہ بھی آئیں گے۔" حمیدہ جبیں بولیں۔

"جی اچھا!"

"اور جو کچھ پکانا ہو، پکا لینا۔ رجو ہے مدد کرنے کو۔"

"بہتر۔" شرمین بولی۔

"میں رضیہ آپا کے ہاں جا رہی ہوں۔ نرگس اور توقیر کو دعوت دے آؤں کہ شام کو وہ بھی آ جائیں۔" انہوں نے کہا تو شرمین سر جھکا کر رہ گئی۔

ممانی کے جانے کے بعد وہ کچن میں آئی۔ رجو برتن دھو رہی تھی۔

"آپ جی، کیا چائے پینی ہے؟"

"نہیں رجو!........ وہ شام کو مہمان آ رہے ہیں۔ کھانا بنانا ہے تو کیا پکائیں؟"

"آپ پکائیں گی؟" رجو نے پوچھا۔

"ہاں۔" شرمین بولی۔

"ابھی تو آپ نئی نویلی دلہن ہیں۔"

"آخر کب تک نئی نویلی رہوں گی؟........ گھر کا کام تو کرنا ہی ہے۔ یوں بھی ممانی جان اکیلی کس طرح کریں؟" شرمین بولی۔

"انہوں نے تو جی ہمیشہ بہت کام کیا ہے۔ اکیلی پچاس بندوں کا کھانا پکا لیتی ہیں۔" رجو نے بتایا۔

"اچھا........؟" شرمین حیران تھی۔

"ہاں جی۔ میں یہاں تقریباً دس سال سے ہوں۔ بیگم صاحبہ بڑی ماہر ہیں۔" رجو نے بتایا۔ شرمین کو ممانی کی یہ خوبی پتہ نہیں تھی۔ نہ کبھی ماں نے ان کی تعریف کی تھی۔ یوں بھی وہ بہنیں ننھیال نہیں آتی تھیں، صرف اماں کا دُم چھلا تمکین آپا ہوتی تھیں، یا پھر امبرین۔ شرمین کو یاد نہیں کہ وہ کبھی ننھیال آئی ہو۔ نانی فوت ہوئی تھیں تو ان دنوں اس کے بی۔اے کے امتحان ہو رہے تھے۔ وہ مری نانی کا منہ دیکھ کر پرچہ دینے چلی گئی تھی۔ پھر اب بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔

اس کی شادی سے صرف ایک ہفتہ پہلے توقیر کی شادی ہوئی تھی کہ نصیر بھائی آئے ہوئے تھے۔ رضیہ خاتون نے تو بیٹے کو کچھ نہ کہا تھا۔ وہ بیوی کو لے کر گھر گئے تھے۔ مگر اُدھر بھی سفیان اور شرمین کی شادی کے ہنگامے تھے۔ سو انہوں نے تمکین کو ادھر ہی چھوڑ دیا تھا۔ نصیر بھائی کی وجہ سے اماں بھی توقیر کی شادی میں گئی تھیں۔

توقیر احمد، شرمین کی شادی میں شریک نہ ہوئے تھے۔ وہ شادی کے چوتھے روز ہی ہنی مون کے لئے چلے گئے تھے۔

تب شرمین نے سوچا تھا۔ میرا حوصلہ تھا کہ میں نے آپ کی شادی کی ساری روئیداد سنی (کہ وہ شادی میں نہ گئی تھی)

توقیر احمد آپ بھی خود میں اتنا حوصلہ تو پیدا کرتے........

داؤد کمال، انتہائی سرد مزاج شخص تھا۔ شاید سمندر کے ٹھنڈے پانیوں میں رہ رہ کر اس کے جذبات بھی سرد ہو چکے تھے۔ شادی کی رات بولا تھا۔ جو بات کہی تو صرف یہ

کہ........

"میری ماں کی خدمت کرو گی تو بیوی بن کر رہو گی۔ ورنہ ٹِک لگانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔ مجھے اپنی ماں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے عشق ہے اپنی ماں سے۔ یہ نہیں کہ میں ڈیوٹی پر جاؤں اور تم اپنی بہن کی طرح میکے کی دہلیز سے چمٹ جاؤ۔ میں چاہتا ہوں، میں گھر میں ہوں یا نہیں، میری بیوی میرے گھر میں ہو۔ سمجھ رہی ہو نا؟"

"جی........!" شرمین نے سر ہلا دیا۔

یہ تھی اُس کی سہاگ رات۔

جس کے بارے میں کتنے قصے سن رکھے تھے۔

اور اس نے شکر کیا تھا کہ داؤد جملے بازی کے فن سے نا آشنا تھا، ورنہ اس کے منہ سے وہ سب سنتا کس قدر تکلیف دہ ہوتا کہ ابھی وہ خود کو ذہنی طور پر ڈھال رہی تھی۔

اس سے گھر میں سب ہی محبت کرتے تھے........کمال احمد، ممانی، بلال........سب کو وہ اپنی لگتی۔

بلال تو کہتا تھا۔ "بھابی! لگتا ہے، آپ ہمیشہ سے اسی گھر میں رہ رہی ہیں۔"

اور وہ مسکرا دیتی۔

گھر میں دعوت کا اہتمام تھا۔ اور وہ خود بھی بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ کچن کا کام ختم کر کے وہ تیار ہوئی۔ پرپل سوٹ، جس پر بڑا نفیس کام بنا ہوا تھا۔ ڈائمنڈ کا سیٹ جو داؤد سنگاپور سے اس کے لئے لایا تھا۔ (یہ ممانی کی اطلاع تھی) اس نے پہنا ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ تب ہی اُس کی اماں اور بہنیں آ گئیں۔

"خوش تو ہو؟" اماں اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"جی!" وہ امبرین کی طرف بڑھی۔

"بھابی! نکلیں کمرے سے یار!........اتنی دیر؟ میں تو سمجھی، آپ ہماری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔" رخشندہ اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

"میں نے سوچا، پہلے تیار ہو جاؤں، پھر تمہاری راہ دیکھوں۔" شرمین نے کہا تو رخشندہ ہنس دی۔ پھر وہ سب کے ساتھ باہر آ گئی۔ رجو نے سب کو کولڈ ڈرنک سرو کر دی تھیں۔

"امی! یہ ابھی سے آپ نے بھابی کا ہاتھ کھیر میں ڈلوا دیا؟"

"بیٹا! میں نے کہا، داؤد جتنے دن یہاں ہے، بیوی کے ہاتھ کا پکا کھائے۔ جو کمی بیشی ہو گی، پھر سیکھ لے گی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" رخشی مسکرائی۔

"ہاں۔ ویسے میری بیٹی کو سب پکانا آتا ہے۔" صابرہ بیگم نے فخر سے کہا۔

"آج ٹرائی ہو جائے گی، پھپھو!" داؤد نے مسکرا کر کہا۔ "یار! یہ ابھی تک توقیر نہیں آیا۔ بڑا وقت کا پابند بنا پھرتا ہے اور........"

داؤد کا جملہ منہ میں تھا کہ گیٹ پر ہارن ہوا اور داؤد باہر چلا گیا۔ جبکہ شرمین کو لگا، اس کے پیروں تلے زمین نہ ہو، ریت ہو جو سرکتی جا رہی ہو۔ تب ہی داؤد پلٹ آیا اور شرمین کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"بھئی، ہمارے گھر مہمان آئے ہیں۔ چلو انہیں ریسیو کریں۔"

وہ تو کچھ بھی نہ سمجھ پائی تھی۔ باہر آئی تو ان کی گاڑی پورچ میں رک چکی تھی۔ (نصیر بھائی نے یہ نئی گاڑی آتے ہی چچا جان کو لے دی تھی اور اماں کی کیا حالت ہوئی تھی، یہ الگ کہانی تھی)

چچی جان اُتر رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھی اور رضیہ خاتون کی کھلی بانہوں میں سما گئی۔

"طلعت! دیکھو، میری بیٹی کتنی پیاری لگ رہی ہے۔" رضیہ خاتون نے اس کی پیشانی چومی۔

"بھئی، وہ نیا شادی شدہ جوڑا نہیں آیا؟" بلال پوچھ رہا تھا۔

"وہ بائیک پر آ رہے ہیں۔ ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہیں۔" حمکین نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

"اور کیا آپ لوگوں کی طرح کہ میاں کہیں، بیوی کہیں۔" داؤد نے کہا۔

"پوچھیں گے تم سے، نہ جانا سمندروں کے سفر پر۔" نصیر احمد نے داؤد کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ سب ہنس دیئے۔

تب ہی توقیر اور نرگس بھی آ گئے۔ شرمین بڑی محبت سے نرگس سے ملی تھی اور توقیر کو سلام کر کے وہ ایک طرف ہو گئی۔

"بھئی شرمین! جلدی سے کھانا لگواؤ بیٹا! بھوک لگی ہے۔ اب تو چیف گیسٹ بھی آ گئے۔" کمال احمد نے کہا۔

"بہتر ماموں جان!" وہ خود بھی وہاں سے ٹلنا چاہ رہی تھی۔

پھر وہ رجو کے ساتھ کھانا لگوانے میں لگ گئی۔ رخشندہ بھی ہاتھ بٹا رہی تھی۔ جبکہ اس کی اپنی بہن تمکین آرام سے بیٹھی تھیں۔ تب ہی رضیہ خاتون کچن میں آ گئیں۔

"ارے چچی جان! یہاں گرمی ہے۔ آپ........"

"میں تمہارے پاس بیٹھوں گی۔"

رجو بھاگ کر کرسی اٹھا لائی۔

"ادھر آؤ۔" رضیہ خاتون نے اسے قریب بلایا۔

"جی........!" وہ قریب آ گئی۔

"دیکھو، چاہے حمیدہ میری بہن ہی ہے، مگر تم کبھی اسے یہ مت بتانا کہ توقیر کا رشتہ ہم نے تمہارے ہاں بھیجنا چاہا تھا۔"

رضیہ خاتون اُسے ہولے ہولے سمجھا رہی تھیں اور وہ بس سر ہلانے پر اکتفا کر رہی تھی۔

کھانا لان میں میزوں پر لگایا گیا تھا۔ شرمین نے ایک نظر سب چیزوں کو دیکھا، پھر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"کھانا لگ گیا ہے........ آئیے!" شرمین نے اندر اطلاع دی اور تب ہی توقیر احمد سے اس کی نظر مل گئی تھی۔ وہ گھبرا سی گئی۔ پتہ نہیں، توقیر کی نظروں میں کیا تھا۔

اسے لگا، جیسے کوئی تنبیہ ہو۔

جیسے وہ اسے کچھ جتانا چاہتا ہو۔

کیا؟........ یہ اسے علم نہ تھا۔

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ اس نے دیکھا بلکہ محسوس بھی کیا تھا کہ اماں نے نہ چچی جان سے صحیح طرح بات کی تھی اور نہ ہی توقیر کو بلایا تھا۔ نرگس بھی خود ہی جا کر ان سے ملی تھی۔

"پتہ نہیں، اماں کو کس بات کا غرور ہے؟" شرمین سوچ کر رہ گئی۔

رات کو جب وہ تمام کام نمٹا کر کمرے میں آئی تو داؤد بیڈ پر دراز کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا، اسے دیکھتے ہی بولا۔

"آئیے بیگم صاحبہ!........ آپ ہی کا انتظار تھا۔" وہ کتاب بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اُٹھ بیٹھا۔

"فرمائیے؟" شرمین ٹھٹک گئی تھی۔

"قریب آئیں گی تو فرماؤں گا۔" وہ شوخی سے بولا۔

"میں چینج کر لوں۔" وہ بولی۔

"میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ مجھے تو دیکھنے دو۔" داؤد کے اس نئے انداز پر وہ پریشان سی ہو رہی تھی۔ داؤد نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ کسی معمول کی طرح اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم........ تم بہت اچھی ہو، شرمین!"

"جی........" وہ کچھ نہ سمجھی۔

"تم اپنے گھر والوں سے کتنی مختلف ہو۔ صابرہ پھپھو اور تمکین سے ذرا بھی میل نہیں کھاتیں۔"

"وہ بھی تو یہی کہتا تھا اور........" ایک خیال اس کے ذہن کے روزن سے داخل ہوا، جسے اس نے جھٹک کر بھگایا اور بولی۔

"بس، یہی بتانا تھا؟"

"اور بھی بہت کچھ کہنا ہے، بتانا ہے۔" داؤد نے اس کے چہرے پر گالوں کو چھولتی لٹ کو اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ "آئندہ میں لمبی چھٹی پر آؤں گا۔ پھر ہم یورپ کے ٹور پر چلیں گے۔ تم بھی کہو گی کہ ہم نے ہنی مون نہیں منایا۔"

"میں تو نہیں کہوں گی۔"

"یار! یہ ناردرن ایریا کئی بار کا دیکھا ہوا ہے۔ میں نے سوچا، ہم یورپ چلیں۔ کیا خیال ہے؟"

"جو آپ کی مرضی........ مگر میں نے تو ناردرن ایریا بھی نہیں دیکھا ہوا۔" وہ نہایت معصومیت سے بولی۔

"رئیلی؟" وہ حیران تھا۔ شرمین نے سر ہلا دیا۔

"چلو، پھر چند روز کے لئے چلے چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے؟"

"ممانی جان اکیلی ہوں گی۔" شرمین نے کہا۔

"پھر........؟" داؤد بولا۔

"اگر رخشی آ کر رہ جائیں تو پھر چلیں گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ سفیان آنے دے گا؟ بھئی ان کی بھی ہماری طرح نئی شادی ہوئی ہے۔" وہ شوخی سے بولا۔

"چلیں، پھر کبھی سہی۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"شرمین! یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں مرد کے دل میں عورت کی قدر بڑھا دیتی ہیں۔ اور تم ہمیشہ ایسی ہی رہنا۔ میں دل و جان سے تمہاری قدر کروں گا۔" داؤد نے اس کے گال کو چھو کر محبت سے کہا۔

"میں ایسی ہی ہوں۔ آپ اسی طرح رہیے گا۔" اس نے کہا۔

"یار! پکا وعدہ۔ ہم اسی طرح رہیں گے۔" داؤد نے کہا اور کہنے لگا۔

"چائے ملے گی؟"

"ضرور........ کافی لاؤں؟" شرمین نے پوچھا۔

"چلو، کافی سہی کہ آج تم سے باتیں کرنے کا موڈ ہے اور نیند کو بھگانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا........" شرمین ہنس کر بولی اور پھر کافی بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔

⊛......⊛......⊛

وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

اس کی شادی کو ڈھائی ماہ ہو گئے تھے۔ پچھلے ایک ماہ سے اس کی طبیعت بھی کچھ بوجھل بوجھل سی تھی اور اپنی اس کیفیت کا اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ ان گزرے ڈھائی ماہ میں داؤد نے اسے اتنی محبت دی تھی کہ وہ میکے جانے والا راستہ بھی بھول گئی تھی۔

داؤد نے اس کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے جاب کی اجازت دے دی تھی۔

اور یوں بھی یہاں سے اس کا اسکول صرف دس منٹ کی ڈاک پر تھا۔ مگر جب تک داؤد تھا، اس نے مزید چھٹی لے لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ گھر پہ ہو تو شرمین اس کے اردگرد ہی رہے۔

قریب ہو۔

اور شرمین بھی زیادہ سے زیادہ اس کو قربت بخشتی کہ پتہ نہیں، وہ ڈیوٹی پر جائے گا تو کتنے ماہ بعد آئے گا۔ اور داؤد نے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کے جانے کے بعد میکے رہنے نہیں جائے گی۔ اور اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ یوں بھی اس کا خود دل نہیں چاہتا تھا، جانے کو۔ اماں نے جو برچھی اس کے دل میں اتاری تھی، وہ ابھی تک نکلی نہ تھی۔

آج داؤد جا رہا تھا۔ داؤد جاتے ہوئے کمرے میں اس سے ملنے آیا تھا اور وہ کھڑکی میں کھڑی بے آواز آنسو بہائے جا رہی تھی۔

"شرم!" بہت پیار سے داؤد اسے اسی طرح بلاتا تھا۔

"جی........" ایک دم ہی اس نے آنسو پونچھے تھے۔

"رو رہی ہو؟" داؤد نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

"نہیں تو۔" وہ ہونٹ کچلتے ہوئے بولی۔

"تم مت روؤ۔ یہ آنسو کہیں میرے رستے میں سمندر نہ بن جائیں۔" داؤد نے پیار سے اس کے گالوں پر بہنے والے آنسو اپنی انگلی کی پوروں میں جذب کئے۔

"مجھے خوشی خوشی رخصت کرو۔ میں روز تمہیں فون کروں گا اور جہاں ہوں گا، تم میرے ساتھ ہو گی۔ چاہے خیالوں میں ہی سہی۔"

"پتہ نہیں کیوں، رونا آ رہا ہے۔"

"محبت زیادہ ہو گئی ہے........ ہے نا؟"

"معلوم نہیں۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

"ہے تو کچھ ایسا ہی معاملہ........" وہ شریر ہو گیا۔

"چلو یار! دیر ہو رہی ہے۔" بلال دروازے پر آ کر بولا مگر وہ اندر نہ آیا تھا۔

"اچھا، اللہ حافظ!" داؤد نے اسے گلے لگایا تو وہ بے تحاشا رو دی۔ اور پھر اس کے چپ کراتے کراتے داؤد کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

"شرم........ شرمین!........ کیا ہوا؟" وہ گھبرا گیا۔

"امی!........ ابو!........ جلدی آئیں۔" داؤد کی تیز آواز پر سب ہی دوڑے آئے تھے۔ اسے بیڈ پر لٹایا۔

ممانی پریشان ہو رہی تھیں۔ ماموں، ڈاکٹر کو فون کرنے لگے۔ داؤد پریشان تھا، اسے شپ پر رپورٹ کرنی تھی اور وہ شرمین کو ایسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر ذکیہ ان کے ساتھ والے گھر ہی میں رہتی تھیں۔ اتفاق تھا کہ گھر میں موجود تھیں۔ وہ فوراً آ گئیں۔

شرمین کا چیک اپ کرنے کے بعد وہ بولیں۔

"مسز کمال! پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ کی بہو کمزور ہے اور فرسٹ بے بی میں ایسا ہو جاتا ہے۔ پھر میاں کے جانے کا دکھ۔ تو ان سب باتوں کو نہیں سہار سکیں۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ یہ ہوش میں آ جائیں تو یہ دوائیں دے دیجئے گا۔" ڈاکٹر ذکیہ کا قلم تیزی سے نسخہ لکھنے میں مصروف تھا۔

اور ممانی جان کی تو مارے خوشی کے آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔ پھر وہ جلدی سے کمرے

سے نکلیں۔ داؤد اور کمال احمد پریشان تھے۔

"خیریت تو ہے امی؟"

"بھئی، میں دادی بننے والی ہوں۔"

"رئیلی حمیدہ؟......یعنی میں دادا۔" کمال احمد کی خوشی کا انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ وہ حیران رہ گئیں۔ اتنے خوش تو وہ کبھی اپنی اولاد کی خبر سن کر بھی نہ ہوئے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھیں، وہ داؤد کو لپٹائے کہہ رہے تھے۔

"بھئی، اب تم جاؤ۔ وہ خیریت سے ہے۔"

اور داؤد کو عجیب سی شرم نے گھیر لیا۔ وہ شرمین کی طرف آنے کے بجائے باہر نکلتا چلا گیا۔

⊛......⊛......⊛

شرمین اب اسکول جانے لگی تھی۔ وہ واپس آتی تو ممانی دوپہر کا کھانا پکا چکی ہوتیں۔ اس کے آتے ہی گرم گرم پھلکے پکاتیں کہ دوپہر کو وہی دو گھر میں ہوتی تھیں۔ کمال احمد آفس سے شام کو آتے اور بلال بھی یونیورسٹی سے سہ پہر کے بعد ہی آتا تھا۔ شرمین، ممانی کو منع بھی کرتی کہ وہ آ کر پکا لے گی، مگر وہ مانتی ہی نہ تھیں۔

"لو، تمہارے آنے تک میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہوں۔ میرا وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔ اور یوں بھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

شام کو بھی ممانی اس کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتیں۔ صفائی ستھرائی تو رجو کر دیتی تھی، جبکہ کھانا گھر کی خواتین کی ذمہ داری تھی کہ کمال احمد کو پسند نہ تھا، نوکر ہانڈی پکائیں۔

نصیر بھائی چھ ماہ کی چھٹی گزار کر جا رہے تھے اور جانے سے پہلے ان کے دوست یاسر کی مہرین سے منگنی بھی ہو گئی تھی۔

اماں کا نصیب اچھا تھا کہ داماد اچھے ملے تھے۔ یاسر نے کہا تھا کہ وہ تین ماہ بعد آئیں گے تو شادی کریں گے۔

گھر میں مہرین کی شادی کی تیاریاں تھیں۔ نصیر بھائی کے جاتے ہی تمکین آپا پھر میکے آ گئی تھیں۔ ایک تو وہ پھر "اُمید" سے تھیں، معقول بہانا تھا۔ پھر مہرین کی شادی کی تیاریاں... چچی جان نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا کہ اب دوسری بہو ان کے پاس تھی۔

پھر ایک روز اماں اسے بھی لینے آ گئیں۔ تمکین آپا بھی ساتھ تھیں۔

"چلو شرمین! تیار ہو جاؤ۔" انہوں نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"کہاں......؟" شرمین چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے رک گئی۔

"بھئی، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔" اماں نے فخر سے کہا۔

"کیوں......؟" وہ مسکرائی۔

"کیا میکے والے لینے نہیں آ سکتے؟" تمکین نے پوچھا۔

"ابھی پچھلے ہفتے تو میں دو روز رہ کر آئی تھی۔"

"کیوں بھئی؟" اب ممانی جان بھی بولی تھیں۔

"ظاہر ہے، داؤد تو ہے نہیں۔ اب یہ یہاں کیا کرے گی؟" اماں نے جواب دیا۔

"جن عورتوں کے مرد روزگار کے لئے باہر گئے ہوں، کیا ان کی بیویاں میکے جا بیٹھتی ہیں؟" ممانی نے کہا۔

"تمکین بھی تو میرے پاس رہ رہی ہے۔ پھر ماں تو ماں ہوتی ہے۔" اماں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ ممانی کچھ کہتیں، شرمین بولی۔

"اماں! یہ میرا گھر ہے۔ اور داؤد بے شک گھر میں ہوں یا نہ ہوں، میں انہیں گھر میں موجود پاتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" شرمین نے ایک دم فیصلہ سنا دیا۔

"اے لو...... یہ نرالی منطق ہے تمہاری۔ ایسی حالت سے ہو۔ سارا دن کام کرتی رہو۔ ساس کی جوتیاں سیدھی کرو، بس......"

شرمین کو پتہ تھا، اماں شروع ہوئیں تو ان کو چپ کرانا مشکل ہوگا۔ وہ ان کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔

"یہی میری جنت ہے اور مجھے یہاں سے نہ لے جائیں۔"

"بیٹا! مہرین کی شادی کی تیاری کرنی ہے۔" اماں نے پینترا بدلا۔

"آپا ہیں نا، پھر اب تو رخشی بھابی بھی ہیں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"پھر بھی تمہاری بات اور ہے۔"

"اچھا...... میں آ جاؤں گی۔" شرمین نے جان چھڑائی۔

"کب؟" اماں نے پوچھا۔

"دو چار روز تک۔" شرمین نے کہا۔

"آ جانا پھر" جاتے جاتے بھی اماں نے تاکید کی تھی۔ مگر اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا، میکے جانے کو۔

اسے تو نری منافقت ہی لگتی تھی وہاں........ جو اماں اور تمکین آپا نے پھیلائی ہوئی تھی۔

پتہ نہیں، دل میں بغض رکھ کر لوگ کیسے ہونٹ پھیلا کر ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔

⊛......⊛......⊛

دن وقت کے تھال میں سکے بن کر گرتے رہے اور پھر مہرین کی شادی کا دن آن پہنچا تھا۔ ساتھ ہی امبرین کی بھی شادی تھی، جو ان کے خالہ زاد شرجیل سے ہو رہی تھی۔ شرجیل بنک میں سیکنڈ آفیسر تھا اور امبرین اسے اتنی پسند آئی تھی کہ اس نے ضد کر لی تھی، فوری شادی ہو۔ نفیسہ خالہ مان گئی تھیں۔

حالانکہ امبرین کا ابھی فورتھ ایئر تھا اور وہ پڑھنا چاہتی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ شادی کے بعد بھی وہ کالج جاتی رہے گی۔ یاسر کو صرف پندرہ روز کی چھٹی ملی تھی اور وہ عین مہندی والے دن ہی آیا تھا۔ نصیر بھائی نہ آ سکے تھے۔ تمکین آپا ساری تقریب میں اُداس پھرتی رہی تھیں۔ شرمین کا تو خیال تھا کہ آپا "بن" رہی ہیں........ اگر نصیر بھائی سے انہیں محبت ہوتی تو لازمی ان کے والدین سے بھی محبت کرتیں۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو شرمین، اماں کے روکنے کے باوجود اپنے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ تب اماں بولیں۔

"اب تم یہیں رہو۔"

"اماں! ممانی اکیلی ہوتی ہیں۔" شرمین نے کہا۔

"تم نے ٹھیکہ تو نہیں اٹھایا۔" اماں نے تنک کر کہا۔

"شاید اٹھا ہی لیا ہو۔" وہ مسکرائی اور بلال کو فون کرنے کے لئے بڑھی کہ رخشی نے کہا۔

"ہم بھی امی کی طرف جا رہے ہیں شرمین! ہمارے ساتھ چلی چلو۔"

"ہاں، نند کو نکالو۔ تم کب چاہتی ہو، میری بیٹیاں یہاں رہیں۔" اماں کو تو موقع چاہئے تھا۔

"شرمین! کر دو بلال کو فون۔" رخشی کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تب شرمین نے کہا۔ "اماں! کبھی تو کسی کا لحاظ کر لیا کریں۔"

"کیا لحاظ کروں؟" وہ گرجیں،

"میں خود جا رہی تھی۔ اگر بھابی نے کہہ دیا تو کوئی جرم ہو گیا تھا؟ اگر........ اگر ایسا ہی رہا تو آپ بیٹا گنوا بیٹھیں گی۔"

"وہ میرا بیٹا ہے۔ تمہاری ساس اور بیوی کے کہنے میں آنے والا نہیں۔" اماں فخر سے بولیں۔

"آنکھیں سب رکھتے ہیں۔" شرمین نے کہا اور گھر فون کرنے لگی۔ فون کر کے وہ رخشی کے کمرے کی طرف بڑھی۔

دروازے پر دستک دی تو رخشی کی آواز آئی۔

"آ جائیں۔"

"میں ہوں جناب!" شرمین نے شوخی سے کہا۔

"مجھے پتہ تھا، تم ہی ہو گی۔" وہ مسکرا دی۔ شرمین اس کے قریب بیٹھی۔

"وہ........ رخشی! تم........" شرمین نے کہنا چاہا۔

"ارے چھوڑیں بھابی! پھپھو کی تو عادت ہے۔ اگر ان ذرا ذرا سی باتوں کو دل پر لیں تو ٹی۔ بی ہو جائے گی۔" رخشی نے ہنس کر کہا۔

"اماں کی عادت ہے۔ وہ کسی کو بھی نہیں بخشتیں۔" شرمین وضاحتیں کر رہی تھی۔

"ابھی تو پتہ چلے گا، جب پھپھو کا چھوٹی پھپھو سے معرکہ ہو گا۔" رخشی ہنس کر بولی۔

"کیا مطلب؟" شرمین نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی، اب یہ بہنیں سمدھن بنی ہیں، تم دیکھنا۔" رخشی نے بتایا۔

"مجھے پتہ ہے، برابر کی چوٹ ہے۔ مگر جیت اماں کی ہو گی۔" شرمین وثوق سے بولی۔

"کبھی کبھی ہمیشہ جیتنے والے ہار بھی جاتے ہیں۔" رخشی نے کہا۔

"یہ بھی ہے۔" شرمین نے کہا۔ "اچھا، تم لوگ آؤ گے رات کو؟"

"پھر سہی۔ ابھی پھپھو کا موڈ آف ہے۔ ایک دو دن تک آؤں گی۔"

"چلو، جیسی تمہاری مرضی۔" شرمین نے اسے گلے لگایا اور باہر آ گئی۔

اسے گھر آئے ابھی گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ داؤد آ گیا اور اسے اچانک سامنے پا کر اسے جو خوشی ہوئی، وہ بیان نہ کر پا رہی تھی۔ اور ممانی اسے گلے لگائے کہہ رہی تھیں۔

"تم نے آنے کی اطلاع ہی نہ دی۔"

"میں اچانک آ کر سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" وہ شوخی سے شرمین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

پھر وہ بلال سے ملا اور پوچھا۔

''ابو کہاں ہیں؟''

''آفس سے نہیں آئے۔'' ممانی نے بتایا۔

''اوہو! مجھے اپنی بیوی سے تو ملنے دو۔''

داؤد اس کی طرف بڑھا تو وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا، جیسے پہلی بار محبت کا احساس پا کر دھڑکا تھا اور شرم سے اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ تب ہی داؤد کمرے میں آ گیا اور اسے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کہاں چھپے۔

⊛......⊛......⊛

داؤد گھر کیا آیا کہ خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔ اور رشتہ دار اس سے ملنے آ رہے تھے۔ رخشی بھی ملنے آئی تھی۔ اور پھر شرمین کے روکنے کے باوجود بھی چلی گئی تھی۔

''مت روکا کرو اسے بیٹا! اپنے گھر کی عادت پڑنے دو۔'' ممانی نے اسے سمجھایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

پھر دن گزرنے کا پتہ نہ چلا۔ اتفاق تھا کہ صرف تیرہ روز بعد ہی داؤد کو واپس بلا لیا گیا۔

''جی چاہ رہا ہے، یہ نوکری چھوڑ دوں۔'' وہ چڑ سا گیا۔

''کیوں؟'' شرمین نے اس کے کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نا۔ ابھی تو تمہیں مکمل دیکھ بھی نہیں پاتا کہ بلاوا آ جاتا ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''ملکوں ملکوں گھومتے ہیں۔''

''تم ساتھ ہو تو گھومنے کا مزا بھی آئے۔''

''آخر پہلے بھی تو جاتے تھے۔'' شرمین نے کہا۔

''پہلے اور بات تھی، اب تم بن دل نہیں لگتا۔'' داؤد کے لہجے میں آنکھوں میں اس کے لئے محبت ہی محبت تھی۔

''دل لگائیں نا........ یوں تو گزارا نہیں ہوگا۔''

''تم پتہ نہیں، کیسے رہ لیتی ہو؟'' داؤد پوچھ رہا تھا اور وہ مسکرا کر رہ گئی۔ اب کیا کہتی؟ کہ تم بن میرا دل بھی نہیں لگتا۔

ہر جا مجھے تم نظر آتے ہو۔ اور جب چھونے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہوں تو تم غائب

ہو جاتے ہو۔

تمہارے جذبوں اور محبتوں کی بارش میں، میں بھیگ جاتی ہوں اور پھر صبح ہو جاتی ہے۔ مجھے تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ تم دُور ہو۔

وہ اُس کے کپڑے رکھتی رہی اور داؤد اسے دیکھتا رہا۔

⊛......⊛......⊛

مہرین کی شادی کے بعد پندرہ دن تو سسرال رہی تھی۔ یاسر کے جاتے ہی دوسرے روز اماں اسے رہنے کے لئے لے آئی تھیں اور اب مہینہ بھر سے یہیں تھی۔ اب اس کی ساس لینے آئی تھیں۔

''بھئی عشرت بہن! اب مہرین یہیں رہے گی۔'' اماں نے کہا۔

''کیوں؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگیں۔

''یاسر تو دُبئی چلا گیا ہے اور پھر مرد نہ ہو تو عورت اُداس ہو جاتی ہے۔ یاسر آ جائے گا تو چلی جائے گی سسرال۔'' اماں نے جواب دیا۔

''دیکھئے صابرہ بہن! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ دنیا کیا کہے گی کہ پہلا بیٹا بیاہا اور بہو چلی گئی۔'' عشرت جہاں نہایت نرم لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''بھئی، آپ کا بیٹا خود مجھے کہہ گیا ہے، مہرین کا خیال رکھوں۔ اب دیکھیں نا، آپ کے گھر رہے گی تو میں کیسے خیال رکھ پاؤں گی؟'' اماں کہہ رہی تھیں۔ ''اب جب تک یاسر نہیں آئے گا، یہ یہیں رہے گی۔''

''بہن! خدا کا خوف کریں۔ ابھی صرف ڈیڑھ مہینہ شادی کو ہوا ہے اور آپ مہرین کو یہاں بٹھا رہی ہیں۔ یہ آپ اچھا نہیں کر رہیں۔''

''بھئی اچھا ہے یا برا۔ میری بیٹی یہیں رہے گی۔'' اماں نے تو آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

آخر اماں نے مہرین کو جانے نہ دیا اور عشرت جہاں کفِ افسوس ملتی ہوئی چلی گئیں۔

''میری بچی میرے پاس نہ رہے، بھلا اتنا بڑا خاندان، ان کی تو خدمتیں ہی کر کر کے مر جائے گی۔ ایک تو وہ بڑی بہو۔ داود بیگم کے چونچلے ہی نہیں ختم ہوتے۔ ہر وقت کھاتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی یخنی، کبھی دودھ، کبھی حلوہ۔ مہرین سب کی فرمائشیں ہی پوری کرتی رہے۔ ایک نہ دو، پوری چھ نندیں، چار دیور، ساس سسر۔ نندیں کالج یونیورسٹی چلی جائیں۔ کام تو اسے ہی کرنا پڑے۔ پھول جیسی بچی کو میں کیوں بھیجوں۔ چلو اپنا میاں ہو تو

ذرا ساس دب کر رہتی ہے اور وہ تو ہوا باہر........"

اماں اپنا فلسفہ بگھار رہی تھیں اور تمکین ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

اسی طرح امبرین بھی کالج سے روز آ جاتی اور شام کو شرجیل بینک سے واپسی پر آتے ہوئے لے جاتا۔ اکثر رات کا کھانا وہ لوگ کھا کر جاتے تھے۔

شرمین اپنی ماں کی کم عقلی پر کڑھتی رہتی۔ آخر کہتی تو کیا؟........ البتہ اس نے بہنوں کو سمجھانا چاہا۔ مگر مہرین کی تو ایک ہی رٹ تھی۔

"باجی! آپ کو علم نہیں، وہاں بہت کام ہے۔"

"کام کی عادت ڈالو گی تو کرو گی۔ اور ضروری تو نہیں کہ سب کام تمہارے ذمہ ہو۔ تین چار تو ان کے گھر میں نوکر ہیں۔ آخر نندیں بھی تو تمہاری کام کرتی ہوں گی۔" شرمین نے کہا۔

"اماں کہتی ہیں، میں نے کام کرنا شروع کیا تو پھر سب بیٹھ کر کھائیں گی۔ آہستہ آہستہ سب کچھ میرے سر تھوپ دیں گی کہ جی بڑی بہو ہوں۔" مہرین منہ بنا کر بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ تم ان سب کے دل میں گھر کرو۔" شرمین نے کہا۔

"اسے سمجھانا فضول ہے۔" امبرین بھی وہیں آ گئی تھی۔

"تو تم کون سی عقل مند ہو؟" شرمین اس پر الٹ پڑی۔

"کیوں، میں نے کیا بے عقلی کی؟" امبرین ہنسی۔

"تم کالج سے گھر بھی جا سکتی ہو۔ حالانکہ تمہارا گھر دو اسٹاپ پہلے پڑتا ہے۔ تم یہاں آ جاتی ہو۔" شرمین نے کہا۔

"میں مہرین کو کمپنی دینے آتی ہوں۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ تب ہی اماں بھی عصر کی نماز پڑھ کر آ گئی تھیں۔ تب شرمین بولی۔

"اماں! آپ انہیں بھیجیں ان کے سسرال۔"

"اُوئی، تجھے کیا تکلیف ہے؟" اماں کو جیسے بچھو نے ڈنک مار لیا۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ مگر اماں! انہوں نے تمام عمر اسی گھر میں رہنا ہے۔ ابھی سے وہاں جگہ بنائیں گی تو........"

"بس، بس........ رہنے دے۔ مجھے نہ پڑھا۔ تیری کمائی نہیں کھا رہیں۔ اللہ رکھے، تمکین کا میاں بھی بھیجتا ہے اور یاسر بھی ہر ماہ ڈرافٹ بھیج رہا ہے۔ جب سہولت سے سب مل رہا ہے تو ساس کے آگے ہاتھ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا جمع کر رہی ہے،

کل کو کام آئے گا۔" اماں کہہ رہی تھیں۔

"بھئی اماں! رخشی! کہاں ہو؟" سفیان آوازیں دیتا ہوا آ گیا۔

"السلام علیکم بھائی!" شرمین نے سوال کیا۔

"تم کب آئیں؟"

"میں بلال کے ساتھ آئی تھی۔ ممانی کو چچی جان کے ہاں جانا تھا تو بلال مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ شام کو لے جائے گا۔" شرمین نے بتایا۔

"تو رہ جاؤ۔" سفیان صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بس، ملنا ہوتا ہے، مل لیا۔"

"داؤد کب آ رہا ہے؟"

"شاید اگلے ماہ۔" شرمین کے چہرے پر شفق پھوٹی۔

"پھر میری ملاقات تو نہ ہو سکے گی۔" سفیان بولا۔

"کیوں........ تم کہاں جا رہے ہو؟" اماں ایک دم بولیں۔

"میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے، اسلام آباد۔" سفیان نے بتایا۔

"کب........؟" اماں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

"آج ہی آرڈرز ملے ہیں اور فوراً جوائن کرنا ہے۔" سفیان نے بتایا۔

"رخشی! تم میرا ضروری سامان پیک کر دو، اور ہاں اپنا سامان بھی تیار کر لو۔" وہ رک کر بولا۔

"یہ تمہارے ساتھ جائے گی؟"

"نہیں، یہ اپنے گھر جائے گی۔ یعنی ماموں جان کے ہاں رہے گی۔"

"کیا مطلب........؟" اماں کا ماتھا ٹھنکا۔

"بھئی، میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ یہ یہاں کیا کرے گی؟"

"کیا ہم نہیں ہیں؟" تمکین غرائیں۔

"یہ تو ہمارے گھر کی ریت ہے۔ میاں گھر میں نہ ہوں تو سسرال میں رہنا جرم ہوتا ہے۔ تو میری بیوی یہ جرم کیوں کرے؟" سفیان ہنس کر بولا۔

"تم جاؤ، رخشی یہیں رہے گی۔" اماں نے فیصلہ سنا دیا۔

"ایسا تو نہیں ہو سکتا۔"

"تم تین جگہ خرچہ کس طرح کرو گے؟" تمکین نے کہا۔

"تین جگہ کیسے؟"

"بھئی تمہارا اپنا خرچ، پھر رخشی کو بھی رقم بھیجو گے، پھر ہمیں بھی........" اماں نے ایک دم جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"رخشی کو بھی بھیجوں گا اور اپنا خرچ بھی ہے۔ اب میری اتنی تنخواہ نہیں ہے کہ میں یہاں بھی پیسے بھیجوں۔ ابا کی کمائی میں پورا کریں۔ اور یوں بھی دو چار ماہ تک میں سیٹ ہو جاؤں گا تو رخشی کو وہیں بلا لوں گا۔" سفیان نے کہا اور پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔

"میں ذرا آرام کرلوں، شام کو کام سے جانا ہے۔"

"یہ سب رخشی کی چال ہے۔" سفیان کے جانے کے بعد اماں بولیں۔

"اماں! فضول میں فردِ جرم نہ عائد کیا کریں۔ سفیان نے ابھی تو آ کر بتایا ہے۔ ان کی تو آپس میں بات ہی نہیں ہوئی ہے۔" شرمین کو تپ چڑھ گئی تھی۔

"تم نہیں جانتیں، گھنی ماں کی گھنی بیٹی ہے۔" اماں کسی طرح بھی رخشی کو معاف کرنے پر تیار نہ تھیں۔

"خیر، اب یہ تو آپ کے بیٹے کا فیصلہ ہے۔" شرمین نے کندھے اچکائے۔

اسی وقت بلال اسے لینے آ گیا تھا۔ وہ گھر آئی تو آتے ہی اس نے ممانی کو سفیان کے تبادلے کا بتایا اور رخشی کے یہاں آنے کا بھی تو وہ حیران ہوئی کہ ممانی، رخشی کے آنے کا سن کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"رخشی کو وہیں رہنا چاہیے، میں سفیان کو سمجھاؤں گی۔"

"کمال ہے، ہماری اماں تو بیٹیوں کو خود لے آتی ہیں۔ اور آپ........" شرمین نے ہنس کر کہا۔

"بیٹا! تمہاری اماں کی بات اور ہے۔ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتیں۔ نہ کسی کی سنتی ہیں۔ انہیں کیا پتہ، خاندان والے کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔ سامنے تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کسی تقریب میں جاؤ، صابرہ آپا کا ذکر سن لو۔ پھر تمہیں کیا کہوں، لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تمکین اور مہرین اس لئے میکے رہتی ہیں، ان کے دیدے محلے میں لڑے ہوئے ہیں۔"

"نہیں ممانی!" شرمین کو لگا، جیسے اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹی ہو۔

"یہی بات بارہا سنی، رضیہ آپا بھی وضاحتیں کرتی ہیں، میری بہو ایسی نہیں۔ مگر لوگوں کی زبان کون پکڑے۔ تمہاری اماں کو کوئی کیا کہے۔ کسی میں عزت افزائی کی ہمت نہیں۔"

ممانی کیا کہہ رہی تھیں۔ اس سے نہ سنا جا سکا۔ اسے دکھ تو یہ تھا کہ اس کی اتنی شریف

اور پارسا بہنوں پر الزام دھرا جاتا تھا اور صرف اماں کی بے وقوفی سے۔

اس سے تو بہتر تھا، اماں بیٹیاں نہ بیاہتیں۔ تاکہ خاندان میں ایسی باتیں تو نہ ہوتیں۔

⊕......⊕......⊕

رخشی باوجود اماں کی مخالفت کے، میکے آ گئی تھی کہ سفیان کی یہی خواہش تھی اور اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ گھر سے کوئی بھی لینے آئے، تمہیں نہیں جانا۔ اگر ابا لینے آئیں تو چلی جانا۔

یہ بات سفیان نے شرمین کے سامنے کی تھی۔ اور شرمین کو یقین تھا، ابا بہو کو لینے نہیں آئیں گے۔ سفیان ہر دوسرے روز فون کرتا تھا۔ پھر مہینے بعد اس نے رخشی کے لئے دو ہزار روپے بھی بھیجے تھے، تب بھی ممانی نے اسے منع کیا تھا۔ مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے۔

دن بڑی سرعت سے گزر رہے تھے کہ ایک شام شرمین نے پیارے سے بیٹے کو جنم دیا اور تیسرے روز جب وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئی تو اماں زبردستی اسے چھلہ کرانے گھر لے آئی تھیں۔

ممانی نے بھی منع نہ کیا تھا کہ یہ رسم تھی، پہلا بچہ میکے میں ہوتا ہے۔ جب کہ شرمین اس رسم کو توڑنا چاہتی تھی۔ پھر جب ممانی ہی راضی تھیں تو وہ کیا کرتی۔ داؤد ان دنوں فرانس گیا ہوا تھا، ممانی روز آتیں۔ ماموں بھی چکر لگا لیتے اور بلال تو صبح شام "چھوٹو" کو دیکھنے آتا تھا۔ ماموں نے اس کا نام یونس رکھا تھا، مگر بلال اسے چھوٹو ہی کہتا۔

امبرین کے پیپر ہو گئے تھے اور وہ اب بھی میکے ہی میں رہ رہی تھی۔ بقول اس کے۔

"شرجیل صبح آفس چلے جاتے ہیں۔ میں سارا دن اکیلی کیا کروں' خالہ کی جوتیاں تو سیدھی نہیں کر سکتی۔ نہ مجھ سے کام ہوتا ہے۔"

اس لئے اس کی روٹین تھی، شرجیل اسے چھوڑ جاتا اور شام کو لے جاتا۔ البتہ وہ اتوار کا دن سسرال میں گزارتی تھی۔ ادھر یاسر کا مطالبہ تھا کہ مہرین گھر جائے۔ اس نے خرچہ بھیجنا بھی بند کر دیا تھا۔ اور اماں کا خیال تھا کہ عشرت جہاں نے اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ نصیر کو بھی بہکا دیا ہے کیونکہ دو ماہ سے نصیر بھائی بھی تمکین آرا کا خرچ نہ بھیج رہے تھے۔ بلکہ اب تو فون بھی نہ کرتے۔

عشرت جہاں آئی تھیں، شرمین کے بیٹے کو دیکھتے تو اماں کے سامنے کہنے لگیں۔

"تم اب یہیں رہو گی؟"

"میں دو چار روز تک چلی جاؤں گی۔"

"تمہارے میاں کب آ رہے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ تو شاید آئندہ ماہ آئیں۔" شرمین نے بتایا۔

"پھر فائدہ وہاں رہنے کا، جب میاں ہی نہیں۔" عشرت جہاں کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"گھر تو میرا ہے۔" شرمین بولی۔

"یہ بات صابرہ بیگم کی بیٹی کہہ رہی ہے۔" عشرت جہاں نے بھنویں اچکائیں۔

"اے بہن! تم یہاں طعنے دینے آئی ہو؟" اماں تڑپ کر بولیں۔

"میں تو آپ ہی کی بات کر رہی ہوں، لیکن آپ بھی سن لیں کہ اب مہرین ہمیشہ یہیں رہے گی۔ چاہے یاسر آ بھی جائے۔ کیونکہ وہ یہ رشتہ ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"آنٹی! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" شرمین حیران تھی۔

"ہاں بھئی، تمہاری ماں کو بیٹیوں کے گھر بسانے نہیں آتے۔ چلو، تمکین رشتہ داروں میں بیاہی ہوئی ہے۔ خاندان کا ڈر خوف ہوتا ہے۔ ہم تو غیر ہیں۔ ہم رشتہ توڑتے ہوئے کچھ نہیں دیکھیں گے۔ اور پھر لڑکوں کے لئے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ یاسر آئے گا تو اس کی دوسری شادی کر دوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ مہرین کی اجازت کے بغیر۔" اماں نے کہنا چاہا۔

"جب اس سے رشتہ ہی نہیں ہوگا تو اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ جلد آپ لوگوں کو کاغذ مل جائے گا۔"

"آنٹی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟........میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"سیدھی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اپنی ماں سے پوچھو، جنہیں بیٹیوں کے گھر بسانے کا ڈھنگ نہیں آتا۔"

انہوں نے تلخی سے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔ اماں ہکا بکا بیٹھی تھیں۔ شرمین کو ماں پر بہت ترس آیا۔ وہ اٹھی اور اماں کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"سن لیا آپ نے۔ میں اسی لمحہ سے آپ کو بچانا چاہتی تھی۔ یہ تو رضیہ چچی تھیں، جو لحاظ کرتی رہیں۔ یہ غیر لوگ کیا لحاظ کریں گے۔ سنا تھا آپ نے، کتنے غرور سے کہہ رہی

تھیں، اب بھی وقت ہے آپ مہرین کو بھیج دیں۔"

"اب تو کبھی نہیں بھیجوں گی۔ دے دیں طلاق۔"

"پلیز اماں! یہ انگارہ صفت لفظ زبان پر نہ لائیں۔ صرف سات ماہ مہرین کی شادی کو ہوئے ہیں۔ آپ امبرین کو بھی کہا کریں، گھر رہا کرے۔ آخر لوگ بہو بیاہ کر لے جاتے ہیں، گھر کی رونق کے لئے۔ جب بہوئیں گھر نہ رہیں تو بیٹے بیاہنے کا فائدہ؟" شرمین نے کہا۔

اور آج پہلی بار، اماں اڑ کر اس پر نہ جھپٹی تھیں، بلکہ ان کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

اور اسی وقت تمکین آپا روتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟........کیا ہوا آپا؟" شرمین کا دل بیٹھنے لگا۔

"اماں!........اماں!........یہ نوٹس آیا ہے، نصیر کی طرف سے۔"

"کیسا نوٹس؟" شرمین نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

اور پھر پڑھنے کے بعد طویل سانس لے کر بولی۔

"اماں! اب نصیر بھائی نے بھی طلاق کا پہلا نوٹس بھیج دیا ہے........ یوں سمجھ لیں، تمکین آپا کو ایک طلاق ہو گئی، ابھی دو رہتی ہیں۔ اور تین ماہ کے اندر اندر وہ بھی ہو جائے گی۔" شرمین نے کہا۔

"اماں!........اماں! میں اپنے گھر جاؤں گی۔ میں اپنے بچوں کو باپ کے زیر سایہ پالنا چاہتی ہوں۔ مجھے چھوڑ آئیں۔" تمکین نے روتے ہوئے کہا۔

"میں چھوڑ آؤں؟" اماں نے حیرت سے کہا۔

"لے کر بھی تو آپ آئی تھیں۔" تمکین آپا آخر اماں کی بیٹی تھیں، کیسے تنک کر جواب نہ دیتیں۔

"اے بی! جانا ہے تو خود جاؤ۔ اور یوں بھی تمہاری مرضی ہوتی تھی تو میرے ساتھ آتی تھیں۔ سسرال میں رہنا تمہیں پسند نہ تھا۔ ایک ساس، ایک نند تم سے برداشت نہ ہوتی تھیں۔ آخر نرگس بھی تو وہیں رہ رہی ہے۔" اماں ایک دم ہی پینترا بدل بیٹھی تھیں۔

"اماں! یہ وقت لڑنے کا نہیں ہے۔ آپ اپنا قصور بھی مانیں، سارا قصور تمکین آپا کا بھی نہیں ہے۔" شرمین نے کہا۔

"میں تمہیں بھی تو کئی بار لینے گئی۔ تم تو نہ آئیں۔" اماں کہہ رہی تھیں اور شرمین سوچ

رہی تھی۔

مجھے تو ایک ہی ٹھوکر کافی تھی، جب میرا دل اُجڑا تھا اور.......اور اس نے کہا تھا۔

"شرمین! اگر تم نے ماں کی بات مانی تو کبھی اپنا گھر نہ بسا سکو گی۔" اور اس جملے کو میں نے اپنی زندگی کی اساس بنا لیا تھا۔

"شرمین! تم کچھ کرو۔" تمکین نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا کروں.......؟" وہ بولی۔

"میں اُجڑنا نہیں چاہتی۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"اچھا، میں سوچتی ہوں۔ تم اپنا سامان پیک کرو۔"

تمکین اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اماں بھی برآمدے میں تخت پر جا کر بیٹھ گئی تھیں۔ تب شرمین نے نصیر بھائی کو فون کر دیا۔

"یہ.......یہ کیا، کیا ہے آپ نے، نصیر بھائی؟"

"اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، شرمین!"

"نصیر بھائی! آپ آپا کو کہتے کہ گھر جائیں۔"

"بارہا کہا، مگر وہ کہتی تھی، آپ ہوں گے تو جاؤں گی۔ آخر شرمین! مجھے بھی والدین پیارے ہیں۔ میری ماں بیمار رہتی ہے۔ کیا یہ میری ماں کی خدمت نہیں کر سکتی؟"

"کر سکتی ہے۔ بس آپ نوٹس واپس لیں۔ بچوں کا بھی آپ نے احساس نہیں کیا۔"

"جب بیوی اور آئے گی تو بچے بھی آ جائیں گے۔" وہ بے پروائی سے بولے۔

"پلیز نصیر بھائی! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آج ہی آپا کو بھیجتی ہوں اور آپ غصہ نہ کریں۔"

"اب ممکن نہیں۔"

"نصیر بھائی! آپ میری بات نہیں مانیں گے؟" اس نے مان سے کہا۔

"چلو، تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ مگر تمکین گھر پر رہے۔ چاہے میں ہوں یا نہ، جیسے دادو کے بغیر بھی تم ادھر ہی رہتی ہو۔"

"وہ رہیں گی۔"

"اور سنو، مہرین کو بھی سسرال بھیجو۔ یاسر بہت غصہ میں ہے۔" نصیر نے آہستہ سے کہا۔

"کیا.......؟"

"بس، میں نے بتا دیا ہے۔"

"اُف میرے خدا! کس کس محاذ پر لڑیں۔ آپ میری یاسر بھائی سے بات کرائیں۔"

اور پھر یاسر نے بھی وہی بات کہی، جو نصیر نے گول مول لفظوں میں کہی تھی۔

"آپ.......آپ آنٹی کو بھیجیں۔ میں مہرین کو......."

"میری والدہ بہت مرتبہ اسے لینے گئی ہیں، مگر آپ کی والدہ ہر بار کوئی بہانہ کر دیتی ہیں۔ مہرین سے بات کرو تو وہ کہتی ہے، طبیعت ٹھیک نہیں۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟" وہ سخت تپا ہوا تھا۔

"اوہ!" شرمین نے طویل سانس لی اور سوچنے لگی، عشرت آنٹی کتنی معاملہ فہم عورت ہیں۔ انہوں نے بیٹے کو کبھی نہیں بتایا کہ اماں ان کی کس قدر بے عزتی کر کے بھیجتی ہیں۔ تب شرمین بولی۔

"آپ اب اپنی امی کو بھیجیں۔ مہرین ان کے ساتھ جائے گی۔ اور.......اور آپ کی اجازت بلکہ ساس کی اجازت کے بغیر میکے بھی نہ آئے گی۔" شرمین نے محبت سے کہا۔

"آپ کہتی ہیں تو پھر بھیج دیتا ہوں۔" یاسر نے جیسے بادلِ نخواستہ کہا تھا۔

"شکریہ یاسر بھائی!" شرمین نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ وہ ریسیور رکھ کر پلٹی تو مہرین دروازے سے ٹیک لگائے آنسو بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شرمین اس کے قریب گئی اور بولی۔

"رونا نہیں۔"

مگر وہ تو اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"دیکھو مہرین! میں تمہیں سمجھاتی آئی ہوں۔ اماں اتنی سمجھ دار نہیں ہیں، جتنا بیٹیوں کی ماؤں کو ہونا چاہئے۔ ہمیں خود دیکھنا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہمارے لئے کیا چیز بہتر ہے۔ کہتے ہیں، اولاد سے عورت کے قدم گھر میں مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر آج پتہ چلا، ایسا نہیں ہوتا۔ عورت کے قدم صرف ایثار، محبت اور قربانی سے مضبوط ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ اولاد بھی مرد کے پاؤں کی بیڑی نہیں بنتی، ورنہ نصیر بھائی کبھی نوٹس نہ بھیجتے۔ پھر تمہاری تو گود خالی ہے، تم سسرال والوں کا دل جیت لیتیں۔ ان کی مرضی سے میکے آتیں تو آج یاسر نے اتنا بڑا فیصلہ نہ کیا ہوتا۔"

"اب کیا کروں؟" مہرین باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

"تیاری کرو۔ ساس آئیں تو ان سے معافی مانگنا اور اماں سے اجازت لے کر چلی

جاؤ۔"

"وہ لڑیں گی تو نہیں؟" مہرین خوف زدہ تھی۔

"تمہاری ساس بہت اچھی ہیں، انہوں نے بیٹے کو کبھی نہیں بتایا کہ اماں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتی رہی ہیں۔"

"سچ......؟" مہرین حیران تھی۔

"ہاں...... اور مہرین! یہ ساس کا رشتہ بڑا خوب صورت رشتہ ہوتا ہے۔ اگر ہم سمجھیں تو۔ انہیں تم سمجھو، پرکھو، محبت کرو تو تمہیں پتہ چلے گا۔ بن جانے، سمجھے، پرکھے تم کہو ساس اچھی نہیں ہوتی تو یہ اس رشتے کے ساتھ ناانصافی ہے۔" شرمین نے کہا۔

"اور ہاں، اب عشرت آنٹی کی اجازت کے بغیر تم گھر سے قدم نہیں نکالو گی۔"

"بہتر۔" مہرین سر ہلا کر رہ گئی۔

پھر شرمین نے چچی جان کو فون کر کے کہا۔

"اپنی بہو کو لینے آ جائیں۔"

"کیا......؟" وہ حیران تھیں۔

"میں راز بتا رہی ہوں۔ وعدہ کریں کہ کسی کو نہیں بتائیں گی۔"

شرمین نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"وعدہ...... کسی کو نہیں کہوں گی۔"

تب شرمین نے آہستہ آہستہ سب باتیں بتا دی تھیں۔

بس، اب آپ آ جائیں۔ لائن کلیئر ہے۔" ساری بات بتانے کے بعد شرمین بولی۔

"ہائے، خدا کا شکر ہے۔ اب میرے گھر میں بھی میرے بچوں کی چہکاریں گونجیں گی۔ میں شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔ توقیر آئے تو میں آتی ہوں۔" وہ بولیں اور شرمین نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

توقیر عرصہ ہوا، یہاں نہ آیا تھا۔ جب سے شرمین نے اسے بے اعتبار جانا تھا۔

اور پھر اس نے تمکین کو بتایا۔

"چچی جان آ رہی ہیں، آپ کو لینے۔ پہلے ان سے معافی مانگنا اور پھر ساتھ جانا۔ آپا! آپ خود سوچیں، اپنے بچوں کو دادا، دادی سے دور رکھ کر کون سا ثواب کما رہی ہیں؟ توقیر کے بچے ہو جائیں گے تو وہ اپنا دل بہلا لیں گی۔ مگر آپ کے بچے تو ان محبت کرنے والی گرم گودوں سے محروم رہیں گے۔ بس اب آپ چچی جان کی اجازت سے میکے آیئے گا۔

اور اس طرح کہ مل کر چلے گئے یا ایک آدھ دن رہ لیا۔ ڈیرے نہ ڈالیے کہ آپ کا اصل گھر وہی ہے، جہاں آپ بیاہ کر گئی ہیں۔"

شرمین کہتی رہی اور آج نہ اماں نے اسے ڈانٹا تھا، نہ تمکین آپا نے ٹوکا تھا کہ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔

"اور اماں! اب امبرین بھی یہاں دن گزارنے آئے تو اسے چلتا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی روز آپ دونوں بہنوں میں امبرین کی خاطر جھگڑا ہو اور لوگوں کو مزید ہنسنے کا موقع ملے۔ بیٹیاں اپنے گھر بستی ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپ پتہ نہیں کیوں انہیں یہیں رکھنے پر بضد رہیں۔"

"یہ خود کہتی تھیں اور شرمین بھی کہتی، چلو ابھی رہ لیں۔ پھر دو چار بچے ہو جائیں گے تو کیسے رہیں گی؟ پھر سفیان اور سبحان کی دلہنیں نہ رہنے دیں گی۔" اماں نے وضاحت کی۔

"اماں! شادی کے شروع میں لڑکی کا دل سسرال میں لگ جائے تو ٹھیک ہوتا ہے، ورنہ تاعمر اس کا دل نہیں لگتا۔ اب مجھے دیکھیں، یہاں میں مجبوری میں پڑی ہوں، دن گن رہی ہوں۔ کب چِلّہ ختم ہو اور میں جاؤں کہ ہوم سویٹ ہوم۔" وہ ماں کے گلے لگی تو وہ بولیں۔

"میری صرف تُو ہی عقل مند بیٹی ہے۔ انہوں نے تو میرا دماغ ہی الٹا کر رکھ دیا۔"

اماں نے اس کی پیشانی چومی تو ٹھنڈک اس کے اندر اُتر گئی۔

اور پھر اسی شام پہلے عشرت جہاں آ کر مہرین کو لے گئی تھیں۔ وہ سارے گلے شکوے اسی دہلیز پر چھوڑ گئیں اور جاتے جاتے بولی تھیں۔

"صابرہ بہن! آج میں مہرین کو لے جا رہی ہوں تو سمجھیں، آج ہی آپ نے بیاہا ہے۔"

"بھیجتی رہیے گا۔" اماں منمنائی تھیں۔

بھلا یہ اماں کا انداز کب تھا؟ شرمین نے سوچا۔

"آئے گی۔ مگر اسی طرح جیسے بیٹیاں آتی ہیں۔ اور دیکھیے گا، اپنے گھر میں یہ کس قدر خوش رہے گی۔ آخر وہی اس کا گھر ہے۔"

"بے شک...... بے شک۔" اماں نے سر ہلا کر کہا۔

مہرین کے جانے کے بعد چچی جان بھی توقیر کے ہمراہ آ گئی تھیں اور پھر تمکین آپا نے دیر نہ کی تھی ان کے ساتھ جانے میں۔ حالانکہ اماں، چچی جان اور توقیر کو کھانے پر روک

رہی تھیں، مگر تمکین آپا کہہ رہی تھیں۔

"پھر کبھی سہی۔"

اور شرمین سوچ رہی تھی۔ "گھر کی محبت جاگی ہے تو گھر کے بغیر رہا نہیں جا رہا۔"

مہرین اور تمکین کے جانے کے بعد اماں نے شکھ کی طویل سانس لی تھی۔ انہیں لگا، جیسے ان پر سے ٹنوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ اور شرمین سوچ رہی تھی، شکر ہے اماں مان گئیں اور میری عزت رہ گئی۔

اسی رات سفیان کا فون آیا تھا، اماں سے ساری رُوئیداد سن کر وہ بولا تھا۔

"اب میری بیوی کو بھی لے آئیں۔"

"تم خود چھوڑ گئے تھے۔" اماں نے شکوہ کیا۔

"آپ لے آئیں۔ بہو کے بغیر آپ کو گھر سُونا نہیں لگتا؟"

"لگتا تو ہے، مگر تم آؤ گے تو وہ آئے گی۔"

"جب میری بہنیں اپنی ساسوں کے ساتھ اپنے گھروں کو جا سکتی ہیں تو میری بیوی اپنی ساس کے ساتھ کیوں نہیں آ سکتی۔" وہ شوخی سے بولا۔

"حمیدہ نہیں آنے دے گی۔ میں جانتی ہوں۔"

"میں فون کر رہا ہوں اُدھر۔ آپ جانتی ہی تو نہیں ہیں ممانی جان کو۔ بس آپ رخشی کو لے آئیں۔" سفیان نے فون بند کیا تو اماں بولیں۔

"میں صبح ہی رخشی کو لینے جاؤں گی۔ اسے دیکھو تو اس کے بنا میرا گھر سُونا سا ہو رہا ہے۔ میرے گھر کا چراغ تو وہی ہے، میں تو یونہی مانگے کے چراغوں سے اُجالا کیے بیٹھی تھی۔"

اماں کے لہجے میں رخشی کے لئے محبت ہی محبت تھی۔

شرمین مسکرا دی۔ اسے لگ رہا تھا، اس کے چاروں طرف بہاریں رقصاں ہوں۔

آج اسے اپنی اماں ساری عورتوں سے زیادہ عقل مند لگ رہی تھیں۔

❀......❀......❀

شگوفہ اور شجر

ٹن......ٹن......ٹن......

سائیکل کی گھنٹی کی آواز جوں ہی شاداں کی سماعتوں سے ٹکرائی، وہ تقریباً بھاگتی ہوئی بلند چوباروں والے آہنی گیٹ پر پہنچ گئی۔

بندو، سائیکل کو بریک لگا ہی چکا تھا کہ وہ ایک دم ہی سامنے آ گئی۔ اگر بندو اپنی پوری اسپیڈ سے سائیکل چلا رہا ہوتا تو وہ یقیناً اس سے ٹکرا جاتی اور ہمیشہ کی طرح کھری کھری بھی بندو ہی کو سناتی۔ آج مقدر اچھے تھے، جو خدا نے عزت رکھ لی۔ اور یوں بھی جب وہ سامنے آتی تھی تو بندو کو لگتا، جیسے اُس کے دل کی بریکیں فیل ہو گئی ہوں۔ اور یہ تو بے جان سائیکل ہی تھی، جو کبھی کبھی اس کے اختیار میں نہ رہتی۔

"ارے بندو! حویلی والوں کا کوئی خط پتر آیا؟"

بندو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

""مسکائے جا رہا ہے...... بتا نا، کوئی خط شط آیا؟"

"ایک بات تو بتا، شاداں؟" بندو نے پوچھا۔

"پوچھو۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"تجھے حویلی والوں کے خط کی کیوں اڈیک (انتظار) رہتی ہے؟"

"ملکانی جی پوچھتی ہیں نا کہ بھئی شاداں! ابھی تک بندو نہیں آیا۔ وہی اڈیکاں رکھتی ہیں تو میں پوچھتی ہوں تم سے...... ویسے بھی میرا کون شہر میں بیٹھا ہے، جس کے خط کا میں انتظار کروں۔ بس ایک ماسی ہے اور ایک ماما، جو یہیں سکندر آباد میں ہی ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔" شاداں حسبِ معمول بغیر کوما اور فل اسٹاپ کے بولے گئی اور بندو اس کے صبیح چہرے پر نظریں جمائے نثار ہوتا رہا۔

”بتا........خط ہے........؟“ شاداں نے پوچھا۔

”ہے تو سہی۔“ وہ مسکرایا۔

”پھر نخرے کیوں کر رہا ہے؟........دے نا۔“ شاداں نے ہاتھ پھیلایا تو اس کی کلائی میں کھبا ہوا چاندی کا کنگن بج اٹھا، جس میں چھوٹے چھوٹے گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔

بندو نے اس کے ہاتھ پر سفید لفافہ رکھ دیا اور بولا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، شاداں!“

”کیا؟........مجھ سے پوچھو، میں سمجھاؤں۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔

”ملکانی جی کا پورا کنبہ شہر میں رہتا ہے، پھر بھی مہینوں بعد چھٹی آتی ہے۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں، جن کے بندے سعودی عرب اور دبئی میں گئے ہوئے ہیں۔ ہر ہفتے خط آتا ہے، کبھی کبھی تو ہفتے میں دو خط بھی آجاتے ہیں۔“

”وہ بندو!........ملکانی جی کی ٹلی فون (ٹیلی فون) پر گل بات ہو جاتی ہے نا۔ تو بھلا خط کی کیا ضرورت ہے؟ باہر کے ملکوں سے بھی ملکانی جی کے پوتے نواسے بات کر لیتے ہیں۔ دیکھ نا بندو، سائنس کی ترقی۔ تاروں کے ذریعے ہی باتیں ہوتی ہیں تو میں حریان (حیران) ہو جاتی ہوں۔ میں نے اللہ قسم، خود سنی ہے آواز۔“

”اچھا........“ بندو نے اپنی آواز میں حیرت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”سچی بندو!........تُو بھی سن........کینیڈا میں ہے، اشرف ملک اور بات یہاں ملکانی جی سے کر لیتا ہے۔ ملکانی جی کہتی ہیں، بہت فاصلہ ہے، بہت دور ہے وہ ملک۔“ شاداں اپنی معلومات کا رعب اس پر ڈال رہی تھی۔ حالانکہ یہ سب باتیں بندو کو پتہ تھیں مگر اس کے لئے وہ چند لمحے بہت قیمتی تھے، جو وہ شاداں سے باتیں کر کے گزارتا تھا۔ جان بوجھ کر اسے باتوں میں لگا لیتا۔ وہ اتنی معصوم تھی کہ بندو کی آنکھوں میں اپنے لئے شگوفے محسوس نہ کر سکتی۔

اسے بندو کی آنکھوں کی جھیلوں میں اپنا عکس ڈولتا نظر نہ آتا۔ اور بندو خود میں کبھی حوصلہ نہ کر پاتا کہ وہ اپنے جذبوں کی ہوا بھی شاداں کو لگا تا۔ وہ خود اپنے جذبوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی شدتوں کو بھی خود سے چھپا جاتا۔ مجبوری جو تھی۔ اور وہ مجبوری اس کی چار جوان بہنیں تھیں۔ ایک اس سے بڑی اور تین چھوٹی بہنیں، جو ابھی تک بابل کی دہلیز پر اس لئے بیٹھی تھیں کہ جہیز کے نام پر کچھ بھی تو نہ جڑا تھا۔ آج کل غیر تو غیر، اپنے رشتے دار بھی بھوکوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے ہیں، جہیز کے

لئے۔

بندو دو سال ہوئے، مڈل پاس کر کے پوسٹ آفس میں لگ گیا تھا۔ وہ بھی حویلی والی کی ملکانی کی مہربانی سے۔ کبھی کبھار وہ ملکانی جی سے سلام کرنے آتا یا کوئی چٹھی دینے تو شاداں سے سب سے پہلے ٹکراؤ ہو جاتا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا تھا کہ کس طرح شاداں اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ اٹھارہ اُنیس سال کا وہ لڑکا ہی تو تھا، جس کی ابھی مسیں ہی بھیگی تھیں اور چڑھتی جوانی کی یہ عمر تو ویسے بھی بہت خطرناک ہوتی ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا لگتی ہے۔ اور شاداں کی رنگت بھی تو گندم کی بالیوں کی طرح سنہری اور چمک دار تھی۔ تبھی تو وہ بندو کے قلب و نظر میں سما گئی تھی۔

وہ اپنے آنگنِ دل میں شاداں کی آہٹیں صاف سنتا تھا۔

بارہا تصور میں بندو نے اپنے ذہن کے پردے پر شاداں کا سایہ لہراتا دیکھا تھا۔ کتنی ہی بار اس نے شاداں کو اپنے اتنے قریب پایا تھا کہ بس ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔ مگر یہ تو بس تصوراتی دنیا تھی، جہاں کی سیر وہ جی بھر کر کرتا تھا۔ ورنہ حقیقت میں تو شاداں ہوا کا جھونکا تھی، جو بس اس کے دل کو چھوتا ہوا گزر جاتا تھا، جیسے اب ہوا تھا۔

شاداں خط لے کر حویلی میں واپس جا چکی تھی اور بندو کو لگ رہا تھا، جیسے کہ شاداں کو اس آہنی گیٹ نے نگل لیا ہو، جو حویلی کا صدر دروازہ تھا، جس کے بہت بڑے بڑے چوبارے تھے۔ اور دروازے کے دونوں طرف اونچے اونچے ستونوں پر پیتل کے گنبد تھے، جن پر حسین نقش بنے ہوئے تھے۔ سورج کی روشنی میں وہ سونے کی طرح چمکتے تھے۔ سورج بھی نکلتا تو ان بلند گلشنوں کو ہی سلامی دیتا تھا۔ اور یہ گلشن جگمگ کرنے لگتے۔

بندو نے آنے والے کل کے حسین تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارا اور سائیکل آگے بڑھ گئی۔

”ملکانی جی! چٹھی آئی ہے۔“ شاداں بھاگتی ہوئی ملکانی سکینہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور دوپٹہ ہمیشہ کی طرح لاپروا انداز میں آدھا اس کے سر پر تھا اور آدھا نیچے ڈھلکا ہوا تھا۔

ملکانی سکینہ، منظوراں سے سر میں مساج کروا رہی تھیں۔

”کس کا خط ہے جی؟“ شاداں نے خط ان کی گود میں ڈالا اور خود نیچے بیٹھ کر پلنگ پر کہنیاں ٹکا دیں۔

”کھولنے تو دے، تجھے تو بہت ہی جلدی رہتی ہے۔“ ملکانی سکینہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ احتیاط سے لفافہ چاک کیا اور اس میں رکھا کاغذ نکال کر پڑھنے لگیں۔ شاداں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازے لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر ایک دم ہی ملکانی سکینہ کی آنکھیں چمکنے لگیں اور چہرے پر نور ہی نور پھیل گیا۔

”شاداں......!“ مارے خوشی کے ان کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔

”خیر کی خبر تو ہے نا، ملکانی جی؟“ شاداں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”ہاں، خیر ہے......سنی آ رہا ہے۔“

”سن......نی......“ شاداں نے کہا۔

”ہاں، سنی......میرے تراب کا بیٹا......سکندر ملک آ رہا ہے۔“

”ملکانی جی! کیا شہر میں ایسے ہی نام ہوتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”بڑا اوکھا ناں ہے......وہ میں ٹونی قسم سے بڑی مشکل سے منہ چڑھا تھا ان کا نام......کیا شہر میں بھی کتے بلیوں والے ناں ہوتے ہیں؟“

”چل، بکواس نہ کر۔“ ملکانی سکینہ نے مشکل سے ہنسی کو روکا اور بارُعب لہجے میں بولیں۔ ”غفور کے ساتھ مل کر ذرا اوپر کے دونوں کمرے سنی کے لئے ٹھیک کروا دو۔“

”تو کیا وہ دو کمروں میں رہیں گے؟“

”اس نے لکھا ہے کہ اس کا دوست بھی ساتھ آ رہا ہے۔ شاید وہ بھی کچھ دن سکندر آباد میں رہے۔“

”اچھا جی۔“

”اور دیکھ شاداں پتر! سنی کے سامنے تُو نے کوئی شرارت نہیں کرنی۔“

”میں کب شرارتیں کرتی ہوں جی؟“

”یہ جو تُو بات بات پہ ہنستی ہے نا، تو ایسا نہ کرنا۔ سنی بہت غصے والا ہے، یوں ہی خفا نہ ہو جائے......سمجھ رہی ہے نا؟ جیسے تُو نے ٹونی کے ساتھ کیا تھا۔“

”یہ تو آپ انہیں سمجھایئے گا، ملکانی جی! کہ وہ ایسی حرکت نہ کریں کہ مجھے ہنسی آ جائے۔ اب دیکھیں نا، ٹونی ملک نہانے کے بعد تولیہ باندھے دھوپ میں چلے آئے تھے۔ اب یہ تو سکندر آباد ہے، ولایت تو نہیں نا؟“

”خیر بیٹا! دھیان رکھنا۔ سنی سب سے مختلف ہے اور بہت لئے دیئے رہنے والا ہے۔“

”بس جی، میں ان کے سامنے ہی نہیں جاؤں گی۔ نہ سامنا ہوگا، نہ وہ خفا ہوں گے۔“

”لو بھلا......یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک گھر میں رہ کر سامنا نہ ہو؟“

”میں ماسی کے گھر چلی جاتی ہوں۔“ شاداں نے کہا۔

”پھر میں کیسے رہوں گی؟“ ملکانی سکینہ نے شائستگی سے کہا۔

”اوہو، ملکانی جی! آپ کی یہی محبتیں تو شاداں کو مار دیتی ہیں۔“ شاداں نے ان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا اور پھر چوم لیا۔

”ہاں تو ملکانی جی! میں کمرے صاف کروا دوں نا؟“

”بالکل......دیکھو، تم کام میں مت لگ جانا۔“

”فکر نہ کریں جی......میں تو ہوں ہی کم چور۔ ویسے بھی حکم تو دے سکتی ہوں نا؟“ شاداں کی آنکھوں میں شریر چمک بڑھ گئی اور ملکانی سکینہ صرف سر ہلا کر رہ گئیں۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

”بہت شریر ہے۔“ وہ ہنسیں۔

”ملکانی جی! آپ پیار بھی تو بہت کرتی ہیں۔“ منظوراں نے ان کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بھی تو اسے اولاد کی طرح پالا ہے، اپنی اولاد سمجھا ایک حرارع کی....“

”تمہیں کیا پتہ، منظوراں! اس نے کس طرح میری تنہائیوں کو بانٹا ہے۔“ ملکانی سکینہ نے منظوراں کی بات کاٹ کر کہا۔ ”یہ تو میری ہے......میری اپنی۔ جب میری اولاد ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو معصوم شاداں کی قلقاریوں نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا۔“

”ماں جو مر گئی تھی، بے چاری کی۔“

”خدا بہت بے نیاز ہے۔ اس کی پرورش کے لئے مجھے وسیلہ بنایا اور میری تنہائی دُور کرنے کے لئے شاداں وسیلہ بنی۔ ہم نے ایک دوسرے پر احسان نہیں کیا۔ یہی قسمت میں رقم تھا۔“

”بے شک جی......بے شک۔“ منظوراں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور بھلا وہ کرتی بھی کیا؟......شاداں سے ملکانی کا سکینہ کا بڑھا ہوا بے تحاشا پیار حویلی کے سارے ملازمین کو کھٹکتا تھا مگر کوئی کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ ایک تو ملکانی سکینہ کے خوف سے،

دوسرے شاداں خود بھی آفت تھی۔ کوئی ایک سناتا، آگے سے وہ دس سنا دیتی۔ سب اسے ملکانی سکینہ کی منہ چڑھی کہتے تھے۔ حالانکہ ملکانی سکینہ نے حویلی میں کئی بار ملازمین کو ڈانٹا تھا، مگر مجال ہے جو کبھی شاداں کی طرف انہوں نے ترچھی نظر سے بھی دیکھا ہو۔ ان کا شاداں سے حد سے زیادہ بڑھا ہوا التفات سب کو کھلتا بھی تھا۔ اور پھر وہ یہ سوچ کر دل مار لیتے کہ ملکانی سکینہ نے شاداں کو چھٹ پن سے پالا ہے، اس لئے وہ انہیں زیادہ پیاری ہے۔ مگر رتبہ تو وہی تھا...... ''نوکرانی''...... وہ بھلا کون سا اُن کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اگر وہ پلنگ پر بیٹھی ہوتیں تو وہ ہمیشہ نیچے ان کے قدموں میں بیٹھتی۔ درجہ تو وہی تھا۔ البتہ ان سے لاڈ ضرور کرتی تھی۔

شاداں ڈیڑھ برس کی تھی، جب اس کی ماں شبو اُسے سکندر آباد لائی تھی۔ یہاں اس کی بہن پیو رہتی تھی اور بھائی اللہ دتہ۔ شبو جب سکندر آباد اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ آئی تھی تو بہت بیمار تھی۔ بیمار تو وہ اس روز سے تھی، جب شاداں کا باپ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے چار ماہ بعد شاداں پیدا ہوئی۔ شبو انتظار کرتی رہی اپنے شوہر کا، جس نے اس سے ڈھیروں وعدے کئے تھے۔ جلد اسے شہر لے جانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اور وہ اس کے وعدوں پر اعتبار کر کے اپنی معصومیت کو داغ دار کر بیٹھی تھی۔ بہت جلدی شوہر کے انتظار کا انگارہ دل و روح کو جھلسا گیا...... شنو کا باپ گھبرا کے بیمار بیٹی اور ڈیڑھ سالہ گل گوتھنی نواسی کو لے کر سکندر آباد آ گیا۔ شنو کا بہنوئی شرفو اور بھائی اللہ دتہ، سکندر آباد کے اور لوگوں کی طرح ملکانی سکینہ کی وسیع و عریض اور میلوں پھیلی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ غریب لوگ بھلا یک مشت تین بندوں کا کھانا اور پھر بیمار کی دوائی کی استطاعت کہاں رکھ سکتے تھے؟ بھائی کی مجبوری اور بہنوئی کی نظروں کے تیر شنو برداشت نہ کر سکی اور ایک روز اس نے اتنا خون اُلٹا، لگتا تھا، اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہو اور اپنے ہی لہو میں ڈوب کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں معصوم شاداں کا بھی اسے خیال نہ آیا، نہ بوڑھے باپ کے دل کے زخم ہی وہ دیکھ سکی۔ وہ تو اپنے زخموں سے نبرد آزما ہو کر بالآخر ہار گئی تھی۔

پیو حویلی میں کام کرنے جاتی تھی تو شاداں کو بھی ساتھ لے جاتی۔ معصوم بچی کی قلقاریاں حویلی میں گونجیں تو ملکانی سکینہ کی ممتا کے بھی سوتے اُبل پڑے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ طالب، غالب، تراب اور سہراب۔ اور دو بیٹیاں امینہ اور آمنہ۔ سب ہی اپنے اپنے گھروں کے ہو چکے تھے۔ پہلے وہ ملک رب نواز کے زمانے میں پڑھائی کی غرض

سے سکندر آباد سے باہر شہر میں رہتے تھے۔ چھٹیوں میں ہی حویلی میں رونقیں لگتی تھیں۔ پھر جب ملک رب نواز کا اک دن اچانک ہی ہارٹ فیل ہو گیا تو بیٹے جو شہروں میں رہ رہ کر آزاد خیال ہو چکے تھے، اب تو وہ کسی صورت بھی گاؤں میں نہ رہ سکتے تھے۔ بھلا روشنیوں میں رہنے والے گاؤں کے اندھیاروں کو کس طرح پسند کر سکتے تھے؟...... ماں کو مجبور کر کے شہر ہی میں اپنے کاروبار شروع کر دیئے تھے۔ بڑے ملک طالب نے تعلیم مکمل ہوتے ہی ٹیکسٹائل مل لگوا لی تھی اور ساتھ چھوٹے بھائی غالب کو ملا لیا تھا۔ باقی دونوں تو ابھی زیر تعلیم ہی تھے، مگر ان کا بھی وہی راستہ تھا، جو بڑے بھائیوں کا تھا۔

ملکانی سکینہ نے اس شرط پر بیٹوں کو شہر میں مستقل رہائش کی اجازت دی تھی کہ وہ کبھی کبھار ضرور زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے آئیں گے، خصوصاً خریف اور ربیع کی فصلوں کے موقع پر...... حالانکہ یہ تو ملکانی سکینہ کی ایسی شرط تھی، جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ اگر وہ فیصلہ نہ مانتے تو بھی وہ کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ مگر بیٹوں نے ماں کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ پھر ماں بھی ایسی، جو اولاد کی ہر تمنا کو اپنی تمنا سمجھے۔ ملک طالب کو اپنے دوست یونس درّانی کی بہن عائشہ درّانی اتنی پسند تھی کہ وہ اپنے دل کی رانی کو گھر کی زینت بنانا چاہتے تھے۔ ملکانی سکینہ جو جانے کب سے اپنی حسین بھانجی حمیدہ کو بڑی بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں، بیٹے کی خاطر وہ اپنی خواہش کو دل کی عمیق گہرائیوں میں دفن کر کے بیٹے کی خواہش پر عائشہ درّانی کو بیاہ لائیں۔ پھر انہوں نے کبھی کوئی خواب نہ دیکھا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان کے بیٹوں نے اپنی مرضی کی تھی اور وہ ہمیشہ ان کی مرضی پر راضی نامے کی مُہر ثبت کر دیتی تھیں۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ ان کے بیٹے جو بھی بات کرتے ہیں ان سے، اس کا فیصلہ وہ پہلے کر چکے ہوتے ہیں۔ انہیں تو اس لئے بتاتے ہیں تاکہ ماں آگاہ رہے۔ ورنہ انہیں علم ہے کہ اگر ماں راضی نہ ہو گی تو بھی کرنا تو وہی ہے، جو وہ اپنے دل میں ارادہ کر چکے ہیں۔

طالب اور غالب کی طرح تراب اور سہراب نے بھی تعلیم مکمل ہونے کے بعد قالینوں کے ایکسپورٹ کرنے کا کاروبار شروع کیا اور بتایا اس وقت جب وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس بھی لے چکے تھے، ملکانی سکینہ نے بیٹوں کو گلے لگا کر صرف دعائیں ہی دی تھیں۔

''بیٹا! اپنے کاروبار میں اُلجھ کر پشتوں کی سونا اُگلتی زمینوں کو نہ بھول جانا۔ ورنہ تمہارے باپ کی روح تڑپے گی۔''

"نہیں ماں جی!...... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" تراب نے ماں کے کندھے سے سر رگڑتے ہوئے کہا۔ انہیں یہ خوشی تھی کہ ان کی ماں کبھی بھی ان کی خواہشوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑی نہیں ہوئی۔ اولاد نے جو کہہ دیا، وہ انہوں نے مان لیا۔ اور پھر ہماری خواہشیں ہوتی کون سی غلط ہیں؟...... تراب اپنی ماں کا اتنا احسان مند نہ تھا، جتنا اسے اپنی خواہش کے "صحیح" ہونے پر فخر تھا۔

ملکانی سکینہ کی خواہش پر بیٹے خود ہی چند روز کے لئے آجاتے اور زمینوں کی آمدنی کا حساب کر کے ماں کے حوالے کر جاتے۔ حالانکہ بیٹوں نے کتنی ہی بار انہیں کہا تھا کہ وہ شہر میں ان کے ساتھ چل کر رہیں۔ مگر ملکانی سکینہ نے انکار کر دیا۔

"پتر! میں کھلی اور صاف ستھری آب و ہوا میں رہنے کی عادی ہوں۔ تمہارے شہر میں تو چیزوں کے ساتھ ساتھ ہوا بھی ناخالص ہے۔ میں وہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے یہیں رہنے دو۔"

ماں کی بات پر "شہری پڑھے لکھے" بیٹے ہنس دیتے تھے کہ ان کی ماں میں آج بھی برسوں پرانی روح تھی۔

ملکانی سکینہ نے بیٹوں کی شادیاں یہیں سکندر آباد کی حویلی میں ہی کی تھیں۔ بس یہیں انہوں نے اپنی بات منوائی تھی۔ غالب، تراب اور سہراب کی دُلہنیں اس عظیم الشان حویلی میں ہی آن کر اُتری تھیں۔ پورا گاؤں اپنے گاؤں کے ملک کے بیٹوں کی شادی میں شریک ہوتا۔

ملکانی سکینہ اپنے خوابوں کو پلکوں سے نوچ پھینکنے کے لئے تیار ہو گئی تھیں۔ یہ ان کے اپنے اختیار میں تھا۔ مگر وہ گاؤں کے ان کمینوں کے خوابوں کو نہیں ملیامیٹ کر سکتی تھیں جب فضلو، ملک طالب کو بچپن میں کھلایا کرتا تھا اور انہیں کہتا تھا۔

"ملکانی جی!...... میں ملک طالب کی شادی پر شاندار جوڑا اور تلّے والی جوتی لوں گا۔"

ملک رب نواز، فضلو کی بات پر ہنس دیتے اور ملکانی سکینہ، بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے کہتیں۔

"ہاں فضلو! کیوں نہیں؟...... تمہارا ملک طالب جس دن ووہٹی بیاہ کر لائے گا نا، اس دن دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔"

ملک سہراب کی آپا کو گوٹے والے ساٹن کے سرخ جوڑے کا ارمان تھا اور وہ ملک

سہراب کی شادی کے خواب دیکھتی تھی۔ کیونکہ نوراں کی اپنی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس کا بابا بہت غریب تھا اور "غربت" کی وجہ سے "داماد" نہ خرید سکا تھا۔ بھو نوراں کو ملک سہراب کی شادی کا ارمان تھا۔ اس سے زیادہ سرخ جوڑے کا اس کو ارمان تھا، جو اس کا نہ جانے کب کا خواب تھا۔ اور ملکانی سکینہ نے سب کے خواب پورے ہونے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

تبھی تو انہوں نے بیٹوں کی شادی میں پورے گاؤں کو شریک کیا تھا۔ غریبوں میں اناج تقسیم کیا تھا، نقد رقم بھیجی تھی ان کے گھروں میں۔ غرض کہ سکندر آباد کے ہر فرد نے اپنے ملکوں کی شادیوں میں شرکت کی تھی۔ یہ اور بات کہ ملکانی سکینہ کی بہوئیں مکلاوے کے بعد اپنی شہر والی کوٹھیوں میں منتقل ہو جاتیں۔ پھر مہینوں بعد ہی وہ سکندر آباد آتیں۔ ملکانی سکینہ نے کبھی ان سے نہ آنے کا شکوہ نہ کیا تھا۔ مگر وہ خود ہی کہتیں۔

"ماں جی! آپ کے بیٹے اتنے مصروف رہتے ہیں کہ سکندر آباد آنے کا وقت ہی نہیں ملتا، نہ ہمیں لاتے ہیں۔"

تب ملکانی سکینہ ان کی وضاحتوں پر بس مسکرا دیتیں کہ بہوئیں سارا الزام ان کے بیٹوں پر رکھ کر خود سرخرو ہو جاتی تھی۔ ملکانی سکینہ سب کچھ سمجھتیں مگر کچھ نہ کہتیں، کبھی نہ جتاتیں۔

کبھی کبھار وہ شہر چلی جاتی۔ اور یہ تب ہوتا، جب ان کی کسی بہو کے ہاں کوئی نیا مہمان آنے والا ہوتا۔ تب وہ چند روز کے لئے بیٹوں کے ہاں چلی جاتیں۔

مگر سب کے ہوتے ہوئے بھی شہر میں ان کا دل بے تحاشا گھبراتا۔ اپنا گھر بہت یاد آتا۔ وہ پاؤں جلی بلی کی طرح پورے گھر میں چکراتی پھرتیں۔

تنہائی سی تنہائی ہوتی تھی۔ تنہائی کانٹوں کی طرح ان کے پاؤں میں چبھ کر رہ جاتی۔ طالب اور غالب کی صبح ہی دس بجے ہوتی۔ وہ سو کر اُٹھتے۔ ناشتے کے دوران وہ ماں سے باتیں کرنے کے بجائے اخبار پڑھتے رہتے، پھر تیار ہو کر آفس چلے جاتے۔ البتہ جاتے جاتے ماں کو سلام ضرور کرتے۔ پھر ملکانی سکینہ کی تنہائی کا دور شروع ہو جاتا۔ عائشہ اور فیروزہ اپنے بچوں میں مصروف رہتیں یا ملازموں سے گھر کا کام اپنی نگرانی میں کرواتیں۔ اور ملکانی سکینہ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھا کرتیں۔ شام کو بیٹے آجاتے۔ سب ساتھ ہی چائے پیتے۔ اس کے بعد انہیں ماں سے بات کرنے کا وقت میسر نہ آتا۔ تو بھلا ایسے ماحول میں جبکہ بیٹوں کے پاس ماں کے لئے وقت ہی نہ ہوتا تو وہ کس طرح ان کے

ساتھ رہتیں؟........اس لئے بھی کہ حویلی میں جہاں بقول ان کے بیٹوں کے وہ تنہا رہتی تھیں۔ مگر وہ تنہا کب تھیں؟........ گاؤں کی عورتیں ان کے پاس آتی رہتی تھیں۔ پھر برسوں پرانی ملازمائیں تھیں، جنہیں ملکانی سکینہ نے کبھی ملازم نہ سمجھا تھا۔ جب وہ سکندر آباد بیاہ کر آئی تھیں تو صرف تیرہ برس کی تو تھیں۔ اپنی ہم عمر ملازماؤں کے ساتھ ان کی دوستی ہو گئی تھی اور آج تک وہ دوستی قائم تھی۔ حالانکہ اب وہ جوان بچوں کی ماں تھیں، پوتے نواسے نواسیوں والی تھیں۔ لیکن پھر بھی تنہائی سے گھبراتی تھیں۔ حویلی میں انہیں کبھی تنہائی محسوس نہ ہوتی تھی، اسی لئے وہ شہر سے جلد ہی واپس گاؤں لوٹ آئیں۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ ملکانی سکینہ کے بیٹوں کی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں۔ البتہ وہ ماں سے کیا ہوا وعدہ ضرور نبھا رہے تھے اور کبھی کبھار وہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے ضرور آ جاتے۔ خصوصاً نانا پور کی زمینوں پر وہ ضرور جاتے کہ وہ زمینیں بہت ہی زرخیز تھیں اور آمدنی بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر ان کے بچوں کی آؤٹنگ بھی ہو جاتی تھی۔ عموماً وہ لوگ بچوں کی چھٹیوں میں حویلی کو رونق بخشتے تھے۔ پھر قدرت کو ملکانی سکینہ پر کچھ ایسا رحم آیا کہ شاداں جیسا پھول ان کی تنہائیوں کو مہکانے کے لئے قدرت نے بھیج دیا........ شاداں کی پرورش انہوں نے خود کی تھی، جیسے کہ اپنے بچوں کو پالا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ شاداں کو پال رہی تھیں۔ سب ان کی خدا ترسی کے معتقد تو تھے ہی، شاداں کے ساتھ ان کا بڑھا ہوا پیار دیکھ کر تو ملکانی سکینہ کے جنتی ہونے کی پیشینگوئی کر دیتے کہ ایک ایسی بچی، جس سے ان کا کوئی ناتا ہی نہیں، وہ ماں بن کر اسے پال رہی تھیں، اس کی ہر خواہش وہ پوری کرتیں۔

شاداں ان دنوں غالباً سات آٹھ سال کی تھی، جب ملکانی سکینہ پر فالج کا اٹیک ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئیں۔ بہت علاج کروایا، مگر نہ آرام آنا تھا نہ آیا........ بہوئیں اور بچے آ کر رہے تھے، آمنہ اور امینہ بھی آ گئی تھیں، ماں کی بیماری کا سن کر۔ مگر جب انہیں آرام نہ آیا تو سب ہی اپنی مصروفیات گنواتے ہوئے لوٹ گئے۔ بس شاداں اور دیگر ملازمین ہی تھے، جو ان کے قریب تھے اور ساتھ رہے شاداں بہت ہی قریب تھی۔ منظوراں، ملکانی سکینہ کو وہیل چیئر پر بٹھا دیتیں اور پھر شاداں کرسی کو دھکیلتے ہوئے ملکانی سکینہ کو باغ میں لے جاتی، ہولے ہولے ان سے ڈھیروں باتیں کرتی۔ وہ بچپن ہی سے بہت باتونی تھی۔ اور ملکانی سکینہ کو اس کی باتوں میں لطف بھی بہت آتا۔ شاداں کئی بار ان سے کہہ چکی تھی۔

"ملکانی جی! مجھے بھی پڑھنے اسکول میں ڈال دیں نا۔ سچ، مجھے پڑھنے کا بہت شونک (شوق) ہے۔ میں بھی سکول جانا چاہتی ہوں۔"

"شاداں پتر! تُو ایسی ہی معصوم اور بھولی بھالی سی مجھے پسند ہے۔ اپنے آپ میں مست سی، بے خبر۔ اور پتر! جب انسان کو آگہی آ جائے، قدرت کے پوشیدہ رازوں کا ادراک ہونے لگے تو وہ خود بھی پریشان ہو جاتا ہے اور دوسروں کو بھی تنگ کرتا ہے۔ میری دھی! تُو ایسے ہی اچھی ہے۔" ملکانی نہایت محبت سے اسے سمجھاتیں حالانکہ ان کی باتیں اسے سمجھ نہ آتیں۔ اسی لئے تو چند روز گزرنے کے بعد وہ پھر ملکانی سے ضد کرنے لگتی۔

"بس، مجھے اسکول میں بٹھا دیں۔"

اصل میں اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ خاص طور پر شوق اس وقت بڑھا، جب ملکانی سکینہ پر فالج کا اٹیک ہوا اور شہر سے ڈاکٹرنی انہیں دیکھنے آئی تھی۔ سفید اوور آل میں وہ شاداں کو بہت ہی اچھی لگتی۔ اُس کی ناگن جیسی لمبی چوٹی سفید کوٹ پر پڑی ہوتی اور اس کے لمبے بال دیکھ کر شاداں رشک میں مبتلا ہو جاتی۔

ملک طالب کی بیوی نے اسے بتایا تھا کہ یہ بہت پڑھی لکھی ہے، تبھی ڈاکٹرنی ہے۔ تب سے شاداں کا بھی دل مچل گیا تھا کہ وہ بھی بہت سا پڑھے اور ڈاکٹرنی بنے۔ مگر ملکانی سکینہ اسے ادراک کی گھاٹیوں پر چڑھنے نہیں دینا چاہتی تھیں کہ یہاں آبلہ پائی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ ایسے ایسے زخم ملتے ہیں کہ جن کا وقت کے پاس بھی مرہم نہیں ہوتا۔ اور وہ معصوم شاداں کو ایسے زخموں سے آشنا نہیں کروانا چاہتی تھیں........ ہمیشہ اسے یونہی سیدھی سادی دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ پھر شاداں نے بھی اپنی خواہش کو دل کی عمیق گہرائیوں میں دفن کر کے ملکانی سکینہ کی خدمت کو شعار بنا لیا۔ سوائے ملکانی سکینہ کے ذاتی کام کے، اور کوئی کام نہ کرتی تھی، بلکہ حویلی کے ملازمین پر اس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ان پر ایسے حکم صادر کرتی جیسے کہ حویلی کی اصل مالکن ہو۔

مگر اسے خود بھی یہ احساس تھا کہ وہ صرف نوکرانی ہے۔ جس طرح والدین کا بہت سے بچوں میں سے کوئی ایک بہت لاڈلا اور پیارا ہوتا ہے، اسی طرح اونچے طبقے کے بھی بہت سے ملازمین میں سے بھی کوئی ایک ملازم اپنی عادات اور اطوار کی وجہ سے ہر دلعزیز ہوتا ہے۔ جس کی کوتاہیاں بھی نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ سو شاداں بھی خود کو ایسے ہی ملازمین میں سے سمجھتی تھی۔

پھر شاداں اپنی تمام تر معصومیت اور سادگی کے ساتھ بڑی ہوتی گئی اور ملکانی سکینہ

بوڑھی ہوتی چلی گئی۔ مگر یہ تھا کہ شاداں کی محبت میں بھی دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

ملکانی سکینہ کے بیٹے بمع اپنی بیویوں اور بچوں کے حویلی آ جاتے تو حویلی کی رونقیں دوبالا ہو جاتیں اور ایسا تب ہوتا، جب عیدین کا موقع ہوتا یا پھر اسکولز میں تعطیلات ہوتیں۔

ملک طالب کے دو بیٹے اشرف ملک اور مشرف ملک اور ایک بیٹی نائلہ تھی۔ ملک غالب کے صرف دو بیٹے فراز ملک اور شہزاد ملک تھے۔ تراب ملک کی تین بیٹیاں ارسلہ، عصمہ، فائزہ اور دو بیٹے طارق ملک (جسے پیار سے ٹونی کہتے تھے) اور سکندر ملک تھے۔ تراب ملک نے اپنے چھوٹے بیٹے کا نام اپنے دادا کے نام پر رکھا تھا۔ البتہ سہراب ملک کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بے اولاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب سے زیادہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے ٹاٹا پور جایا کرتے تھے۔ سنا تھا، ان کی بیوی لیلیٰ خانم بہت ہی تیز طرار تھی۔ ملک سہراب سے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ اس کے والد وزارتِ خارجہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ باپ کے عہدے کا فخر، پھر مل اونر شوہر کی وجہ سے اس بگڑی ہوئی لیلیٰ کا دماغ اور بھی خراب ہو گیا۔

شروع میں ملک سہراب نے بھی تو اسے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ اور جب محبوب سے شوہر بننے کی کوشش کرتا تو لیلیٰ خانم کا پارہ اتنا ہائی ہوتا کہ سہراب کو اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہوتیں۔ لیلیٰ کو اپنے حُسن کا کچھ زیادہ ہی احساس تھا اور سہراب ملک نے بھی اس کی ہر خواہش کا احترام کیا تھا۔ مگر جب چار پانچ سال تک اس کا آنگن سُونا رہا اور لیلیٰ کے اپنے ہی دل میں بچوں کی خواہش جاگی، اس نے ساری احتیاطی تدابیر کو پسِ پشت ڈال دیا۔ مگر اس کی گود میں پھول سا بچہ نہ آیا۔ تب بھی اس نے سہراب ملک پر الزام ڈال دیا۔ سہراب ملک نے اپنا اور لیلیٰ کا میڈیکل چیک اَپ کروایا تو پتہ چلا کہ خامی تو لیلیٰ میں تھی۔ سہراب ملک تو ٹھیک تھے۔ جب رپورٹ ملی، ان دنوں سہراب ملک سنگاپور گئے ہوئے تھے اور لیلیٰ نے ان سے میڈیکل کی رپورٹ چھپا لی تھی اور ان کی واپسی پر بتا دیا تھا کہ وہ دونوں ہی فٹ ہیں۔ خدا جب چاہے گا، بے بی دے دے گا۔

سہراب ملک نے کبھی بھی لیلیٰ پر کسی قسم کا شک نہ کیا تھا۔ حلیمی انہیں ماں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔

ملکانی سکینہ بہت دُعا کرتی تھیں۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ سہراب ملک کی اولاد کو بھی وہ گود میں کھلائیں، اس کا لمس بھی محسوس کریں۔ مگر خدا کے کاموں میں کون دخل دے

سکا ہے۔ ملکانی سکینہ بہت قناعت والی خاتون تھیں، انہوں نے بیٹے سے یہ نہ کہا تھا کہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لو۔ اور نہ ہی وہ بیٹے کے ذہن میں دوسری شادی کی بات ڈالنا چاہتی تھیں کہ ایک بار مرد کے دل و ذہن میں دوسری شادی کا خیال آ جائے تو وہ کوڑیالے ناگ کی طرح وہیں کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور مسلسل ذہن و دل کو ڈستا رہتا ہے کہ میری تکمیل کرو۔

ملکانی سکینہ عورت تھیں اور انہیں عورت کے دُکھ کا اندازہ تھا کہ عورت کیسی بھی ہو، وہ کبھی بھی شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ اور ملکانی سکینہ عورت ہو کر کسی بھی عورت پر ظلم نہیں کر سکتی تھیں۔

چاہے ان کا بیٹا بے نام رہ جاتا۔

یا ان کے بیٹے کے گھر کا آنگن ننھے بچوں کی چہکاروں سے محروم رہتا۔

ملکانی سکینہ کو ملک سہراب کے بے اولاد ہونے کا غم تو تھا، مگر آہستہ آہستہ یہ زخم بھی بھر گیا تھا۔ آخر اور بیٹوں کے گھر تو بھرے ہوئے تھے۔

اب ان کے پوتے، نواسے بڑے ہو گئے تھے۔ اور جب ان کا دادی اماں سے ملنے کو جی چاہتا، وہ سکندر آباد آ جاتے........ جس طرح اس بار سکندر ملک آ رہے تھے........

اور اتفاق تھا کہ سکندر ملک دو بار پہلے بھی آ چکے تھے اور شاداں سے ان کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔

ایک بار تو وہ تب آئے تھے، جب ملک غالب کے بیٹے فراز ملک کی شادی ہوئی تھی اور شادی کے ہنگاموں میں شاداں، حویلی کے مکینوں سے اچھی طرح مل بھی نہ سکی تھی۔ مصروف جو بہت تھی۔ اور حویلی کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔

سکندر ملک امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھے اور صرف دو روز کے لئے ہی سکندر آباد آئے تھے۔ ولیمے میں شرکت کیے بنا ہی لاہور لوٹ گئے تھے۔ دوسری بار وہ ملکانی سکینہ کو لینے آئے تھے کہ کسی ماہر اسپیشلسٹ کو دکھانا تھا۔

ان دنوں شاداں اپنی ماسی پینو کے ساتھ اس کے سسرالی رشتے داروں کے ہاں مظفر گڑھ گئی ہوئی تھی۔ اور جب واپس آئی تھی تو ملکانی سکینہ اس کے آنے کے ایک ہفتے بعد آئی تھیں اور ملک سہراب انہیں چھوڑ گئے تھے۔ ساتھ ہی ملک طارق بھی آئے تھے۔ عجیب ہی فطرت کے مالک تھے۔ ٹونی ملک سارا دن کتابیں پڑھتے رہتے۔ بہت کم کسی سے بات کرتے تھے۔ چائے پینے کے شیدائی تھے اور شاداں کو چائے کا کہہ کر اکثر بھول

جاتے۔ پڑھائی میں اس قدر مستغرق ہوتے کہ شاداں تپائی پر چائے کا کپ رکھ کر انہیں بتا کر جاتی مگر وہ ہمیشہ بھول جاتے اور پھر ٹھنڈی ایک دو گھونٹ ہی میں پی جاتے۔ شاداں نے تو انہیں پاگل کی ڈگری دے دی تھی۔ اصل میں وہ فلسفے میں ایم۔اے کر چکے تھے۔ لیکچرار شپ کی خواہش تھی، جو ملک تراب نے پوری نہ ہونے دی۔ وہ کسی صورت میں یہ پسند نہ کرتے تھے کہ ان کا جو نام اور مقام ہے، ان کا بیٹا دو ڈھائی ہزار کی نوکری کے لئے خوار ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی ان کا ہاتھ بٹائے۔ مگر ٹونی ملک نے صاف کہہ دیا تھا کہ جب وہ اس کی خواہش پوری نہیں کر سکتے تو وہ بھی ان کی خواہش پوری نہیں کرے گا۔ سو اس نے اپنی ساری توجہ اپنے مضمون پر صرف کر دی۔ سکندر آباد آ کر ایم۔فل کی تیاری کر رہے تھے اور سارا دن کتابوں کے حصار میں گھرے رہتے۔ شاداں سوچتی، اتنا پڑھ پڑھ کر بھی یہ تنگ نہیں ہوتا۔ اچھا ہے، میں نے نہیں پڑھا۔ ملکانی جی نے مجھے بروقت بچا لیا، ورنہ یہی میرا حشر ہوتا۔

شاداں نے ٹونی ملک کو دیکھ کر تو کانوں کو ہاتھ لگا لئے تھے۔

ٹونی ملک کی عادات سے شاداں بہت تنگ ہوتی۔ ایک تو وہ اسے کوئی کام کہتے اور پھر بھول جاتے۔ اور اس روز تو شاداں کا رہا سہا امیج بھی ٹوٹ گیا، جب ٹونی ملک صرف تولیہ کمر سے لپیٹے برآمدے میں آ گئے تھے۔ حالانکہ ایسی گرمی بھی نہ تھی۔ پتہ نہیں کیا ان کے دل میں آئی اور وہ نہانے کے بعد تولیہ لپیٹے باہر آ گئے۔ حویلی کے ملازمین نے حیرت سے انہیں دیکھا اور شاداں نے حسب معمول ہنسنا شروع کر دیا۔

اس کی ہنسی پر ملکانی سکینہ نے بھی شاداں کی نظروں کی سمت دیکھا تو ٹونی ملک اسے بری طرح گھور رہا تھا۔

"پُتر! یہ گاؤں ہے۔"

"دادی اماں! یہ میرا گھر ہے، میں جس طرح بھی رہوں۔" وہ تنک کر بولا۔

"ٹھیک ہے پُتر! مگر یہ معصوم لوگ اس بات کے عادی نہیں ہیں۔" وہ نہایت رسان سے بولیں اور ٹونی ملک پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور شام ہونے سے پہلے ہی وہ شہر چلا گیا۔ حالانکہ ملکانی سکینہ نے بہت روکا مگر اس کا جواب یہی تھا۔

"میں معصوم لوگوں میں نہیں رہ سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا اور ملکانی سکینہ بڑھ کر اسے روک بھی نہ سکیں۔ اس روز پہلی بار انہیں اپنی معذوری کا شدت سے احساس ہوا اور ان کی آنکھوں کی سطح آپ ہی آپ گیلی ہو گئی تھی۔

پھر وہ ایک دم ہی شاداں پر برس پڑیں۔

"ہر وقت ہنستی رہتی ہو۔ ذرا تمیز نہیں ہے۔ ٹونی کو خفا کر دیا تم نے۔ تمہاری...... صرف تمہاری وجہ سے وہ چلا گیا ہے۔"

"ملکانی جی......!" شاداں کی مارے حیرت کے آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے...... چلی جاؤ۔" شاداں کی سولہ سترہ برس کی زندگی میں ملکانی سکینہ نے پہلی بار اسے ڈانٹا تھا۔ وہ بھلا اس بات کی کب عادی تھی۔ سب ملازم بھی حیران تھے اور انہیں احساس ہوا تھا کہ آج واقعی شاداں سے غلطی ہوئی ہے۔ شاداں ہونٹ کچلنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں سرخی آ گئی تھی۔

"کھڑی کیوں ہو؟...... جاؤ!" ملکانی سکینہ گرجیں تو شاداں کے وجود میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ آگے بڑھی اور ملکانی سکینہ کی بے جان ٹانگوں کو دونوں بازوؤں کے حصار میں لے کر نیچے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ملکانی جی! قسم لے لیں۔ مجھے...... مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ کو غصہ آ جائے گا۔ میں اپنی جند دے کر بھی ٹونی ملک کو لے آؤں گی، اگر مجھے راہ آتی ہو۔ آپ...... آپ کسی کو میرے ساتھ شہر بھیج دیں۔ مجھے...... مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنی زبان کاٹ ڈالوں گی تاکہ پھر کبھی نہ ہنس سکوں۔ مگر...... مگر مجھ سے اپنا سایہ تو نہ چھینیں...... میں تو زندہ نہیں رہوں گی، ملکانی جی!" شاداں نے ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور بلک پڑی۔

"میں...... میں حویلی چھوڑ سکتی ہوں، مگر آپ کو خفا نہیں دیکھ سکتی۔ آپ مجھ سے راضی خوشی کہیں کہ شاداں! تُو کہیں چلی جا، تب تو میں چلی جاؤں گی۔ مگر اس طرح کانٹے تو میری روح میں نہ چبھوئیں۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"تُو کہیں نہیں جائے گی، شادو!...... میری دھی ہے تُو تو" ملکانی سکینہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"آپ ہی تو ابھی کہہ رہی تھیں۔" شاداں نے بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"مائیں اولاد کو ڈانٹ دیتی ہیں نا کبھی کبھی تو۔ بس، برا نہ مان۔ مجھے معاف کر دے۔"

"ملکانی جی!" شاداں نے ان کے ہاتھ تھام لئے اور بے تحاشا چومنے لگی۔ بے شمار آنسو ملکانی سکینہ کے ہاتھوں کو بھگو رہے تھے۔

"مجھے یہ احساس ہی نہ رہا کہ ٹونی تو جانے کے لئے آیا تھا۔ سدا تو تُو ہی میرے

ساتھ رہے گی۔ وہ تو سب وقتی سہارے ہیں، تُو ہی تو میرا سہارا ہے۔" ملکانی سکینہ نے شاداں کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اس کی پیشانی چوم لی۔

"اب ہنس دے، شاباش!"

"ملکانی جی.......!"

"دیکھ نا، حویلی کتنی سُونی ہے۔ تیری ہنسی کی جھنکار سے تو یہاں زندگی نظر آتی ہے۔ تُو ہنس پہلے کی طرح۔" وہ کہتی رہیں اور شاداں ہنس دی۔ مگر اسے محسوس ہوا کہ آج اس کی ہنسی بھی اپنی نہیں ہے۔ مگر بہت جلد ہی وہ ملکانی سکینہ کا غصہ بھول گئی اور وہی پرانی روش تھی اس کی۔ ملکانی سکینہ کو اپنی دلچسپ باتوں سے ہنسانا اور خود بھی ہنسنا، حویلی کے نوکروں پر حکم چلانا.......اور بندو سے روز خط کا پوچھنا.......کبھی وہ اسے خط تھما دیتا اور کبھی بس آنکھیں سینک کر ہی چلا جاتا۔

سکندر ملک عرف سنی آ رہا تھا اور ملکانی سکینہ نے نہ جانے کس خوف کے تحت شاداں کو منع کر دیا تھا کہ وہ سنی کے سامنے اپنی ہنسی پر بریک لگائے اور زبان کو بھی سنبھال لے، جو ہمیشہ غلط ہی پٹڑی پر چلتی تھی۔

شاداں نے سوچا کہ بہتر ہے، جب سکندر ملک آئے تو وہ حویلی میں موجود نہ رہے۔ اسی لئے وہ سہ پہر ہی کو اپنے ماما کے ہاں چلی آئی۔ مامی نے اسے حسب معمول ہاتھوں ہاتھ لیا کہ وہ جب بھی آتی تھی، خاتون کا ہاتھ بٹاتی اور اسی لئے خاتون شاداں کی آمد پر بہت خوش ہوتی تھی۔

اور جب شاداں عشاء کی نماز کے بعد اپنے ماما کے ساتھ حویلی آئی تو ملکانی سکینہ نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

"تجھے تو پتہ تھا کہ سنی آ رہا ہے۔ پھر تُو کیوں چلی گئی تھی؟"

"بس ملکانی جی! ماما سے ملنے کو بہت دل کر رہا تھا، قسم سے۔ اس لئے چلی گئی۔"

"میں جاؤں، ملکانی جی؟" اللہ دتہ نے پوچھا۔

"ہاں ماما! میں سویرے پھر آ جاؤں گی۔" شاداں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں اللہ دتہ! تم اس کا انتظار مت کرنا۔ اب یہ نہیں آئے گی۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور تم غائب۔"

"آپ جو ہیں جی۔"

"بس، ا... میری اجازت کے بغیر نہیں جاؤ گی۔" ملکانی سکینہ کے لہجے میں محبت کے

ساتھ حکم بھی تھا۔ اللہ دتہ سلام کر کے چلا گیا اور ملکانی سکینہ نے شاداں کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

"مجھے معلوم ہے، تُو اب تک مجھ سے خفا ہے۔"

"کیوں جی؟"

"ٹونی کی وجہ سے۔"

"نہیں جی، یہ بات نہیں۔"

"تُو مجھے نہ پڑھا۔ بس پتر! میں جانتی ہوں، سب کچھ۔ ساری دنیا مجھ سے خفا ہو جائے، تُو نہ ہونا.......ٹھیک ہے نا؟" وہ شاداں کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور شاداں مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں مشعلیں جل اُٹھیں۔

"سنی ملک آ گئے ہیں جی۔"

"ہوں! اس کا دوست بھی آیا ہے، مراد علی۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔"

"کیوں آئے ہیں جی یہ لوگ یہاں؟"

"ہرن کا شکار کرنے۔"

"ملکانی جی! میں بھی جاؤں گی شکار پر۔"

"بُری بات.......دھیاں شکار نہیں کھیلتیں۔"

وہ منہ پھلا کر بولی۔ "ہاں، دھیاں تو کچھ بھی نہیں کھیلتیں۔"

"مراد کیا سوچے گا کہ حویلی کی دھیاں......."

"مگر میں حویلی کی دھی کب ہوں؟" شاداں نے بظاہر اپنی ازلی معصومیت سے یہ جملہ کہا۔ لیکن اس جملے کا ردِعمل وہ ملکانی سکینہ کے چہرے پر نہ دیکھ سکی۔ تبھی تو کہہ رہی تھی کہ "سب کو پتہ تو ہے کہ میں نوکرانی ہوں۔ بس سنی ملک سے کہہ دیجئے گا، مجھے لے چلیں۔ میں گوشت بھون دوں گی۔"

"نہیں.......میں نہیں کہہ سکتی۔"

"میں خود کہہ دوں گی جی.......بس مجھے شوق ہے۔ اور جاؤں گی ضرور۔" شاداں نے فیصلہ سنا دیا۔

"اچھا، چلی جانا..... وقت تو آئے۔" ملکانی سکینہ نے ایک دم ہی بات بدل دی۔

"یوں کرنا کہ صبح اپنی نگرانی میں ناشتہ تیار کروانا۔"

"آپ فکر نہ کریں جی۔ ملکانی عائشہ نے مجھے سکھا دیا تھا۔ بالکل شہری طریقے کا

ناشتہ ہوگا۔" شاداں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے پتہ ہے، شہری لوگ کس طرح ناشتہ کرتے ہیں۔"

پھر شاداں کتنی دیر تک ملکانی سکینہ سے سکندر علی اور مراد علی کے ناشتے کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ملکانی سکینہ کو نیند آنے لگی۔ تب اس نے انہیں بیڈ پر لٹا دیا۔ شنیل کی رضائی اچھی طرح انہیں اوڑھا دی اور ان کی پیشانی چوم کر، لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل آئی۔

⊛......⊛......⊛

شاداں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی روٹی کے چھوٹے چھوٹے بھورے کر کے چڑیوں کو ڈال رہی تھی اور سرخ روش پر بے شمار چڑیاں موجود تھیں۔ شاداں ہمیشہ ہی باسی روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑے صبح صبح چڑیوں کو ڈالا کرتی تھی۔ ملکانی سکینہ اپنے لاڈلے پوتے اور اس کے دوست کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھیں۔ اور آج سارا ناشتہ شاداں ہی نے تیار کیا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ سکندر ملک اور مراد علی کے سامنے نہ گئی تھی۔ نہ ہی جانا چاہتی تھی کہ یونہی کوئی بات منہ سے نکل جائے اور سنی ملک بُرا مان جائیں۔ یوں بھی امیر لوگوں کے نخروں کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کب کیسا موڈ ہو...... بالکل ساون کی گھٹاؤں جیسا موڈ ہوتا ہے ان کا۔

"بیوٹی فل!...... یہاں تو ثواب کا کام ہو رہا ہے۔" اس جملے پر شاداں نے ایک دم ہی گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھا، جہاں سے آواز آئی تھی۔ سامنے ہی تو وہ نسواری شلوار سوٹ میں براؤن کوٹ پہنے اور اس کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، چمکتی آنکھوں سے شاداں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

یہ سکندر ملک تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر طارق ملک کا بھائی بھی اسی جیسا سڑیل ہوگا۔ ہنسنے بولنے میں بھی بخیل۔ اور اس کی آنکھوں میں کتنی شرارت ہے...... لبوں پر کیسی خوب صورت مسکراہٹ ہے۔ تو یہ مراد علی ہے۔

"کیا دیکھ رہی ہو بھئی؟" وہ اور نزدیک آ گیا۔

"کچھ نہیں جی...... چڑیوں کو بھورے ڈال رہی تھی۔" شاداں ایک دم ہی گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی جھولی میں پڑے بھورے اور روٹی کے ٹکڑے نیچے گر گئے۔ چڑیاں پھدک پھدک کر اس کے قدموں میں آ گئیں۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"کس سے؟"

"چڑیوں سے۔"

"کیسی بے تکی بات ہے جی۔ بھلا چڑیاں بھی ڈرنے کی چیز ہیں؟"

"پھر کیا چیز ہے ڈرنے کی......؟"

"ناگ، بچھو وغیرہ۔ مگر میں ان سے بھی نہیں ڈرتی۔"

"تم کس سے ڈرتی ہو؟"

"ملکانی جی سے۔" بے ساختہ شاداں کے منہ سے نکلا اور وہ زور سے ہنس دیا۔

"ارے...... تو کیا ملکانی جی، بچھو سے بھی زیادہ خطرناک ہیں؟"

"وہ تو نہیں ہیں جی، مگر مجھے لگتا ہے، ٹونی ملک کی طرح سنی ملک بھی بہت خطرناک ہیں۔ آپ تو ان کے دوست ہیں، آپ کو تو پتہ ہوگا۔"

"مجھے...... ہاں...... ہاں، مجھے پتہ ہے۔ بہت خطرناک ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہوں...... تو میرا اندازہ درست ہے کہ یہ سنی ملک کا دوست ہے۔" شاداں نے خوش ہو کر دل ہی دل میں سوچا۔ کس طرح میں نے چکر دے کر پوچھا ہے۔

"تو آپ سنی ملک کے ساتھ ہرن کا شکار کھیلنے آئے ہیں۔"

"ہوں۔"

"مجھے بھی لے چلیں گے نا؟...... سچ میں گوشت بہت اچھا بھونتی ہوں۔ سب تعریف کرتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں...... کیوں نہیں؟ تمہیں بھی لے چلیں گے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"سنی ملک تو کچھ نہیں کہیں گے نا؟...... سچ، بہت ڈر لگتا ہے مجھے ان سے۔"

"کیوں......؟"

"بس جی، بڑے لوگ ہیں۔ کب کس بات پر غصہ آ جائے۔"

"بڑے لوگ......" وہ طویل سانس لے کر بولا اور بازو سینے پر لپیٹ لئے۔ "لوگ کبھی بڑے نہیں ہوتے، صرف دل بڑے ہونے چاہئیں، جو کسی کسی ہی کے ہوتے ہیں۔"

"دیکھیں جی، جن کے گھر بڑے ہوتے ہیں نا تو وہ لوگ بڑے اونچے کہلاتے ہیں۔ سب سلام کرتے ہیں انہیں۔" شاداں نے اپنے طور پر بڑے پتے کی بات کہی تھی۔

"بس، یہ تو طے ہے کہ جن کے دل بڑے ہوتے ہیں، وہ لوگ بڑے ہوتے ہیں۔"

"مگر سائیں! دلوں میں منجیاں (چارپائیاں) تو نہیں ڈالی جاسکتیں۔" شاداں نے کھٹ سے کہا تو ایک لمحہ کو تو اس نے نہایت حیرت سے شاداں کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر معصومیت کھیل رہی تھی۔ اور آنکھوں میں زندگی سے بھرپور چمک تھی۔ اس دیہاتی لڑکی نے کتنی صحیح بات کہی ہے کہ واقعی، انسان کے دل کتنے بھی بڑے ہوں، تھل کے صحرا کی طرح وسیع وعریض، جہاں یادوں کی ریت ہر لمحہ اُڑتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دل میں چارپائیاں تو نہیں بچھائی جاسکتیں۔

"بھئی تم باتیں تو بہت اچھی کرتی ہو۔ نام پوچھ سکتا ہوں تمہارا؟" اس نے پھر اسے متوجہ کیا، جو پھر چڑیوں کے لئے بھورے توڑ رہی تھی۔

"سب ہی کہتے ہیں جی کہ میں بہت اچھی باتیں کرتی ہوں۔ میری ماسی تو مجھے اپنے پاس سے اُٹھنے نہیں دیتیں اور..... اور اپنی ملکانی جی ہیں نا، وہ مجھے وہاں جانے نہیں دیتیں۔"

"کیوں......؟"

"بس، اسی لئے کہ میرے بغیر وہ اُداس ہو جاتی ہیں نا۔"

"تم نے پڑھا بھی ہے کچھ......؟"

"نہ جی...... بالکل نہیں۔ قرآن پاک پڑھا ہے۔ ملکانی جی کہتی ہیں کہ میں اسکول نہ پڑھوں تو جی نہیں پڑھا۔ مجھے حالانکہ شونک (شوق) تھا۔ مگر اب نہیں رہا۔"

"کیوں نہیں رہا؟"

"وہ آئے تھے، ٹونی ملک..... آپ تو جانتے ہی ہوں گے، سنی ملک کے بڑے بھائی۔" شاداں نے اس کی طرف دیکھ کر تصدیق چاہی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو جی، سارا دن کتابوں کا کیڑا بنے رہتے تھے۔ سارا دن نہ جانے کیا کیا پڑھتے رہتے تھے۔ مجھے کہتے، چائے بنا کر لاؤ۔ اور پھر ٹھنڈی چائے پیتے تھے۔ پھر اتنی بڑی عینک لگاتے تھے۔ ایسی بھی کیا پڑھائی کہ بندے کو اپنا ہوش نہ رہے۔ کیوں جی......؟"

"بالکل......وہ تو ہے بھی فلاسفی۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔"

"تو جی آپ کیا ہیں؟"

"میں تمہیں کیا نظر آتا ہوں؟"

"بندے نظر آتے ہیں...... میرا مطلب ہے، آپ نے بھی پڑھا ہے۔ سنی ملک کا تو ملکانی جی نے بتایا تھا کہ کسی مقابلے کا امتحان دیا ہے۔ تو سائیں! کیا پڑھائی میں بھی مقابلے ہوتے ہیں؟"

"ہاں، اچھی لڑکی!"

"میرا نام شاداں ہے۔"

"بہت ہی خوب صورت نام ہے۔"

"تعریف پھر کرنا، پہلے مجھے بتاؤ کہ پڑھائی میں کس طرح مقابلہ ہوتا ہے؟ کہیں اکھاڑے میں جاتے ہیں؟"

"یہ دنیا ایک اکھاڑا ہے، شاداں! اور انسان اس اکھاڑے اور پہلوانوں کا رول کرتے ہیں۔ ہر کوئی کسی نہ کسی دوسری قوت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ کوئی ہتھیاروں سے لڑتا ہے، کوئی لفظوں سے اور کوئی جذبوں سے۔ اس طرح پڑھائی میں بھی مقابلے ہوتے ہیں اور لوگ اس میں پہلی، دوسری تیسری پوزیشن لیتے ہیں۔ بہت سے پاس ہو جاتے ہیں اور بہت سے فیل ہو جاتے ہیں۔"

"پھر تو جی انہیں بہت دکھ ہوتا ہوگا، جو فیل ہو جاتے ہیں۔"

"یہ زندگی ہے۔ اور یہاں بھی دن رات جیسا معاملہ ہے۔ کسی کو بن مانگے قدرت سب کچھ دے دیتی ہے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، مسلسل منزل کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور تقدیر ان کی کوششوں پر صرف مسکرا کر ان کے قریب سے گزر جاتی ہے۔" اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔ پتہ نہیں، اس کے ذہن میں کیا تھا کہ وہ یہ سب کہہ رہا تھا۔ اور شاداں کے سر سے تو دو فٹ اوپر سے یہ باتیں گزر رہی تھیں۔

تبھی فیقو آ گیا اور بولا۔

"ملک جی! آپ کو مراد بابو بلا رہے ہیں۔"

یہ جملہ سنتے ہی شاداں کو یوں لگا، جیسے کہ اس کے وجود کی عمارت میں زلزلہ آ گیا ہو۔ باسی روٹی اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔ سکندر ملک نے اس گھبرائی ہوئی شاداں کو دیکھا اور مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"تم تو ہرن کے شکار کو جانا چاہتی ہو۔ اور اس وقت خود سہمی ہوئی ہرنی بن گئی ہو۔"

"وہ جی، میں تو سمجھی تھی، آپ مراد علی ہیں۔"

”تبھی میری برائیاں کر دی تھیں........نام تو تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔“

”پھر آپ ہی کو بتا دینا چاہئے تھا۔ کیوں میری ہاں میں ہاں ملاتے رہے؟“ شاداں بھی تنک کر بولی۔

”پھر تم میرے ساتھ اتنی اچھی باتیں تو نہ کرتیں نا؟“

”مگر آپ ملکانی جی کو کچھ نہیں بتانا۔“

”کیا نہ بتاؤں؟“

”یہی جو میں نے باتیں کی ہیں۔ وہ خفا ہوں گی نا۔ انہوں نے منع کیا تھا کہ میں آپ سے کوئی بات نہ کروں کہ آپ بھی ٹونی ملک کی طرح خفا ہو کر نہ چلے جائیں۔ تبھی تو کل میں ماما کے گھر چلی گئی تھی۔“

”اچھا........“

”ہاں........ دیکھیں نا، سنی ملک! زبان پر بھی کسی نے کنٹرول کیا ہے؟ اور پھر میری مجبوری تو یہ ہے کہ میں کوئی غلط بات برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ کوئی بات کرے تو جواب ضرور دیتی ہوں۔ کیا یہ بری عادت ہے؟“

”نہیں بھئی، یہ تو بہت اچھی عادت ہے۔ میں دادی اماں سے کہوں گا کہ اتنی پیاری باتیں کرنے والی لڑکی کو انہوں نے کیوں منع کیا۔“

”نہیں، نہیں........ اب یہ بھی نہ کہیے گا۔“ شاداں اندر جاتے ہوئے بولی۔ ”میں خود ہی بتا دوں گی۔“

شاداں اندر چلی گئی اور سکندر ملک زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹوں کے شگوفے چٹکے ہوئے تھے........اور آنکھوں میں قندیلیں لَو دے رہی تھیں۔ آپ ہی آپ ایک سرشاری سی کیفیت اسے مست بنا رہی تھی۔

”کیوں بھئی، سنی! کیا دیکھ لیا ہے، جو لبوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی ہے؟“ مراد علی نے ہنس کر پوچھا۔

”تم بھی اسے دیکھ لو تو خوامخواہ مسکرانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔“

”ہیں، ہیں........یعنی پھسل گیا کہیں دل تمہارا؟“

”شاید........مراد جو معصومیت میں شہر میں تلاشتا رہا ہوں، وہ تو یہاں موجود ہے۔ میرے گاؤں میں، میرے گھر میں۔“

”زرّیں بھی تو معصوم ہے۔“ مراد علی نے یاد دلایا۔ زرّیں، سکندر ملک کی ماموں زاد

بہن تھی اور کنیئرڈ کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ ثمینہ بیگم کی بہت خواہش تھی کہ وہ شوخ و چنچل زرّیں ان کی بہو بنے اور اُس کے چنچل پن کو وہ معصومیت کا نام دیتی تھیں۔

”تم نے جواب نہیں دیا، سکندر ملک! کیا زرّیں معصوم نہیں، بقول تمہاری ممی کے۔“ مراد علی نے پوچھا۔

”اب ممی نے زرّیں کی معصومیت کا ذکر کیا تو انہیں بتاؤں گا کہ معصومیت دیکھنی ہے تو اس حویلی میں آ کر وہ لڑکی دیکھ لیں۔ وہ بلا سوچے سمجھے بولتی ہے، مگر اس کے لہجے میں کسی کے لئے تمسخر یا بناوٹ نہیں ہوتی۔ بالکل سچی تصویر معصومیت کی دیکھنی ہے تو اسے دیکھیں، جو........“

”ایک دم ہی تمہارے دل میں بس گئی ہے۔“

سکندر زور سے ہنسا اور بولا۔

”دل میں بسی نہیں، صرف اُتری ہے۔ اور جو لوگ دل میں اُتر آئیں، بہت جلد بس بھی جاتے ہیں۔“

”حیرت ہے یار! کل تم آئے ہو اور آج تمہارے دل کی دنیا بدل گئی۔“

”کوئی پلاننگ تھوڑی ہی کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو لمحے ہوتے ہیں۔ لمحوں کی زنجیر کسی بھی وقت جکڑ سکتی ہے۔“ وہ نہایت بے نیازی سے بولا۔

”تو وہ لمحہ آ گیا۔ مگر یار! یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کون؟........ وہ کون سا موتی ہے، جس نے تمہاری آنکھوں سے دل تک اُجیارا بکھیر دیا ہے۔“ مراد متجسس لہجے میں بولا۔

ایک لمحے کو سکندر ملک نے اسے دیکھا اور دوسرے لمحے ایک خیال کا کوندا اس کے ذہن میں لپکا۔

مراد کیا سوچے گا کہ میری پسند صرف ایک ملازمہ ہے۔ اَن پڑھ ملازمہ........ جو اس حویلی میں نوکرانی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں انسانوں کی چھوٹائی بڑائی کا قائل نہیں، مگر ہمیں اس زمانے کا ساتھ بھی تو دینا پڑتا ہے۔ میں مراد کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ابھی مستقبل کا کوئی پتہ نہیں۔ ایسا نہ ہو، مجھے آئندہ اس کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ یوں بھی، انسان جب کسی کو پسند کرتا ہے تو ہر طرف سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ تب کوئی سوچ بھی نہیں آتی۔ کوئی خوف ذہن و دل کو نہیں جکڑتا۔ وہاں صرف اور صرف جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ ابھی تو اس نے بہت سوچنا تھا۔

اپنے جذبوں کی سچائی کو پرکھنا تھا۔

کہ جذبے بھی خودرو پودوں کی طرح ہوتے ہیں، آپ ہی آپ تو اُگتے ہیں۔ اور خود بخود پتہ بھی نہیں چلتا اور مرجھا جاتے ہیں۔

پھر بھلا وہ کس طرح اس معصوم سی شاداں کا نام لے سکتا تھا؟ وہ تو فی الحال اس حویلی کی دیواروں سے بھی یہ نام چھپانا چاہتا تھا، جو ایک دم ہی اس کے دل کے دالان میں خوشبو بن کر پھیل گیا تھا۔ اور مراد اس سے کہہ رہا تھا۔

"یار! بتاؤ نا، کون ہے وہ لڑکی؟"

"دادی اماں سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ ابھی تو اُس کی صرف ایک جھلک دیکھی ہے۔"

"کوئی ملازمہ تو نہیں؟" مراد علی نے عام سے لہجے میں کہا۔ مگر سکندر ملک کو لگا، جیسے اس کا لہجہ طنز کا نشتر بن کر اُس کے دل میں اُتر گیا ہو۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

"صرف اس لئے کہ تم ملکوں اور چودھریوں کے دل عموماً گاؤں کی الہڑ ملازماؤں پر بھی آجاتے ہیں نا۔"

"مراد بابو! آپ کے گھر سے ٹلی فون (ٹیلی فون) آیا ہے۔" فضلو نے آکر کہا تو مراد کا مسکراتا چہرہ ایک دم ہی بجھ گیا۔

"خیریت تو ہے؟"

"وہ جی، ملکانی نے کہا ہے، آپ کو بلا لاؤں۔ وہ انتظار کر رہی ہیں۔" فضلو نے ادب سے کہا۔

"جاؤ یار! تمہارے ڈیڈی کا فون ہو گا۔ یہ کنفرم کرنے کے لئے کیا ہو گا کہ صاحبزادے واقعی یہاں آئے ہیں یا......"

مراد علی کوئی جواب دیئے بغیر کمرے سے نکل گیا اور سکندر ملک نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا تو اس کی آنکھوں میں شاداں اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ اُتر آئی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت سموئے سکندر ملک کو اپنے دل کے ہر خانے میں جھانکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

سکندر ملک اپنی اس کیفیت پر بہت حیران ہو رہا تھا۔ آج تک ایسا موقع نہ آیا تھا۔ پچیس چھبیس برس کا وہ اُمنگوں اور جذبوں سے بھرپور نوجوان تھا۔ پولیٹیکل سائنس میں ایم۔اے کیا تھا اور اسی سال ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔ پھر پورا سال سی۔ایس۔ایس کے امتحان کی تیاری کی وجہ سے اس نے سیر و تفریح اور ہر تقریب کو خود

پر حرام کر لیا تھا۔ صرف پڑھائی کے علاوہ اور کچھ نہ سوچا تھا۔ ایگزام سے فارغ ہو کر اس نے خوب مراد علی کے ساتھ تفریحات کی تھیں۔ مری، سوات، کاغان، چترال اور اسکردو گئے تھے۔ وہ امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اب اکیڈمی جانے سے پہلے مراد علی کی خواہش پر ہی سکندر آباد آ گیا تھا۔

مراد علی کا تعلق فیصل آباد سے تھا اور اس کے ڈیڈی اپنا بزنس کرتے تھے۔ وہ سکندر ملک کا کالج فیلو تھا اور دونوں کو ایک ساتھ رہتے عرصہ بیت گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور بہت ہی پائیدار دوستی تھی۔ اس دوستی میں کبھی تفرقے کا کانٹا نہ پڑا تھا۔ اور تفرقہ تب پڑتا ہے، جب کوئی تیسرا وجود درمیان میں آ جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ہی فی الحال اُس تیسرے وجود سے بچے ہوئے تھے، جسے لڑکی کہتے ہیں۔

یونیورسٹی میں بھی دونوں نے بقول اپنے بہت "پاکیزہ" زندگی گزاری تھی۔ دوسرے لفظوں میں دو سال میں یونیورسٹی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی تھی۔ یوں بھی ان کی کلاس میں گنتی کی صرف چار پانچ لڑکیاں تھیں، جو فائنل میں جا کر تین رہ گئی تھیں۔ دو کا پریویس کرتے ہی بیاہ ہو گیا تھا۔ اور ان تینوں لڑکیوں کا اپنا ایک گروپ تھا۔ وہ لڑکوں سے بات بھی نہ کرتی تھیں۔ اس لئے سب نے ان کا نام "ہری مرچیں" رکھ دیا تھا۔ اور پھر کوئی بھی ان کے قریب نہ آتا۔ جب اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں "نو لفٹ" کا اشتہار بنی ہوئی تھیں تو وہ بھلا کہیں اور کیا اُمید رکھتے۔ یوں بھی سکندر ملک کو اپنی پسند کی کوئی لڑکی بھی نظر نہ آئی تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ لڑکی ایسی ہو، جو کچھ اُس کے ہونٹ کہیں، وہی اس کی آنکھوں میں بھی رقم ہو۔ اس کے گالوں پر صرف اس کے نام کی حیا پھیلے۔ جو غیر مردوں سے بات کرتے ہوئے بے شک جھجکے نہ، مگر اس میں ایک متانت آمیز فاصلہ ہو۔ جو مرد کو مرد سمجھ کر بات کرے۔ اسے کوئی بہت توپ شے نمانہ سمجھے۔

جب بھی سکندر ملک ویک اینڈ پر گھر جاتے، ثمینہ بیگم، زرّیں کو ضرور بلوا لیتیں۔ بلکہ کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ سکندر شام کو ہاسٹل سے گھر پہنچتے تو زرّیں پہلے ہی سے موجود ہوتی۔ اس کی کمپنی میں وہ واقعی بہت خوش رہتا۔ مگر جب سے ثمینہ بیگم نے اپنی خواہش کا برملا اظہار کیا تھا تو وہ ایک دم ہی زرّیں سے کھنچ گیا تھا۔

"میری پسند تو یہ کبھی بھی نہیں رہی۔"

پھر ثمینہ بیگم نے مراد علی سے کہا تھا کہ وہ سکندر ملک کو سمجھائے، اُن کی خواہش

بتائے۔ اور جب مراد علی نے سکندر ملک سے بات کی تھی تو اُس نے نہایت ناگواری سے کہا تھا۔

"یار! رہنے دو، زندگی ہماری ہے۔ ہم اپنی مرضی سے گزاریں یا والدین کی خواہشوں کی بھینٹ خود کو چڑھا دیں۔ مجھے زریں بالکل پسند نہیں۔"

"پھر تمہاری پسند کیا ہے؟" مراد نے پوچھا۔

"جس دن نظر آ گئی، سب سے پہلے تجھے ہی بتاؤں گا۔"

"بعض مرتبہ نظریں بھی دھوکا کھا جاتی ہیں۔ اس لئے والدین کی پسند پر اعتماد کر کے ہامی بھر لو کہ بعد میں والدین کی پسند اپنی بن جاتی ہے اور قربت وہ گل کھلاتی ہے کہ پتھر بھی پارس بننے لگتا ہے۔"

"میں اس فطرت کا مالک نہیں ہوں، مراد! تمہیں علم ہے کہ میں ہمیشہ اپنی مرضی کرتا ہوں، اپنے لئے خود راستے منتخب کرتا ہوں۔ پھر یہ تو زندگی کا بہت بڑا موڑ ہے، جو میں سب کو شامل کر کے........لیکن خود مڑوں گا۔" سکندر ملک کے لہجے میں اتنی سختی تھی کہ پھر مراد علی کچھ بھی نہ بول سکا تھا۔ مگر ثمینہ بیگم ابھی تک مایوس نہ ہوئی تھیں، بلکہ پُر اُمید تھیں۔ اور انہیں یقین تھا کہ سکندر، زریں کو شریکِ سفر بنانے کے لئے مان جائے گا کہ ان کے خیال میں زریں سے بہتر اسے زندگی کی ساتھی نہ مل سکتی تھی۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔

کیونکہ جس قسم کی ساتھی کی تمنا اس کے دل میں مچلتی تھی، وہ اسے نظر آ گئی تھی، شاداں کے روپ میں۔ مگر اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اس کی پسند نہایت نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہو گی، جس کا خاندان پشت ہا پشت سے ان کی حویلی کا خدمت گار تھا۔ چلو، یہ بھی بات تسلیم کر لی جاتی کہ سب انسان برابر ہیں، جنہیں ہم نے مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ اپنے ذہن، دل اور دولت کے خانوں میں سب سے بڑا پیمانہ دولت رکھا گیا ہے۔ جس کے پاس دولت کے کھنکتے سکے ہیں، وہ خود بخود ہی اونچے طبقے میں اپنی پہچان کروا لیتا ہے۔ وہ خود پہچان نہیں کرواتا بلکہ اُس کے سکے پہچان کرواتے ہیں۔ اور جن کے پاس دولت نہیں ہے، وہ ان دولت مندوں کی خدمت کرتے ہیں۔ چاہے ان سے زیادہ باعزت شہری ہوں۔

شاداں اُس کی پسند کے عین مطابق تھی، مگر اس میں بہت بڑی خامی تو یہ تھی کہ وہ اَن پڑھ تھی اور سکندر ملک نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اُس کی ہمسفر بالکل صفاچٹ ہو۔ کتنی

بڑی دو خامیاں تھیں اُس میں، جسے اس نے پسند کیا تھا۔ اور یہ بہت بڑی خامیاں تھیں، جسے وہ تو قبول کر سکتا تھا، مگر گھر والوں سے کس طرح لڑتا۔ ان خامیوں سے مبرّا اُس کی پسند ہوتی تو ٹکرا بھی سکتا تھا۔

"تم کیوں پریشان ہوتے ہو، سکندر ملک!

جب حشر کا وقت آئے گا،

تب دیکھا جائے گا........

ان لمحوں کو مت گنواؤ۔ یہ لمحے پھر نہیں آئیں گے۔ جو کچھ کرنا ہے کر لو، یہی فیصلے کا، خواہشوں کو پورا کرنے کا وقت ہے۔

کسی کو بھی تو مکمل جہان نہیں ملتا۔

ہر چیز میں کوئی نہ کوئی خامی تو ہوتی ہے۔

چاند، جو کروڑوں نگاہوں کا مرکز ہے، چکور اسے پانے کے لئے اپنی اُڑان اونچی کر دیتا ہے۔ اُس چاند میں بھی کتنا گہرا داغ ہے۔ اور شاداں میں تو اتنی بڑی خامی نہیں........صرف پڑھی لکھی نہیں۔ ضروری نہیں کہ عقل ڈگریوں کی محتاج ہو۔ بعض تعلیم یافتہ لوگ جاہلوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ تم سکندر ملک، سوچ لو۔ ہر لحاظ سے شاداں تمہارے لئے مناسب ہے۔"

سکندر کا دل بار بار شاداں کی طرف داری کر رہا تھا۔

جبکہ ذہن نت نئی دلیلیں دے رہا تھا۔ ابھی وہ کسی بھی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ جذباتی نہ تھا۔ جذبات کو وہ گھٹیا ترین ہتھیار سمجھتا تھا۔ کامیابی کا راستہ تلاشتا تھا۔ اور اس کے لئے ابھی وقت درکار تھا۔ فوراً اس نے کبھی بھی فیصلے نہ کئے تھے۔ تبھی مراد گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

اس کے اندر کی پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"خیریت تو ہے، مراد! کس کا فون تھا؟" سکندر نے پوچھا۔

"ابرار بھائی نے فون کیا تھا۔ ڈیڈی پر رات دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ رات ہی انہیں لاہور لے گئے ہیں۔ اور ابھی........ ڈیڈی انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ہیں۔ ابرار بھائی نے لاہور ہی سے ٹیلی فون کیا تھا۔" مراد نے جلدی جلدی تفصیل بتا دی۔

"تو اس کا مطلب ہے، تم کو ابھی جانا ہے؟" سکندر نے پوچھا۔

"ہاں۔ ڈرائیور سے کہو، مجھے بسوں کے اڈے تک چھوڑ آئے۔"

"پاگل ہوئے ہو؟ میں خود چلوں گا۔ انکل کی طبیعت اگر ٹھیک ہوئی تو تمہیں ساتھ لے آؤں گا۔"

"نہیں........ میں نہیں آؤں گا۔" مراد، بیگ میں کپڑے ڈالتا ہوا بولا۔

"یار! شکار نہیں کھیلنا؟" سکندر ملک نے اسے یاد دلایا۔

"پھر کبھی سہی۔" مراد نے بیگ کی زپ بند کر دی۔

"میں دادی اماں سے اجازت لے آؤں، تم تب تک اپنی چیزیں سمیٹ لو۔" سکندر نے کہا۔

"جلدی آنا یار!"

"تم پریشان مت ہو۔ مجھے یقین ہے، انکل اب بالکل ٹھیک ہوں گے۔" سکندر نے اس کا کندھا تھپکا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

ملکانی سکینہ، گرم کپڑوں کو دھوپ لگوانے کے لئے بڑے صندوق میں سے نکلوا رہی تھیں کہ سکندر ملک دبیز پردے ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔

"آؤ سنی! میرا خیال ہے، تم مراد کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"جی دادی ماں! میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔"

"ویسے بھی وہ بہت اپ سیٹ لگ رہا ہے۔ خدا اس کے والد کو صحت دے۔ تم اسے لاہور چھوڑ کر واپس یہیں آؤ گے۔" ملکانی سکینہ نے اسے فیصلہ سنا دیا۔

"جو حکم، دادی ماں!" وہ بولا۔

"بیٹا! میں نے کبھی کسی کو بھی حکم نہیں دیا۔ میں تو ہمیشہ سے التجا ہی کرتی آئی ہوں۔" ملکانی سکینہ کا لہجہ بھیگ گیا۔

"پلیز دادی ماں! رونے کی نہیں ہو رہی۔" سکندر نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور وہ مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔

"جن ماؤں کے بیٹے جوان ہوں، دادی ماں! انہیں نہیں رونا چاہئے۔"

"ہاں، نہیں رونا چاہئے۔ پر کیا کروں؟ اب بوڑھی ہو گئی ہوں نا، تو ذرا ذرا سی بات پر آنسو آنکھوں میں آ جاتے ہیں۔ ورنہ میں تو بہت بہادر ہوں۔"

"ملکانی جی!........ ملکانی جی!" شاداں انہیں پکارتی ہوئی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی، پھر سامنے کھڑے سکندر ملک کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر جلدی سے اس نے اپنے فرش پر گھسٹتے دوپٹے کا پلو سر پر جما لیا۔

"کیا بات ہے، شاداں؟"

"وہ..... وہ ملکانی جی! پھر کر لوں گی بات۔" وہ سکندر ملک کی نظروں سے گھبرا کر بولی۔

"تُو سنی سے ملی ہے؟" ملکانی سکینہ نے پوچھا۔

"نہیں دادی ماں! میں تو ابھی اسے دیکھ رہا ہوں۔" شاداں کے بولنے سے پہلے ہی سکندر ملک نے کہہ دیا اور شاداں اس دھڑلے کے جھوٹ پر حیران حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"یہ شاداں ہے........ میری شاداں........ سنی! یہ مجھے بہت پیاری ہے۔ میری تنہائیوں کی ساتھی ہے یہ۔ اس کی وجہ سے تو میں اولاد کی دُوری بھی بھُلا چکی ہوں۔ تم اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔" ملکانی سکینہ کی آنکھوں میں شاداں کی محبت کی لاٹیں روشن تھیں اور ویسی ہی لاٹیں اس نے اسی وقت سکندر ملک کی آنکھوں میں دیکھی تھیں۔ شاداں کے پورے وجود میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور ملکانی سکینہ، محبت سے سرشار لہجے میں کہے جا رہی تھیں۔

"شاداں ایک انمول ہیرا ہے، جس پر مجھے بہت فخر ہے۔"

"ہائے ملکانی جی! اب اتنی تعریفیں تو نہ کریں۔" شاداں شرما گئی۔

"کیوں؟" سکندر ملک نے براہِ راست اُس سے پوچھا۔

"اب اچھا نہیں لگتا کہ بڑے میری تعریف کریں۔"

"تعریف بری نہیں لگنی چاہئے تمہیں۔" سکندر ملک نے کہا۔

"وہ جی، مجھے پتہ ہے کہ میں ہوں ہی تعریف کے قابل۔ بار بار تو نہیں جتایا جانا چاہئے۔"

سکندر ملک حیران رہ گیا۔

اتنا اعتماد، اتنا فخر اپنی ذات پر........ یہ معمولی سی دیہاتی لڑکی خود پر اتنا زعم رکھتی ہے؟ کتنے اعتماد سے بات کر رہی ہے کہ میں ہوں ہی تعریف کے قابل۔

"شاداں! تم سکندر سے پوچھ کر اس کی ضروری چیزیں ایک بیگ میں ڈال دو۔"

"کیوں جی؟"

"یہ لاہور جا رہا ہے نا۔" وہ بولیں۔

"قسم سے ملکانی جی! میں نے تو ان سے کوئی بات نہیں کی تو پھر یہ کیوں جا رہے ہیں

جی؟ پوچھ لیں، میں نے کسی طرح کا تخول نہیں کیا۔ سنی ملک! بتائیں نا، بھلا میں نے آپ سے کوئی تخول کیا ہے؟ میں آپ کو دیکھ کر ہنسی ہوں؟" شاداں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا اور وہ حیران و ششدر سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"پھر بتائیں نا، آپ کیوں خفا ہو کر جا رہے ہیں؟........میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں کان پکڑتی ہوں۔"

شاداں نے اس کا بازو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو، موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سکندر ملک کو اپنا عکس اس کی آنکھوں میں ڈولتا محسوس ہوا۔ وہ ڈوب رہا تھا، ان جھیلوں میں کہ ملکانی سکینہ کی ہنسی نے اسے مدہوشی کے سمندر میں غرق ہونے سے بچا لیا۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"جھلی ہے نری۔ سنی تو مراد کے ساتھ جا رہا ہے، اُسے لاہور چھوڑنے۔"

"اچھا، میں سمجھی کہ ملکانی جی! آپ پھر مجھ سے خفا ہو جائیں گی۔" شاداں نے کان چھوڑ دیئے اور دوپٹے سے آنکھوں کی نمی صاف کرنے لگی۔

"تو آپ لوگ شکار پہ نہیں جائیں گے؟"

"ناں۔" سکندر نے سر کو منفی جنبش دی۔

"کیوں؟"

"اس لئے جو خود شکار ہو جائیں، وہ بھلا شکار کس طرح کھیلیں گے۔"

سکندر ملک نے گول مول سا جواب دیا اور اس قدر آہستہ کہ قریب کھڑی صرف شاداں ہی سن سکی تھی اور وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ شاداں اس کے جملوں پر غور کرتی رہ گئی۔

"جا، شاداں! اُسے کسی شے کی ضرورت نہ ہو۔" ملکانی سکینہ نے اسے گم صم کھڑا دیکھ کر کہا۔ شاداں باہر آئی اور جب وہ اوپر جانے کے لئے زینے پر قدم رکھ ہی رہی تھی کہ مراد علی اور اس کے پیچھے سکندر ملک دونوں نیچے آ رہے تھے۔ فضلو نے ان دونوں کے بیگ اٹھائے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے تھا۔ شاداں ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے کھڑی تھی۔

مراد علی تو فضلو کے ساتھ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گیا اور سکندر ملک، شاداں کے قریب ہی رک گیا۔ اُس کی نظروں میں اتنی تپش تھی کہ شاداں ٹھنڈ میں خود کو پسینوں میں ڈوبتا محسوس کر رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کی یہ

کیفیت تو کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ تو خود کو بہت بہادر اور جی دار سمجھتی تھی۔ تب اس نے اپنی منتشر دھڑکنوں پر قابو پایا اور لرزتی آواز میں بولی۔

"شہر میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ جھوٹ کی جماعت بھی ہوتی ہے۔"

"تم کیا جانو کہ زندگی میں بعض جھوٹ کتنے اچھے اور سچے لگتے ہیں۔"

"پر آپ نے ملکانی جی سے کیوں کہا کہ مجھ سے نہیں ملے تھے؟" آہستہ آہستہ اس کا اعتماد لوٹ رہا تھا۔

"میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ دادی ماں تمہیں کیا اہمیت دیتی ہیں۔"

"وہ تو مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔" وہ فخر سے بولی۔

"اس کا اندازہ ہو گیا ہے، مجھے اور........" سکندر ملک نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اور کیا؟ بولو نا۔ بات ادھوری نہیں چھوڑنی چاہئے۔ کہتے ہیں کہ سخت گناہ ہوتا ہے۔"

"اب تو ہم گناہ و ثواب کے چکر سے مبرا ہو گئے ہیں۔"

"جی........میں سمجھی نہیں؟"

سکندر کے جواب دینے سے پہلے ہی مراد علی نے جیپ کا ہارن بجا دیا۔

"اب میں جاؤں۔ یہاں کھڑا رہا تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہو گا۔ اور مراد کے لئے تو پل پل بھاری ہے۔ آؤں گا تو پھر تم سے باتیں ہوں گی۔" سکندر کے لہجے میں مٹھاس تھی اور آنکھوں میں بے تحاشا طلب۔

اور عورت میں یہ خوبی ضرور ہے کہ وہ اور باتیں سمجھے یا نہ سمجھے مگر مرد کی طلب کو بہت اچھی طرح جانتی ہے۔

عورت کے اندر، بہت اندر الارم سا بجنے لگتا ہے۔ شاداں کے اندر بھی ایک ایسا ہی الارم بج رہا تھا، جسے وہ فی الحال کوئی نام نہ دے سکی تھی۔

"اچھا شادا! اللہ بیلی۔" سکندر ملک نے اس پر مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کئے اور تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں عبور کر گیا۔

عجیب اتفاق تو یہ ہوا کہ اتنی ہی تیزی سے اس نے شاداں کے آنگنِ دل تک پہنچنے والا زینہ بھی عبور کر لیا۔ شاداں پریشان ہی تو ہو گئی۔

"شادا........شادا!"

ہر سمت سے یہی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔

ہوائیں شاد........شاد........کی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ درو دیوار سے بھی نام سکندر ملک کے گمبھیر لہجے کے مانند سنائی دے رہا تھا۔ ہر طرف اسی نام کی صدائیں تھیں۔

شاداں نے ٹھنڈی ریلنگ سے سر ٹکا دیا اور آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ریشمی گالوں پر لڑھک آئے۔

اس کے دل میں جذبے اتنے دبے قدموں داخل ہوئے تھے کہ پتہ بھی نہ چل سکا تھا۔ اور یہ نیا احساس، نئی خواہش اور نئی اُمنگ، اشک بن کر اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئی تھی۔

سارا دن ہی وہ اپنے آپ میں گم، کام نمٹاتی رہی۔ بار بار چونک جاتی۔ لگتا، کوئی اس کے بہت ہی قریب شاد، شاد کی سرگوشیاں کر رہا ہو۔ اسے اپنا یہ مختصر سا نام بہت اچھا لگا تھا۔

پھر سکندر ملک کے لہجے میں جو پریم تھا، اس نے شاداں کے وجود میں سرشاری کی کیفیت بھر دی تھی۔

سردیوں کی شامیں بہت ہی خوب صورت ہوتی ہیں۔ پھر گاؤں کی شامیں جہاں درختوں پر بہت جلد شام میں جھک آتی ہیں۔ شاداں، ملکانی سکینہ کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ موٹر رکشہ کی آواز سن کر اس کے ہاتھوں سے لکڑی کی کنگھی چھوٹ گئی اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی تو برآمدے ہی میں اُس کے قدم جم گئے۔ دل کی فصل میں لگا جیسے ایک دم ہی آگ لگ گئی ہو۔ سامنے ہی ملکانی سکینہ کی بیٹی آمنہ کھڑی تھیں اور ان کے ساتھ ہی اونچے قد کاٹھ کی خوب صورت آنکھوں اور لمبے بالوں والی عنبرین تھی۔

وہ سمجھی تھی، سکندر ملک آیا ہو گا۔ اب ملکانی آمنہ اور عنبرین کو دیکھ کر شاداں کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ بس انہیں حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مایوسی اس کے دل پر برف کے گالوں کی طرح گر رہی تھی۔

''بھئی شاداں! کیا ہوا تمہیں؟........کیا دیکھ رہی ہو؟'' ملکانی آمنہ نے نہایت محبت سے اس سے پوچھا تو وہ چونکی۔

''سلام چھوٹی ملکانی! میں تو عنبرین بی بی کو دیکھ رہی ہوں۔ کتنی بڑی ہو گئی ہیں۔ اور پھر خوب صورت بھی۔''

''بس، سوا سال میں ہی بھول گئیں؟'' عنبرین نے اسے لپٹا لیا۔

''نہ جی، بھلا آپ کو بھول سکتی ہوں؟ آپ کے تو ساتھ کھیلی ہوں۔'' شاداں نے

ہنس کر کہا۔ پھر وہ ان کے ساتھ اندر آ گئی۔ ملکانی سکینہ، بیٹی کو اچانک دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئیں۔ تب ملکانی آمنہ، ماں کے گال سے گال رگڑتے ہوئے بولیں۔

''بس ماں جی! آپ سے ملنے کو جی بہت اُداس ہوا تو میں آنے کے لئے تیار ہو گئی۔ عنبرین بھی ساتھ ہو لی کہ آج کل گنے کا موسم ہے اور خوب رس پئیں گے۔''

''اچھا، تو یہ بات ہے عنبرین بی بی! میں سمجھی، تمہیں ہماری محبت لے آئی ہے۔'' شاداں نے شکوہ کیا۔

''ارے شاداں! گنے کا رس تو صرف بہانہ ہے، اصل مٹھاس تو تمہاری محبت میں ہے جو مجھے کشاں کشاں کھینچ لاتی ہے۔'' عنبرین نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تبھی اتنے دنوں بعد آئی ہو؟''

''تمہیں پتہ تو ہے، میری پڑھائی ہے۔''

''کب سے تم ڈاکٹری پڑھ رہی ہو؟ آخر کب بنو گی ڈاکٹر؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''بس، دو سال اور ہیں، پھر عیش ہی عیش ہوں گے، فرصتیں ہوں گی، میں ہوں گی، میری شاداں اور ہماری ڈھیر ساری باتیں ہیں نا۔'' عنبرین اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بول گئی۔

شاداں سے عنبرین کی دوستی بہت پرانی تھی۔ عنبرین اس سے تین برس بڑی تھی۔ مگر وہ اس طرح بے تکلف تھیں، جیسے کہ ہم عمر ہوں۔ عنبرین ہر بار چھٹیوں میں سکندر آباد آتی تھی، صرف شاداں کی وجہ سے۔ اُسے بھی شاداں بہت عزیز تھی اور بارہا اس نے ملکانی سکینہ سے کہا تھا کہ وہ شاداں کو پڑھائیں، مگر وہ نہ مانی تھیں۔ پھر ملکانی آمنہ بھی ماں کی ہمنوا تھیں کہ پڑھ کر بھی شاداں نے کیا کرنا ہے۔ گھر تو اس نے اپنے ہی جیسے لوگوں کا بسانا ہے، جہاں تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں، صرف کام کی اہمیت ہوتی ہے۔

عنبرین، ملتان میں پڑھتی تھی اور آدھی چھٹیاں وہ شاداں کی خاطر سکندر آباد میں گزارتی تھی اور آدھے دن تونسہ شریف میں اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ۔ کبھی کبھی وہ شاداں کو بھی اپنے ہمراہ چند دنوں کے لئے تونسہ لے جاتی تھی۔ شاداں کا دل وہاں بہت گھبراتا تھا۔ وہ ملکانی سکینہ کے بغیر کہیں بھی نہ رہ سکتی تھی، چاہے کہیں کتنی بھی محبتیں ملتیں۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ عنبرین سے گھبرا کر کہتی۔

''عنبرین بی بی! میرا دل ملکانی جی کے لئے اُداس ہے۔ مجھے گھر بھیج دو۔'' اور عنبرین کبھی اسے زبردستی نہ روکتی۔ اسے علم تھا کہ اس کی نانی ماں میں معصوم شاداں کی جان

ہے۔ وہ اسے بھیج دیتی۔

یوں بھی شاداں سے محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ عنبرین کی کوئی بہن نہ تھی۔ وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور بہن کی خواہش اس کے دل میں ہمیشہ ہی پارے کی طرح مچلتی تھی۔ اسی لئے شاداں کو چاہتی تھی کہ اس نے بہن کی محبت اور کمی کی تکمیل کی تھی۔

پھر محبتیں تو بدل سے ہوتی ہیں۔ عنبرین اسے چاہتی تھی، تبھی تو شاداں بھی جان وار دیتی تھی۔ یوں بھی اس فیملی میں شاداں ہر کسی کی چہیتی تھی۔ ملکانی سکینہ کی بہوئیں عائشہ، فیروزہ اور ثمینہ بھی اسے پسند کرتیں اور چاہتی تھیں۔ یا شاید یہ وجہ تھی کہ وہ ان کی ساس کی چہیتی تھی۔ یوں بھی انسان کے گُن دیکھے جاتے ہیں اور شاداں کو پیار اُس کے گُن ہی کرواتے تھے۔ البتہ سہراب ملک کی لیلیٰ خانم نہ ملکانی سکینہ کو پسند کرتی تھیں اور نہ ان سے وابستہ بیٹیوں کو۔ بہت کم وہ سکندر آباد آتی تھیں۔ بس سہراب ملک ہی بے چین ہو کر بھاگے آتے تھے۔ یوں بھی زمینوں پر وہی زیادہ جاتے تھے۔ اس لئے ماں کے پاس بھی آ جاتے اور انہیں سارا حساب دیتے۔ مگر کبھی انہوں نے پیسے کے علاوہ اپنے دنوں اور راتوں کا ماں کو حساب نہ دیا تھا۔

''چھوٹی ملکانی! آپ ابھی تو یہیں رہیں گی نا؟'' شاداں نے ملکانی آمنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی، آج تو آئی ہے یہ۔'' ملکانی سکینہ نے کہا۔

''کل چلی جاؤں گی۔'' آمنہ بولیں۔

''عنبرین بھی؟''

''نہیں، میں ابھی رہوں گی۔ چھٹیاں ہیں نا؟''

''بالکل ٹھیک........دل خوش کر دیا ہے۔'' شاداں خوشی سے چہکی۔

''بھئی شاداں! مجھے بالائی والی چائے تو پلا۔ پر اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔'' عنبرین نے کہا۔

''بالکل جی۔ ابھی لائی۔'' شاداں بھی ایک دم ہی ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔

''بہت فرمانبردار ہے یہ۔'' ملکانی سکینہ نے کہا۔

''نانی اماں! جب یہ چلی جائے گی، پھر؟'' عنبرین نے ہنس کر کہا۔

''یہ کہیں نہیں جائے گی، عنبرین بیٹا!''

''کیوں ماں جی؟'' ملکانی آمنہ نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس سے جو بھی شادی کرے، میری شرط یہی ہو گی کہ جب تک میں زندہ ہوں، وہ بھی اسی حویلی میں رہے۔''

''تو ماں جی! گاؤں کے تو کئی لوگ مان بھی جائیں گے۔ اور یوں بھی اب آپ کو شاداں کے واسطے کوئی بَر دیکھنا چاہئے۔ پینو سے کہیں، کوئی اپنی برادری میں دیکھے یا کہیں اور۔ سترہ برس کی تو ہو گئی ہے۔ یہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔''

''ہاں، ہوتی ہے۔ تو پھر تم عنبرین کی بھی کر دو۔'' وہ سلگ کر بولیں۔

''ماں جی! آپ کا کہا صحیح، مگر عنبرین تو ابھی پڑھ رہی ہے۔ پھر اس کے لئے کیا کمی ہے؟''

''نذر کے بڑے بھائی نے اپنے معین کے لئے مانگا تھا، عنبرین کو۔ میں نے انکار کر دیا کہ اس کا شوق ہے، ڈاکٹر بننے کا۔ یکسوئی سے پڑھ لے، پھر دیکھی جائے گی۔'' ملکانی آمنہ نے کہا۔ ''بھلا کوئی کمی ہے اس میں؟''

''تو شاداں میں کیا کمی ہے؟''

''آپ تو بات کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں۔'' ملکانی آمنہ ہنس دیں۔

تبھی شاداں آ گئی۔ ''لو جی، گرما گرم چائے ہے، ملائی والی۔ پیو اور دعائیں دو مجھے۔'' شاداں نے ٹرے میز پر رکھ دی اور گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گئی۔

''ملکانی جی! میٹھا پاواں؟'' اس نے آمنہ سے پوچھا۔ کیونکہ آمنہ شوگر کی مریضہ تھیں اور میٹھے سے پرہیز کرتی تھیں، اس لئے وہ ان سے ہمیشہ پوچھ لیتی تھی۔

''نہ........مجھے پھیکی ہی دے دو۔ میٹھے کو ترس گئے ہیں۔ زہر ہے ہمارے لئے۔''

''ارے چھوٹی ملکانی! جو ڈرتا ہے، وہی مرتا ہے۔ اب دیکھیں ملکانی جی کو۔ میں انہیں ہر چیز کھانے کو دیتی ہوں اور مجال ہے، کوئی بیماری ان کے نزدیک بھی جائے........ہے نا، ملکانی جی؟''

شاداں نے اپنی بات کی تصدیق کے لئے ان کو مخاطب کیا اور انہوں نے مسکرا کر اس کی بات کی تائید کر دی۔

⊛......⊛......⊛

''ہائے شاداں! بہت ٹھنڈ ہے........ ہیٹر آن کر دے نا۔'' عنبرین تقریباً کانپتے ہوئے بولی۔

''اوہو، عنبرین! ابھی تم رضائی میں گھسو گی تو سردی دُور ہو جائے گی۔ مصنوعی طریقے

گرمائش کے مت آزمایا کرو۔" شاداں نے نہایت بے پروائی سے کہا اور عنبرین صرف اسے دیکھ کر رہ گئی، جو نہایت اطمینان سے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی، کروشیے کی کوئی بیل بُن رہی تھی۔ عنبرین نے اپنی شنیل کی رضائی سے خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور بولی۔

"شادو......!"

"ہوں۔"

"کوئی ماہیا تو سناؤ۔"

"ابھی تو سو جاؤ، صبح سناؤں گی۔"

"ابھی سناؤ۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"یاد نہیں ہے کوئی۔"

"تمہیں تو بہت سارے یاد تھے۔"

"سب بھول گئی ہوں۔" شاداں کا لہجہ دھیما تھا۔

"خیر تو ہے، تیرا حافظہ کب سے خراب ہو گیا؟"

شاداں نے اُسے دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا۔ "عنبرین! تمہیں کیا پتہ کہ جب سے اسے دیکھا ہے، دل و ذہن صرف ایک ہی نام دہرا رہے ہیں۔ اور تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔"

"یار! سنا نا۔ قسم سے، تیری آواز مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میرا بس نہیں چلتا، ورنہ ریڈیو اسٹیشن لے جاؤں۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر نانی ماں اجازت نہیں دیں گی۔" عنبرین کی آواز میں مایوسی تھی۔

"نہ مجھے بھی شوق نہیں کہ ہر ایرے غیرے میری آواز سنتے پھریں۔" شاداں کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"چلو، میں تو ایری غیری نہیں نا۔ مجھے تو سنا دے۔"

"کیا سناؤں؟"

"کوئی بھی اچھا سا ماہیا۔"

چند لمحے وہ سوچنے کے بعد نہایت لے میں گانے لگی۔

دل تانگھ تانگھ اے
اللہ جوڑے سانگے
سجناں دا ملنا مشکل مہانگھ اے

پتہ نہیں کیوں، آخری مصرعے پر اُس کی آواز بھرّا گئی۔ آنکھوں میں سکندر ملک کا عکس اُتر آیا اور وہ آنکھیں بند کئے گا رہی تھی۔

شالا خیر ہووی بر دے سائیں
تیڈے باجھوں ڈسدے سُنجیاں اے جائیں
اکھیاں توں پچھ گن لگی سینے ڈانگھ اے
سجناں دا ملنا مشکل مہانگھ اے
دل تانگھ تانگھ اے

"واہ...... بھئی واہ!...... شادو! قسم خدا کی، تیری آواز کی میں تو عاشق ہوں۔" عنبرین اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "سچی، بہت لوچ آ گیا ہے، تیری آواز میں۔ چکر کیا ہے؟"

عنبرین کے لہجے میں شرارت کے ساتھ ساتھ شکوک بھی تھے۔ شاداں مسکرا دی اور بولی۔ "سب خیر ہے جی۔ اب عمر کے ساتھ ساتھ آواز بہتر ہی ہو گی۔ سنا تو یہی ہے۔"

"ویسے شادو! تیری آواز پر کتنے ہی گاؤں کے لڑکے عاشق ہوں گے۔"

"میں باہر جاتی ہی نہیں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"وہ جو تیرے ماے کا بیٹا ہے، کیا نام ہے؟"

"امیر محمد۔" شاداں نے بتایا۔

"ہاں وہی۔ پچھلی بار جب میں آئی تھی تو بتایا تھا تُو نے کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں، وہ چاہتا تھا، پر میں نے انکار کر دیا۔" شاداں نے کہا۔

"کیوں بھئی؟"

"وہ میرا حویلی آنا بھی پسند نہیں کرتا اور میں ملکانی جی کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"کیا اسی لئے تُو نے انکار کیا؟"

"نہیں، وہ مجھے پسند بھی نہیں تھا۔ نہ ہی ملکانی جی کو پسند تھا۔"

"اوہو، تو یہ بات ہے۔ پھر تجھے کون پسند ہے؟"

شاداں خاموش ہی رہی۔ بلکہ اس نے دانتوں تلے ہونٹوں کو دبا لیا۔ ورنہ اسے یقین تھا کہ اس کے لبوں کے بھنور سے "سکندر ملک" کا نام بے ساختگی میں نکل جاتا۔ اور یقیناً حویلی میں طوفان آ سکتا تھا۔

یوں بھی یہ تو اُسے معلوم تھا کہ دل کی دنیا بدلی ہے، اس کی خاطر روایات اور رسمیں تو

نہیں بدل سکتیں۔ پھر سکندر ملک کے دل میں کیا ہے، اس کی بھی اسے خبر نہ تھی کہ اس سے تو ہر کوئی پیار و محبت سے ہی پیش آتا تھا۔ اگر سکندر ملک نے نرم لہجے میں بات کر لی تھی تو کون سی دنیا سے نرالی بات ہو گئی تھی۔

⊛......⊛......⊛

دوسرے روز سویرے سویرے شدید ٹھنڈ کے باوجود شاداں نے عنبرین کو ساتھ لے لیا۔ وہ دونوں کھیتوں کی طرف نکل آئیں۔ قریبی کھیت میں گنّوں کا انبار لگا تھا اور ایک طرف بیلنا لگایا ہوا تھا، جہاں گنّے کا رس نکالا جا رہا تھا۔ قریب ہی بڑے سے کڑھاؤ کے نیچے آگ جل رہی تھی اور اس کی بالٹیاں بھر بھر کر اس کڑھاؤ میں ڈالی جا رہی تھیں، تاکہ گُڑ بنایا جا سکے۔

"چاچا رمضو! ہمیں بھی رس پلاؤ نا۔"

"تُو کہتی، حویلی میں پہنچا دیتا۔ اتنی سردی میں تُو چھوٹی ملکانی کو بھی لے آئی ہے۔"

"ہائے رمضو چاچا! جو مزا کھیتوں میں بیٹھ کر گنّے کھانے اور بیلنے کے ساتھ بیٹھ کر رس پینے میں ہے، وہ گھر میں کہاں؟ بس تم ہمیں یہیں دے دو۔" شاداں دھپ سے گنّوں کے سوکھے چھلکوں پر بیٹھ گئی اور ساتھ کھینچ کر اس نے عنبرین کو بھی پاس بٹھا لیا۔

رمضو نے جلدی سے جگ رس سے بھر کر ان کو دے دیا اور وہ دونوں مزے سے رس پینے لگیں۔

شاداں حسبِ معمول رمضو سے بے سروپا باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ تبھی بندو کی سائیکل کی ٹلی نے شاداں کی توجہ مبذول کرائی۔

"اے بندو! اتنی سویرے سویرے؟"

بندو نے اسے دیکھا نہیں تھا، تبھی تو اس کی آواز پر بندو کی سائیکل کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی بریکیں لگ گئیں۔ اس نے سائیکل شیشم کے درخت کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کی اور ندی پھلانگ کر انہی کے قریب چلا آیا۔

"سلام بی بی جی!" بندو نے عنبرین کو سلام کرنے کے بعد شاداں کو مخاطب کیا۔

"اُس روز شاداں! انہی کے آنے کا خط آیا تھا نا؟"

"جی نہیں۔" شاداں نے کہا۔ "وہ تو سکندر ملک آئے ہیں۔"

سکندر ملک کے نام پر شاداں کو لگا، جیسے اس کے چاروں طرف اُجیارا سا پھیل گیا ہو۔

"کب آئے ہیں سکندر ملک؟" عنبرین نے پوچھا۔ "گھر میں تو مجھے نظر نہیں آئے۔"

"وہ جی پرسوں آئے تھے اور کل صبح لاہور چلے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست بھی تھے۔ بس یہ بات ہے۔ آج آ جائیں گے۔"

"کیا کہہ گئے تھے؟" عنبرین نے پوچھا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے، آج آئیں گے۔" روانی میں شاداں کے منہ سے نکلا اور عنبرین ہنس دی۔ اور شاداں خوامخواہ ہی جھینپ گئی۔

دوپہر کو کھانے کے بعد ملکانی آمنہ واپس تونسہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ عنبرین کو وہ چھوڑ کر ہی جا رہی تھیں کہ سکندر آ گیا۔ وہ آتے ہی ملکانی سکینہ کے کمرے میں آیا تھا۔

"السلام علیکم، دادی ماں!........اوہو، پھپھو جی بھی یہیں ہیں۔" وہ جھکا اور آمنہ کے سامنے سر جھکا دیا۔ آمنہ نے اُس کی پیشانی چوم لی۔

"مراد کے والد کیسے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہیں، دادی ماں! بس بہت تھوڑے دل کا ہے وہ۔ پھر گھر میں سب سے چھوٹا ہے، اس لئے باپ کا لاڈلا بھی ہے۔"

"آپ بھی تو سب سے چھوٹے ہیں، سکندر بھائی! آپ تو لاڈلے نہیں۔" عنبرین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"تمہیں کیا پتہ، کتنا لاڈ اُٹھتا ہے میرا۔ کیوں دادی ماں؟"

"اچھا ماں جی! میں چلوں۔" آمنہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اتنی جلدی پھپھو جی؟ میں آیا ہوں اور......"

"تمہارے ماما کو فون کر دیا ہے تو منتظر ہوں گے۔"

"کبھی انہیں تنہا بھی چھوڑ دیا کریں۔" سکندر نے شرارت سے کہا۔

"بس، بے تکی باتیں آتی ہیں۔" آمنہ کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ پھر آمنہ چلی گئیں۔

"سنی ملک! آپ کے لئے کھانا لگاؤں؟" شاداں نے دوپٹہ انگلی پر لپیٹتے ہوئے پوچھا تو سکندر ملک نے ایک لحہ کو اس کی طرف دیکھا اور فوراً نظر ہٹا لی کہ ملکانی سکینہ اُس کی طرف متوجہ تھیں۔

"ہاں لگا دو کھانا۔ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔"

”نہیں دادی ماں! مجھے بالکل بھی بھوک نہیں۔“

”کیا کھانا کھا لیا تھا؟“

”نہیں۔“ سکندر اُن کے کندھے سے ہٹ گیا اور شاداں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”آپ کو دیکھتے ہی بھوک اُڑ گئی۔“

”لیں جی، نانی ماں نہ ہوئیں، بھوک ختم کرنے کی ڈوز ہو گئیں۔“ عنبرین ہنسی۔

”تم کیا جانو، جن سے انسان محبت کرتا ہے، انہیں دیکھ کر دل کی تشنگی مٹتی ہے تو......“

”بھوک بھی اُڑ جاتی ہے۔“ عنبرین نے اس کا جملہ اُچک لیا۔

”بالکل...... بالکل۔ کیوں شاداں! ہے نا یہی بات؟“ سکندر ملک نے براہِ راست شاداں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم ہی گڑبڑا گئی۔

”وہ جی، مجھے کیا پتہ؟“

”کیا تم نے کبھی محبت نہیں کی؟“

”میں سمجھی نہیں۔“

”اِدھر آؤ، میں سمجھاؤں۔“ سکندر کی آنکھوں میں جذبوں کی کلیاں چٹکنے لگیں۔

”سنی! بری بات۔ لڑکیوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے پُتر!“ ملکانی سکینہ نے سرزنش کی۔

”چلو، پھر کبھی سہی۔ سنا ہے، تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔ اگر چاہ سے بنا کر پلا دو تو......“ سکندر ملک کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی شاداں کمرے سے نکل گئی۔

وہ جو کل سے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتی پھر رہی تھی، اب پھر اپنی دھڑکنیں سنبھالنی مشکل ہو گئی تھیں۔ اس نے چائے بنائی، علیحدہ پیالے میں بالائی رکھی کہ عنبرین کو چائے میں بالائی بہت پسند تھی اور ٹرے میں وہ برتن رکھ کر لے آئی۔ آج پہلی بار ملکانی سکینہ کے کمرے میں جاتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود میں ہمت پیدا کی۔

سکندر ملک، ملکانی سکینہ کے پلنگ پر بیٹھا دروازے ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سکندر ملک کے اندر، بہت اندر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہ وہی تو تھی، جو کل سے اُس کے ایوانِ دل میں نہایت بے پروائی سے ٹہلتی پھر رہی تھی۔ اور رات سکندر ملک نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ شاداں کو ضرور اپنائے گا۔

اسے علم تھا کہ دادی ماں اس کی ضرور طرف داری کریں گی۔ اور اگر کسی نے مخالفت بھی کی تو وہ جاب کرتے ہی شاداں کو اپنا لے گا۔ مگر ہر صورت اس نے شاداں کو اپنانے کا تہیہ کیا تھا کہ اسے علم تھا، اتنا معصوم حُسن اور ایسے سادہ اطوار کی لڑکی اسے کہیں نہیں ملے گی۔ یہ اس کا جذباتی فیصلہ نہ تھا بلکہ دل و ذہن نے اس کے اس فیصلے کو تسلیم کیا تھا۔ اور وہ بہت مطمئن تھا۔

”ملک جی! میٹھا پاواں؟“ شاداں نے آہستگی سے پوچھا اور وہ صرف آنکھیں جھپک کر رہ گیا۔

کتنا حسین انداز ہے؟

اور کتنی خوب صورت بات ہے؟...... ہاں شاداں! تمہیں میں یہ اختیار دیتا ہوں کہ تم میری زندگی میں بھی مٹھاس گھول دو۔“ سکندر ملک نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے سوچا۔ انہیں چائے دے کر شاداں باہر چلی گئی اور وہ مزید سکندر ملک کا سامنا نہ کر سکتی تھی۔ پھر وہ سکندر کے سامنے گئی ہی نہ۔ بس تنہا اپنے جذبوں سے لڑتی رہی۔ وہ جو سکندر ملک کو دیکھنے کو بے قراری کل سے پھر رہی تھی، دیکھ کر پھر تشنہ آرزوئیں اس کے دل سے لپٹ گئیں۔

ایسی چیز کی طرف دیکھنے کا کیا فائدہ، جسے انسان پا ہی نہ سکے؟...... پھر دل للچانے کا کیا فائدہ؟...... ایک دم ہی اس نے اپنی آنکھوں میں کل کے دیکھے گئے خوابوں کی قبر بنا لی کہ یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

حویلی کے پچھواڑے کنوؤں کا چھوٹا سا باغ تھا۔ تقریباً پچیس تیس بوٹے تھے، جو ملکانی سکینہ نے حویلی میں بسنے والوں کے لئے لگوائے تھے۔ ویسے بابا پور کے باغوں سے فروٹ آ جاتا تھا، لیکن یہاں یہ تھا کہ جب بھی چاہا، موسمی، فروٹر اور کنو توڑ لئے۔ رات ہی انہوں نے شاداں سے کہا تھا کہ سکندر صبح سویرے موسمی کا جوس لیتا ہے۔ عنبرین سوئی ہوئی تھی اور شاداں نماز و تلاوت سے فارغ ہو کر باغ میں آ گئی تھی۔

رات بھر سکندر ملک کے خوابوں نے نہ سونے دیا تھا۔ وہ جو خواب نہیں دیکھنا چاہتی تھی، شعور بار بار دکھا رہا تھا۔ کہیں رات کے پچھلے پہر نیند آئی تھی تو پھر حسبِ معمول ان کی آواز پر آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ سکینہ ملک کے لئے جوس نکالنا ہے۔ تبھی وہ اس وقت باغ میں تھی۔ وہ موسمی توڑ رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سہم کر ایک دم ہی پلٹی تو سامنے ہی سکندر ملک کھڑا اُسے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کہاں چھپ گئی تھیں تم؟......میری آنکھیں تمہیں تلاشتے تلاشتے تھک گئی تھیں۔ ہر آہٹ پر تمہارا گمان ہوتا رہا۔ کیوں چھپی تھیں؟"

سکندر ملک کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے اور شاداں تو یوں سہمی ہوئی تھی، جیسے کہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ سکندر ملک کے ہونٹ، آنکھیں، ابرو، پیشانی غرض کہ اُس کا رُواں رُواں جواب مانگ رہا تھا کہ وہ کیوں اس سے چھپ گئی تھی۔

"سنی ملک! میں......میں بہت اونچائی پر نہیں چڑھ سکتی۔" شاداں کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ وہ نیچے پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔

"میرے سہارے تم ہر اونچائی عبور کر لوگی۔"

"یہ بھلا کس طرح ممکن ہے؟" شاداں نے گردن اونچی کر کے اسے دیکھا۔

"کتنی نازک بیلیں ہوتی ہیں۔ اور جب انہیں کسی درخت، ستون یا دیوار کا سہارا ملتا ہے تو کتنی تیزی سے اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ تو شادا! عورت بھی ایک نازک بیل ہوتی ہے۔ مضبوط بانہوں کے سہارے وہ کئی سنگلاخ چٹانیں عبور کر سکتی ہے۔" سکندر ملک نے شاداں کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں اپنی آنکھیں اُلجھا دیں۔

"شادا! اپنا ہاتھ مجھے دے دو۔" سکندر ملک اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"سنی ملک! کبھی آسمان اور زمین کا ملاپ بھی ہوا ہے؟"

"میں نے تمہیں اس روز بھی کہا تھا کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔"

"آپ کا یہ وقتی فیصلہ ہے۔ پھر بعد میں پچھتانا پڑے گا۔"

"میرے فیصلے کو وقتی کہہ کر میرے جذبات کی توہین مت کرو، شادا! تمہیں کیا علم کہ اس جگہ پہنچنے تک میں نے کتنا سوچا ہے اور اس سوچ نے مجھے یہ راہ بتائی کہ میں تم سے تمہی کو مانگ لوں۔"

"مجھ سے مجھے مانگو گے؟" وہ مسکرائی۔

"ہاں۔"

"اور جو کوئی تمہیں بن مانگے ہی سب کچھ چپکے سے دے چکا ہو تو؟"

"واقعی......؟"

"ہاں سنی ملک! شاداں بہت سچی اور کھری لڑکی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ اور مجھ سے بھی تم جھوٹا وعدہ مت کرنا۔ جھوٹ سے مجھے بہت نفرت ہے۔ اتنی شدید نفرت کہ

شاید اس نفرت کی آگ سے یہ کائنات بھی جل جائے۔"

"اتنی بڑی بڑی باتیں مت کیا کرو، شادا!" سکندر نے کہا۔

"کیوں نہ کروں؟ سچائی سے تم مجھے منع نہیں کر سکتے۔"

"تمہیں نظر لگ جائے گی۔" سکندر کے لہجے میں محبت تھی۔

"کیا اتنی بری نظر ہے تمہاری؟" بے ساختہ شاداں کے لبوں سے نکلا تو سکندر ملک زور سے ہنس دیا۔

جو لوگ لفظوں کی ترتیب اور حُسن پر غور نہیں کرتے، وہ بہت سادہ اور سچے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے شاداں بھی تھی۔ پھر طویل ترین فاصلے ایک دم ہی سمٹ کر ان کی مٹھی میں آ گئے۔ سکندر ملک نے شاداں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے سامنے رہا کرے۔ اور شاداں ایسا ہی کرتی۔ مگر کبھی کبھی اسے شرارت بھی سوجھتی اور وہ سکندر ملک کی نظروں سے چھپ جاتی تو وہ پریشان ہو جاتا۔ ایک بار اس نے سکندر ملک سے کہا تھا۔

"ملک جی! فرض کرو، میں تمہیں نہ مل پائی، پھر کیا ہو گا؟ تم کس طرح رہو گے؟"

"میں یہ نہیں کہتا شادا! کہ میں مر جاؤں گا۔ میں زندہ رہوں گا، مگر میرا دل مر جائے گا۔ یہ جو تم مجھے پریشان دیکھتی ہو نا، تو یہ میں نہیں، میرا دل پریشان ہوتا ہے۔ تم نظر نہ آؤ تو یہ بے ایمان، بے چین ہو جاتا ہے اور......"

"بس، مجھے کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ یہ کیسی محبت ہے، جو ایک دم ہو گئی۔"

"مجھے یا تمہیں؟" سکندر وضاحت چاہتا تھا۔

"دونوں ہی کو۔" شاداں اس کا سوال سمجھے بغیر بولی۔

"مجھے تو تمہیں دیکھ کر یوں لگا تھا، جیسے تم صدیوں سے میرے ساتھ ہو۔ تم نے د گانا سنا ہے نا؟"

"کون سا؟"

"آؤ میرے کمرے میں۔ میں تمہیں سنواتا ہوں۔"

"تم جاؤ، میں آتی ہوں۔"

"نہیں، میرے ساتھ چلو۔ میرے ساتھ چلنے کی عادت ڈالو۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"ملکانی جی دیکھ لیں گی۔" شاداں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اچھا ہے نا، دیکھ لیں۔'' وہ مسکرایا۔

''کیوں اچھا ہے؟''

''انہیں پتہ چل جائے کہ ان کا پوتا جوان ہو گیا ہے۔''

''بہت بے شرم ہو۔'' وہ سرخ ہو گئی۔

''کون بے شرم ہے بھئی؟'' عنبرین آ گئی تھی اور اس نے شاداں کا جملہ سن لیا تھا۔ شاداں کے تو پسینے چھوٹ گئے۔

''ہاں سکندر بھائی! یہ کس کو خطاب ملا ہے؟''

''میرے علاوہ تمہیں کوئی نظر آ رہا ہے؟'' سکندر نے لمحوں کو اوک میں لے کر راز فاش کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں کئی روز سے آپ دونوں کے بدلے بدلے انداز تو دیکھ رہی تھی، پر مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مجھ سے بھی چھپائے گی۔'' عنبرین نے شاداں کا کان پکڑ لیا۔

''عنبرین! کچھ باتیں انسان خود سے بھی چھپاتا ہے نا؟'' شاداں نے نہایت رسان سے کہا۔

''کیوں؟ کیا تمہیں سکندر بھائی کی محبت پر بھروسہ نہیں؟'' عنبرین نے اس کا کان چھوڑ دیا۔

''ان پر بھروسہ تو خود سے زیادہ ہے۔ مگر وقت پر بھروسہ نہیں کہ کب ہمارے دامن میں انگارے بھر دے۔ یہ محبتوں کے پھول دہکتے انگاروں میں بدل جائیں اور.......''

''بس یہی عادتیں اس کی بری ہیں۔ خوشی کے موقع پر ناگ جیسے وسوسوں سے خود کو بھی ڈسواتی ہے اور دوسروں کو بھی۔'' سکندر نے غصے سے کہا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''میرے بھائی کو خفا کر دیا ہے تم نے۔''

''یہ تو روز ہی خفا ہو جاتے ہیں۔''

''منانے والا تم سا ہو تو ہر گھڑی روٹھنے کو جی چاہتا ہے۔'' عنبرین نے کہا تو وہ ہنس دی اور بولی۔

''جی نہیں....... یہ منانے کے سلسلے ہم نے نہیں رکھے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دیکھنا، آپ آ جائیں گے۔'' پھر عنبرین نے صدقِ دل سے کہا۔

''کتنا اعتماد ہے تمہیں اپنی محبت پر۔ خدا تمہارا یہ اعتبار ہمیشہ قائم رکھے۔''

عنبرین مزید کچھ کہتی کہ منظوراں نے اے آ کر بتایا کہ چوہدری نذر محمد، فون پر اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چلی گئی تو شاداں، سکندر ملک کے کمرے میں آ گئی۔ وہ رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھا آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔

''ملک جی! وہ گانا تو سناؤ نا؟'' شاداں اس کے سامنے آ بیٹھ گئی۔ لیکن وہ یونہی آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

''ملک جی! سنا نہیں تم نے، مجھے گانا سناؤ ورنہ.......''

''ورنہ کیا؟'' وہ آنکھیں بند کئے کئے بولا۔

''میں جا رہی ہوں۔'' شاداں ایک دم ہی اُٹھ کر جانے لگی تو وہ اُٹھ کر سامنے آ گیا اور بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں ستاتی ہو مجھے؟''

''تم کیوں مجھے ستاتے ہو؟'' اُلٹا اس نے سوال داغ دیا۔

''چاہتا بھی تو ہوں۔'' سکندر نے کہا۔

''اور یہ جرم میں بھی کرتی ہوں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

''پھر اس جرم کی سزا کیا ہونی چاہئے؟'' سکندر نے شوخی سے کہا۔

''مجرم کو اگر سزائیں تجویز کرنے کا اختیار ہوتا نا، ملک جی! لوگ پھانسی کبھی نہ چڑھتے۔''

''اتنی گہری باتیں تُو نے کہاں سے سیکھی ہیں؟''

''غلط تو نہیں کہا نا؟''

''اب اتنا صحیح بھی نہیں۔'' سکندر مسکرا کر رہ گیا اور پلٹ کر ٹیپ پلیئر میں کیسٹ لگا دیا۔ چند لمحوں بعد ہی کمرے کے پُرسکوت ماحول میں وہ خوب صورت اور گمبھیر آواز گونجنے لگی۔

قسمت میں لکھی کوئی بات ہو تم
تقدیر کی اک سوغات ہو تم
تم سے مل کر محسوس یہ ہوا
صدیوں سے یونہی میرے ساتھ ہو تم

کمرے میں اس گیت کے بول گونج رہے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ بہت خوب صورت جذبہ تھا، جو دونوں کے بیچ بہہ رہا تھا۔ اور اس جذبے کے دھارے کے ساتھ وہ بھی بہہ رہے تھے۔

⊛......⊛......⊛

"تو سنی! اس کا مطلب ہے کہ عنبر نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، وہ سچ ہے؟" ملکانی سکینہ کی بارعب آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑ ڈالا تھا۔ اور سکندر ملک کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسے عنبرین سے اُمید نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی دادی ماں سے سب کچھ کہہ دے گی۔ ورنہ وہ سنبھل کر ملکانی سکینہ کے بلانے پر ان کے کمرے میں آتا۔ اور انہوں نے کتنے سخت لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"یہ تم نے شاداں کے ساتھ کون سا کھیل شروع کیا ہے؟...... کہاں تک صداقت ہے اس بات میں جو مجھے پتہ چلی ہے؟"

سکندر ملک کی خاموشی نے ملکانی سکینہ کو بتا دیا تھا کہ جو انہوں نے سنا ہے، وہ سچ ہے۔ انہوں نے عنبر کا نام بھی لے لیا تھا۔

"دیکھو سکندر! یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے، جب ہر طرف جذبات ہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ تم نے اگر کوئی جذباتی فیصلہ کر لیا ہے، کوئی کھیل کھیلا ہے تو لوٹ آؤ۔ کیونکہ شاداں بہت معصوم ہے۔ بہت قریب لا کر اس سے دور ہوئے تو وہ مر جائے گی۔ آبگینوں سے بھی نازک ہے وہ۔"

"دادی ماں! میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا، اسے اپنانا چاہتا ہوں۔" سکندر ملک کے لہجے میں سچائیاں ہی سچائیاں تھیں۔

"پہلے اپنی ماں اور باپ سے تو پوچھ لو کہ وہ اس حویلی کی ملازمہ کو بہو بنانے پر راضی ہو جائیں گے؟"

"ابھی وہ نوکرانی ہے، دادی ماں! اگر وہ آپ کے ساتھ بیٹھ جائے، میری بیوی بن جائے تو مہارانی بن جائے گی۔ آپ...... آپ دادی ماں! ممی اور ڈیڈی کو منا لیجیے گا۔"

"بیٹا! تم میں اتنا حوصلہ ہونا چاہئے کہ تم اپنی محبت پانے کے لئے سب سے ٹکرا جاؤ۔ میری کوئی نہیں سنے گا۔ نہ تم، نہ تراب۔ اپنی مرضی سب نے شروع سے کی ہے اور اب بھی وہ اپنی منشا ہی کریں گے۔ میں ثمینہ اور تراب کو بلوا لیتی ہوں، تم خود ان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو تو مناسب ہے۔" سکندر تیزی سے آگے بڑھا اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"دادی ماں! آپ خوش ہیں نا، میرے اس فیصلے پر؟"

"بیٹا! دل کبھی غلط فیصلے نہیں کرتا، بشرطیکہ دونوں طرف جذبے پوتر ہوں۔ ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا خیال بھی ذہن و دل میں نہ آئے تو محبت سے بڑھ کر خوب صورت اور پیارا جذبہ کائنات میں اور کوئی نہیں ہے۔" ملکانی سکینہ اُس کے بالوں میں انگلیوں سے دھیرے دھیرے کنگھی کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"وہ لوگ بہت کم ظرف ہوتے ہیں، سنی! جو محبت کے نام پر دھوکا کرتے ہیں۔ دوسروں کو خون تھوکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاداں کی ماں بھی محبت کے نام پر مٹ گئی تھی۔ جوانی میں ہی زندگی لٹا بیٹھی۔ کیا دیا اسے محبت نے؟ صرف شاداں کا تحفہ اور...... ٹی بی جیسا موذی مرض۔"

"دادی ماں!" سکندر نے ملکانی سکینہ کی طرف دیکھا، جن کی آنکھوں میں شاداں کی ماں کے ذکر پر آنسو آ گئے تھے۔

"شنو محبت پر قربان ہو گئی، سنی! مگر میں شاداں کو شنو نہیں بننے دوں گی۔ ہاں سنی! میں نے شاداں پر بہت محنت کی ہے، بہت پیاری ہے مجھے یہ۔ اُس کا دکھ میری جان لے لے گا۔ تم ابھی ثمینہ اور تراب کو فون کرو اور کہو کہ فوراً سکندر آباد پہنچیں۔"

"دادی ماں! آپ خود کر دیں نا؟"

"اچھا، تم نمبر تو ملاؤ۔" وہ آنسوؤں کے بیچ مسکرا دیں۔ اور پھر چند لمحے بعد تراب ملک سے کہہ رہی تھیں۔

"تم اور ثمی ہی آ جاؤ یہاں۔ بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"

"بس، تم آؤ گے تو بتاؤں گی۔"

ملکانی سکینہ نے انہیں فون پر کچھ بھی نہ بتایا اور سکندر ملک کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ یہ خوشخبری شاداں کو سنانے باہر آ گیا، جہاں وہ برآمدے میں دھوبی کو کپڑے گن گن کر دے رہی تھی۔

⊛......⊛......⊛

"ماں جی! آپ نے کیا سوچ کر سنی سے وعدہ کیا ہے؟...... وہ معمولی سی ملازمہ اور ہماری بہو بنے، یہ کیا بات ہے؟" ثمینہ بیگم نے ملکانی سکینہ کی ساری بات سن کر نہایت نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"سنی اُسے چاہتا ہے۔" ملکانی جی نے کہا۔

"جوانی کا اُبال ہے، یہ چاہت ماں جی! اس عمر میں یونہی فضول میں انسان محبتوں میں جکڑا جاتا ہے۔ فالتو جو ہوتا ہے۔ کوئی کام نہیں ہوتا۔ تراب ملک نے سگار کا کش لیتے ہوئے رعونت سے کہا۔

"تراب! تم یہ مت بھولو کہ تم نے بھی پسند سے شادی کی تھی۔ اور میں تمہاری راہ کی رکاوٹ کبھی نہیں بنی۔ تم سب بھائیوں نے اپنی مرضی سے شادیاں کیں، میں نے کچھ کہا؟"

"مگر ہم نے کوڑے کو گلے نہیں لگایا تھا۔ خاندان دیکھا تھا، تب دل اور پھر گھر بسایا تھا۔" مگر تراب کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"پھر یہ محبت تو نہیں، سودے بازی تھی۔ محبت کبھی سوچ سمجھ کر نہیں ہوتی۔ یہ تو بے اختیار جذبہ ہے۔"

"ماں جی! آپ ہی کی شہ ہے، اُسے۔ اگر آپ اُسے سمجھاتیں تو وہ کبھی اتنی گری ہوئی شے نہ اُٹھاتا۔"

"مت توہین کرو تم اس کی محبت کی۔" ملکانی سکینہ بھڑ گئیں۔

"کیا ہے اس لڑکی میں، جس نے آپ پر جادو کیا ہوا ہے؟ ہے تو نوکرانی ہی نا۔" ثمینہ بیگم نے سر جھٹک کر کہا۔

"میں چاہوں تو آج اسے ملکانی بنا دوں۔ اپنے حصے کی ساری زمین اس کے نام کر دوں۔ مجھے کوئی روک سکتا ہے؟"

"آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں، جو بھی کریں۔ مگر میں سنی کی شادی اس لڑکی سے نہیں کر سکتا۔"

"کیا برائی ہے اس میں؟"

"ماں جی!...... ماں جی! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ کبھی کوئی باہوش و حواس بھی سر میں خاک ڈالتا ہے؟" تراب ملک کا لہجہ اب تیز تھا۔

"تراب! مجھے افسوس ہے، میری خواہش تم پوری نہیں کرنا چاہتے۔ یہ دیکھو کہ میں نے تمہاری خواہشوں کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا۔ تم لوگوں کی خاطر تنہائیوں کو گلے لگایا ہے اور تم مجھے پھر تنہا کرنا چاہتے ہو۔" ملکانی سکینہ کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"تو آپ اس طرح بدلہ لے رہی ہیں، ماں جی! آپ نہیں چاہتیں کہ شاداں یہاں سے جائے تو گاؤں کے کسی بھی لڑکے سے اس کی شادی کر دیں اور اسے بھی یہیں رکھ

لیں۔" تراب ملک بولے۔

"یہ تم کہہ رہے ہو۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم اپنی کوئی بیٹی گاؤں کے کسی غریب لڑکے سے بیاہ دو تو تم......"

"ماں جی...!" تراب ملک غصے سے کھول کر رہ گئے اور کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیوں......اپنی بیٹی کے ذکر پر کلیجے پر ہاتھ پڑا ہے۔" ملکانی سکینہ کا لہجہ نہایت کٹیلا تھا۔

"شاداں میں اور میری بیٹی میں بہت فرق ہے۔"

"کوئی فرق نہیں ہے، تراب! صرف باپ ہی کا تو فرق ہے۔ ورنہ شاداں بھی اسی حویلی والوں کا خون ہے۔" ملکانی سکینہ کے لبوں سے یہ جملہ نکلا اور دروازے سے لگے کھڑے سکندر ملک اور شاداں کو لگا، جیسے کہیں قریب ہی دھماکا ہوا ہے۔

"ہاں تراب! وہ راز جو میں نے برسوں چھپایا۔ اور آفرین ہے شاداں کے ماموں، ماسی اور خالو پر جنھوں نے اس راز کو چھپانے میں میرا ساتھ دیا کہ کبھی ہوا تک کسی کو لگنے نہیں دی کہ حویلی میں پلنے والی شاداں، سہراب ملک کی بیٹی ہے۔"

"ماں جی......!" تراب ملک اور ثمینہ بیگم کے منہ سے ایک دم ہی نکلا۔

"اور یہ تو سہراب کو علم بھی نہیں ہے کہ وہ جس شنو کو وعدوں کے کھلونے دے کر اور اس کے وجود میں تخلیق کا موتی ڈال کر چلا گیا تھا، وہی موتی میری حویلی اور میرے دل کو جگمگا رہا ہے۔ ہاں تراب! تمہارے بھائی نے معصوم شنو سے محبت کی، پھر اس سے شادی بھی کر لی اور پھر لوٹ کر نہ گیا اور وہ سکندر آباد آ کر یہیں کی مٹی میں مل گئی۔ سہراب کو بھی میں نے بلوایا ہے اور وہ کاغذات بھی رات کو میں نے صندوق سے نکلوائے ہیں، جو شنو کے اس کی بیوی ہونے کا ثبوت ہیں۔ کئی بار میرا جی چاہا، میں اس کا گریبان پکڑ کر پوچھوں کہ اس نے وہ کمینی حرکت کیوں کی، جو ہمارے خاندان میں کسی نے نہ کی تھی۔ کسی کو بھی کسی نے دھوکا نہ دیا۔ پھر شنو کو اس نے دھوکا کیوں دیا؟ مگر میں یہ سب نہ پوچھ سکی۔ یا تو مجھ میں ہمت نہ تھی یا اسی وقت کی منتظر تھی میں۔ شاداں ہمارے گھر کی عزت ہے اور یہ کسی صورت ممکن نہیں کہ ملکوں کی بیٹی کہیں باہر جائے۔ اُسے اسی گھر میں رہنا ہے، اسی خاندان میں۔ یہ تم دونوں سن لو۔" ملکانی کا لہجہ چٹانوں کی طرح تھا۔

شاداں سے مزید کچھ بھی نہ سنا جا سکا۔ وہ لڑکھڑائی اور قریب کھڑے سکندر ملک کے

بازوؤں میں جھول گئی۔ اور سکندر ملک چیخ ہی تو پڑا۔

"دادی ماں!........ دادی ماں! یہ دیکھیں، شاداں کو کیا ہو گیا ہے۔" سکندر کی آواز حویلی کے سب کمروں میں گونج گئی تھی۔

عنبرین بھاگی بھاگی آئی۔ تراب ملک اور ثمینہ بیگم بھی باہر آ گئے تھے۔ وہ سکندر ملک کے بازوؤں پر بے سدھ پڑی تھی۔ سیاہ پلکیں اُس کے گالوں پر سایہ فگن تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ سکندر اُسے اٹھا کر اندر لے آیا اور ملکانی سکینہ کے بستر پر لٹا دیا۔ عنبرین اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگی اور تراب ملک نے پریشان ہو کر فضلو کو ڈاکٹر کو بلانے بھیجا۔

ثمینہ بیگم نے بے سدھ پڑی شاداں کو دیکھا، جس کے لمبے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی شاداں، ثمینہ بیگم کو بہت ہی اچھی لگی۔

وہ جوان کے بیٹے کی پسند تھی اور سہراب ملک کی بیٹی تھی، اتنے برس اس نے حویلی میں ملازمہ بن کر گزار دیئے تھے۔

ماں جی اس کی حقیقت سے واقف تھیں، تبھی اتنا التفات رکھتی تھیں اس سے۔ شہر آتیں تو شاداں کے لئے اُداس ہو جاتیں۔

سب کا یہی خیال تھا کہ اسے بچوں کی طرح پالا ہے، اسی لئے اس کے لئے پریشان ہوتی ہیں۔ اب پتہ چلا کہ بات تو کچھ اور تھی۔ یہ تو خون کی کشش تھی، جو انہیں بے قرار کر دیتی تھی۔

کیا برائی ہے شاداں میں؟........ صرف پڑھی لکھی ہی تو نہیں ہے۔ پھر بیٹے کی پسند بھی ہے۔

"آخر سکندر بھائی! اسے کیا ہوا؟" عنبرین نے پریشان ہو کر سکندر سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔"

"میں نے کہا بھی تھا کہ اس سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیا کریں، بہت تھوڑے دل کی ہے۔ اور اب دیکھیں نا۔" عنبرین رو دینے کو تھی۔

پھر ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے شاداں کو چیک کیا، پھر انجکشن لگانے کے بعد دوا بھی دی۔

"پریشان نہ ہوں، ٹھیک ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر نے اپنی مسیحا گری کا مخصوص جملہ دہرایا۔

"دادی ماں! آپ نے کیوں نہیں بتایا یہ سب کچھ مجھے؟" سکندر، ملکانی سکینہ سے

شکوہ کناں تھا۔

"پُتر! اب بھی نہ بتاتی اگر تمہارے والدین میری شاداں کی توہین نہ کرتے۔ بہت پیاری ہے مجھے یہ۔ کتنی خواہش تھی سہراب کی اولاد کو کھلانے کی اور رب نے مجھے اپنے آپ ہی یہ تحفہ دے دیا تھا۔ میری خواہشوں کا ثمر ہے، شاداں۔"

اُس کمرے میں بس شاداں ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور سکندر ملک کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب سننے کے بعد اب اس کے ماں باپ کا فیصلہ کیا ہے؟

سہ پہر کو سہراب ملک بھی آ گئے۔ اس وقت شاداں ہوش میں آ چکی تھی اور تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔

"خیر تو ہے، آج بہت لوگ جمع ہیں۔" سہراب ملک ہنس کر بولے۔ عنبرین کو انہوں نے گلے سے لگایا، ماں جی کے سامنے جھک گئے۔

"کیسی ہو شاداں؟" انہوں نے اپنی طرف حیران حیران نظروں سے دیکھتی شاداں سے کہا اور اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئے۔

"آج ہم یہاں ایک فیصلے کے لئے جمع ہیں، چاچا جی!" سکندر ملک نے ایک دم ہی بات شروع کر دی۔

"کیسا فیصلہ؟"

"پہلے تم آرام تو کر لو، پھر بتائیں گے۔" ملکانی سکینہ نے کہا۔

"نہیں ماں جی! میں بالکل فریش ہوں۔ آپ بات بتائیں۔"

"سہراب! سکندر شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"تو کر دیں۔ یہ عمر ہے اس کی شادی کی۔" سہراب ملک کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

"مگر جس لڑکی سے یہ شادی کرنا چاہتا ہے، اس کے باپ کی رضامندی چاہئے۔" ثمینہ بیگم نے شوخی سے کہا۔

"کیوں........ کیا وہ ظالم سماج ہیں؟ بھئی کس کی بیٹی ہے وہ؟"

"وہ تمہاری بیٹی ہے، سہراب!" ملکانی سکینہ نے کہا۔

"کیا........؟" سہراب ملک گھبرا کر بولے۔ "کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، ماں جی؟ میری کہاں ہے کوئی بیٹی؟ کیسا مذاق ہے؟"

"کیا........ کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟" ایک دم سے شاداں نے سہراب ملک کا بازو کس کر پکڑ لیا۔ "بتائیں، کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟........ ملکانی جی! بتائیں انہیں

میری ماں کی محرومی کی داستان، جسے انہوں نے محبت کا دھوکا دیا۔ جس سے شادی کی اور پھر...... پھر یہ کیسی محبت تھی، سہراب ملک! جس نے میری ماں کو موت کے اندھیروں میں دھکیل دیا؟ کیا جرم کیا تھا، میری ماں نے؟ بتائیں۔"

شاداں کی آواز پھٹ گئی اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ سب نے اسے رونے دیا کہ اس کے لئے رونا ہی بہتر تھا۔ تراب ملک نے سہراب ملک کو وہ نکاح نامہ اور زیورات کی پوٹلی بھی تھما دی، جو ملکانی سکینہ نے انہیں دیا تھا۔

"اور......اور سہراب! یہ ہے وہ کنگن، جو میں نے اپنی سب بہوؤں کو دیا تھا۔ اور آخر میں یہ سب سے چھوٹی بہو کی امانت تھی۔ یہ لیلیٰ کے پاس تھا اور لیلیٰ نے میرے پوچھنے پر ایک بار بتایا تھا کہ یہ کنگن چوری ہو گیا ہے۔ تمہیں علم تھا کہ یہ کنگن ہمارے ہاں دلہن کو نکاح کے وقت پہنایا جاتا ہے۔ سمجھو اسی کنگن پر نکاح ہوتا ہے۔ اور تم نے شنو سے نکاح کرنے کے لئے یہ کنگن لیلیٰ کے زیورات میں سے چوری کیا تھا نا؟" ملکانی سکینہ کے ہاتھ میں وہ موٹا سا کنگن تھا، جس میں ننھے ننھے ہیرے جڑے تھے۔ اور یہ ملکانی سکینہ کی ساس نے انہیں دیا تھا۔ پھر یہ سب بہوؤں نے پہنا تھا اور آخر میں یہ چھوٹی بہو کو ملتا تھا۔ ملکانی سکینہ سب سے چھوٹی بہو تھیں تو انہیں اور پھر انہوں نے اپنی سب بہوؤں کو دیا۔ آخر میں یہ لیلیٰ کو ملا تھا۔ حالانکہ عائشہ، فیروزہ اور ثمینہ کا دل اس کنگن پر بہت آیا تھا۔ مگر انہیں اُتارنا پڑا تھا اور ثمینہ بیگم اچھی طرح پہچانتی تھیں اس کنگن کو۔ سہراب ملک کے سامنے سارے ثبوت تھے، وہ انکار نہ کر سکتے تھے۔ سب دم سادھے ہوئے ان کے جواب کے منتظر تھے۔

"ہاں، ماں جی! یہ سب سچ ہے۔ مگر بخدا، میں نے شنو سے کوئی دھوکا نہیں کیا۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے اسے اپنے وجود کی اور دل کی پوری شدتوں سے چاہا تھا۔ اس سے نکاح کے بعد میں چار ماہ اس کے ساتھ رہا تھا اور مجھے یہ علم تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ پھر تراب بھائی نے نئی مشینری کے لئے مجھے جرمنی بھیج دیا تھا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ میں مشینری لایا، پھر اسے لگوانا بھی تھا۔ انہوں نے مجھے کراچی بھیجا۔ آپ......آپ گواہ ہیں تراب بھائی! کہ میں نے بارہا آپ سے کہا تھا کہ مجھے زمینوں پر جانا ہے اور آپ خود چلے گئے تھے۔ پھر لیلیٰ بیمار ہو گئی تو میں اسے لندن لے کر چلا گیا۔ لیلیٰ ٹھیک ہو گئی اور اس کی خواہش پر ورلڈ ٹور کا پروگرام بھی بنا لیا۔ جب میں واپس لوٹا تو شنو سے جدائی میں سوا سال گزر گیا تھا۔ اور نانا پور میں گیا لیکن وہ وہاں نہ تھی۔ کس سے

پوچھتا؟ اپنے طور پر تلاشتا رہا اور پھر مایوس ہو گیا۔ مجھے اَن دیکھے بچے کی باہیں اپنی طرف خوابوں میں تو بلاتی تھیں۔ شنو مجھے صدائیں دیتی تھی۔ پھر آخر صبر بھی آ گیا کہ اگر وہ زندہ ہوئی تو ضرور مجھ سے آ ملے گی۔ کیونکہ اسے میرے بارے میں علم تھا کہ میں کون ہوں، کہاں ہے گھر میرا۔ سب علم تھا اسے۔ مگر نہ وہ آئی اور نہ ہی اس کا بابا۔ بہت غیرت مند تھے۔ شاید وہ یہ سمجھے ہوں کہ میں بھی اور بھنورا صفت مردوں کی طرح انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔ دھوکا دیا ہو گا انہیں۔ ماں جی! آپ کو تو علم ہے کہ ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے دھوکا نہیں کیا تو بھلا میں اس عورت سے دھوکا کر سکتا تھا، جس نے مجھے محبت کے اس مفہوم سے آشنا کیا تھا، جس سے میری واقفیت نہ تھی؟ ماں جی! خدا گواہ ہے، جو کچھ ہوا، انجانے میں ہوا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔"

سہراب ملک کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ انہوں نے ملکانی سکینہ کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور بولے۔

"ماں جی! مجھے معاف کر دیں۔ اس جرم پر جو میں نے نہیں کیا۔"

"سہراب! تمہیں چاہیئے تھا کہ مجھے بتاتے۔ تم لوگوں کو علم تھا کہ میں کبھی بھی تمہاری خواہشوں کے سامنے دیوار نہیں بنی۔ تو پھر تم نے مجھے شنو سے شادی کا کیوں نہیں بتایا؟" ملکانی سکینہ کے لہجے میں شکوے تھے۔

"ماں جی! میں وقت کا منتظر تھا۔ وہ وقت، جب شنو میرا دوسرا روپ تخلیق کرتی اور میں اسے آپ کی گود میں ڈال کر اپنی ساری کوتاہیوں کی معافی مانگ لیتا۔ مگر وہ وقت ہی نہ آیا۔" وہ ایک دم ہی چپ ہو گئے۔

اور شاداں خود بخود ہی ماں جی کی گود میں آ گئی۔

ملک تراب نے خوش دلی سے کہا۔

"لیکن ماں جی نے مجھے نہ بتا کر زیادتی کی ہے۔"

"کیسی زیادتی؟"

"میری محرومی کے خلا اتنے وسیع تو نہ تھے۔"

"چاچا جی! چھوڑیں اپنی محرومیوں کو، میرا فیصلہ کریں کہ مجھے تو محرومیوں کے دلدل میں نہیں دھکیلیں گے؟" سکندر ملک نے سہراب کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے۔

"یہ بات تو میری بیٹی سے پوچھو۔ ہر فیصلے کا اختیار اسے ہی ہے۔" ملک سہراب نے پلنگ پر بیٹھی، آنکھیں جھپکتی شاداں کو دیکھا اور پھر بازو پھیلا دیئے۔

"شادو بیٹا! آؤ اور میری تشنگیوں کو مٹا دو۔" ملک سہراب کی آواز بھرا گئی۔

سب ہی شاداں کی طرف متوجہ تھے۔

"ملکانی جی! مان لوں، ملک جی کی بات؟" اس نے وہیل چیئر پر بیٹھی ملکانی سکینہ کی طرف دیکھا تو سکندر ملک نے جلدی سے کہا۔

"پہلے تم اپنا جملہ تو درست کرو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پوچھو، دادی ماں! میں بابا سائیں کی بات مان لوں؟" سکندر ملک کے لہجے میں شاداں کے لئے دنیا کے سارے جذبوں کا پیار بسا ہوا تھا اور آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔

"سنی! میری شاداں کو پریشان مت کر۔ جو وہ کہتی ہے، کہنے دو۔" ثمینہ بیگم نے سکندر کو گھُرکا اور پھر شاداں، ملک سہراب کے پھیلے بازوؤں میں سما گئی۔ ملک سہراب اُسے بے تحاشا چوم رہے تھے اور آپ ہی آپ ان کی تشنگیوں کے سارے خلا بھرتے چلے جا رہے تھے۔

ملکانی سکینہ، ثمینہ بیگم اور عنبرین کی آنکھوں میں بھی اس ملاپ پر بھادوں اُتر آئی۔

اور پھر ملکانی سکینہ کی خواہش پر دو روز بعد ہی پوری حویلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ پوری برادری گھر میں موجود تھی، ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے جا رہے تھے۔ سکندر آباد کے لوگوں میں اناج تقسیم کیا گیا تھا کہ آج ملکانی سکینہ کی لاڈلی شاداں کا سکندر ملک سے نکاح تھا۔ رخصتی سکندر ملک کی ٹریننگ مکمل ہونے پر طے پائی تھی۔ ملکانی سکینہ کو ہمیشہ یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ ان کے بعد اس حویلی کی مالکن کون ہو گی؟ کیونکہ کوئی بہو بھی مستقل حویلی میں رہنے پر تیار نہ ہوتی۔ اور کئی بار اُنہوں نے یہی سوچا تھا کہ وہ کس کو مالکن بنائیں گی۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ سکندر ملک نے اسے پسند کر کے خود بخود ہی سکندر آباد کی حویلی کی مالکن دے دی تھی۔

دُلہن بنی شاداں بہت ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ سکندر ملک کی نگاہیں بار بار اُس پر بھٹک رہی تھیں۔

یہ کیسی خوشی تھی۔ یہ کیسا قرب ملکانی سکینہ نے انہیں دیا تھا کہ درمیان میں پھر بھی دُوری کا وسیع سمندر حائل تھا۔

پیاسے کے منہ سے پانی کا پیالہ لگا کر ہٹا لیا گیا تھا۔ سکندر ملک اپنے جذبوں سے

آپ ہی لڑ رہا تھا۔

پھر شاداں کو سلامی کا سلسلہ شروع ہوا۔ سکندر ملک بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

ملکانی سکینہ کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی منظوراں آئی تھی اور ملکانی سکینہ نے شاداں کو بہت پیار کرتے ہوئے حویلی کی چابیاں شاداں کو دیتے ہوئے کہا تھا۔

"آج اس حویلی کو جوان ملکانی مل گئی ہے۔"

"نہیں دادی ماں! یہ چابیاں آپ ہی رکھیں۔ خدا آپ کا سایہ ہم پر ہمیشہ سلامت رکھے۔" شاداں نے ملکانی سکینہ کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"پُتر! اس کی حق دار تُو ہی ہے۔ اور حق والے کو حق ملنا چاہئے۔ اسے تُو کہہ سنی! تب مانے گی۔"

"اب دادی ماں! اتنا بھی نہیں کہ میں آپ کے بجائے ان کا کہا مانوں۔ پہلے آپ، پھر کوئی اور۔" شاداں نے ملکانی سکینہ کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔

اس کی بات پر سب مسکرا دیئے۔ اور سہراب ملک کو لگا، جیسے کہ آج ان کی ساری زیادتیوں کا ازالہ ہو گیا ہو۔

اور سکندر ملک سوچ رہا تھا، وہ تو مراد علی کے ساتھ یہاں شکار کھیلنے آیا تھا اور خود ہی شاداں کے تیرِ نظر کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے اسی کا ہو گیا۔ اس شکار ہونے میں بھی اسے زندگی مل گئی تھی۔ ابدی زندگی!

❀......❀......❀

پلٹ کر تو نہ جاؤ گے

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

اور جب اقتدار احمد نے نہایت ہی دھیمے مگر دل سوز لہجے میں مجھے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھ سے بہت بڑا ظلم کروایا ہے۔''

یہ جملہ تھا یا گرم سرخ دہکتا ہوا کوئلہ، جو میرے دل پر پڑا تھا۔ اور مجھے لگا، جیسے میرے وجود پر آبلے پڑ گئے ہوں۔

''میں نے ظلم کروایا ہے؟''

میں نے اس کے جملے کی اسی سے تصدیق کروانی چاہی۔

''ہاں، آپ کو پتہ نہیں، نورا کہ وہ کس قدر روئی ہے۔'' اقتدار احمد نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے طویل سانس لی۔

''پھر آپ نے اس کے آنسو نہیں پونچھے؟''

''میرا اُس سے کیا تعلق رہا تھا، جو اُس کے آنسو پونچھتا؟'' اقتدار کے لہجے میں دُکھ گھلا تھا۔

''آپ کو اُس کے آنسوؤں نے دُکھ پہنچایا۔ کیوں؟''

''انسانیت کے ناتے۔'' وہ بولا۔

''ہونہہ، انسانیت۔'' میرے لبوں پر زہر خند پھیل گیا۔ ''آپ کو میرے آنسوؤں کا احساس تو نہیں ہوا نا؟''

''احساس ہوا تھا، تبھی تو.......'' اس نے کہنا چاہا۔

''نہیں اقتدار! آپ کو اس کے آنسوؤں کا احساس ہوا تھا، تبھی تو آپ نہایت ٹوٹے اور بکھرے ہوئے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ اگر مجھے احساس ہوتا تو میں کبھی آپ کی طرف نہ آتا۔ بس، میں نے اسے کہہ دیا کہ میں نہ آئندہ اس سے مل سکتا ہوں اور نہ اس کا کام کر سکتا ہوں۔ اور یہ بھی، آئندہ وہ مجھے نہ ملے اور نہ ہی مجھے کوئی فون کرے۔''

اقتدار احمد نے ایک ہی سانس میں یہ جملہ مجھے بتایا کہ جیسے مجھے بتانے کے لئے اس نے یہ جملہ رٹ رکھا ہو۔ میں اسے دیکھے گئی۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔

''اس کا آخری جملہ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتا رہے گا۔''

''کیا جملہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہ نہیں بتا سکتا۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''آپ کو بہت دکھ ہے، اسے چھوڑنے کا؟'' میں نے کہا۔

''اس کا ایک کام تھا۔ نورا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا کام کروا دوں گا۔'' اقتدار نے بجھی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

''کام.......'' میں نے ہونٹ کچلے۔ ''اقتدار! اسے کوئی کام نہیں ہے، آپ سے۔ وہ صرف اور صرف اس لئے آپ کی طرف بڑھتی بلکہ اسے آپ کی طرف بڑھایا گیا کہ آپ مجھ سے قطع تعلق کر لیں اور اس بات کی گواہی آپ بھی دیتے ہیں نا۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مگر میں نے آپ کو چھوڑا تو نہیں۔ چاہے انہوں نے کچھ بھی کہا۔'' لہجے میں فخر نمایاں تھا۔

''چھوڑا نہیں۔ مگر گزرے چار ماہ مجھ سے جھوٹ تو بولتے رہے نا۔ اقتدار! آپ نے مجھے میرا اعتبار واپس کر کے مجھ سے چھین لیا ہے۔'' میں نے شکوہ کیا۔

''اب کس طرح اعتبار چھینا ہے؟ میں منع تو کر آیا ہوں نا....... مجھے اس سے محبت تو نہ تھی۔''

''پھر یہ دُکھ کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''انسانیت کے ناتے۔ آپ کو معلوم نہیں نورا! میں تو کتے کو بھی تکلیف میں دیکھ لوں تو مجھے چین نہیں آتا۔ پھر وہ تو انسان ہے اور.......''

''تو پھر آپ اس کے آنسو پونچھ دیں۔ لوٹ جائیں واپس۔'' میں نے اقتدار احمد کی

بات کاٹ کر کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ میں دوبارہ لوٹنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اور پھر بس، اب تو سب ختم ہو گیا۔"

"پھر اُداسی کی وجہ.......؟" میں جاننا چاہتی تھی۔

"کتنی بار سمجھاؤں؟"

"اقتدار!....... بخدا، میں اپنے دل کی تمام تر سچائیوں سے کہہ رہی ہوں، آپ اس سے ٹوٹا تعلق جوڑ لیں۔ جب آپ ٹھوکر کھائیں گے تو خود ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں۔ کسی دوسرے کے تجربے ہمارے لئے مشعلِ راہ کب بن سکتے ہیں؟ مجھے اس عورت کے بارے میں علم ہے کہ وہ کیسی ہے۔ جب اس کا کوئی دوست اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ اسے بدنام کرتی ہے۔ حتیٰ کہ عدالت لے جاتی ہے۔ طالب حسن کے ساتھ اس نے یہی سلوک کیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" اقتدار احمد نے تلخی سے کہا۔

"مت تنگ کر مجھ سے بات کریں آپ۔" میں نے بھی تلخی سے کہا۔

"اچھا، ایک بات بتائیں۔ آپ کا اور میرا تعلق ہے۔ اور اگر میں آپ سے قطع تعلق کرلوں تو کیا آپ مجھ پر مقدمہ کر دیں گی؟" اقتدار احمد مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"میں اپنی بات نہیں کر رہی۔" میں نے کہا۔

"میں مان ہی نہیں سکتا کہ طالب حسن پر اس نے مقدمہ کیا ہو۔ آپ نے بے شک قانون پڑھا ہے، مگر سمجھا نہیں ہے نور! میں نے قانون پڑھا بھی ہے اور قانون کا محافظ ہوتے ہوئے میں اس کے سارے نشیب و فراز جانتا ہوں۔" اقتدار احمد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اگر میں ثبوت دے دوں کہ طالب حسن کو وہ ہائی کورٹ تک لے گئی ہے، پھر؟" میں اپنی بات پر اڑی تھی اور کیوں نہ اڑتی کہ میں ہی سچی تھی۔

"پھر میں آپ کی ہر بات سچ مانوں گا۔"

"اور اگر نہ مانے، تب؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"میرا وعدہ۔" اقتدار احمد نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میرا وعدہ ہے، آپ جو کہیں گی، میں مانوں گا۔ میری بات مانیں۔ کسی نے آپ سے غلط کہا ہے۔" وہ مجھے سمجھا رہا تھا۔

"یہ تو میں آپ کو بتاؤں گی۔ میں نے تو چار روز قبل بھی ایک ثبوت آپ کو دیا تھا۔ مگر آپ نے کہا، میں ایسے دسیوں لیٹر بنوا کر دے سکتا ہوں۔ اور بقول آپ کے، آپ کو بہت دکھ ہوا تھا وہ پڑھ کر۔" میرا لہجہ تلخ تھا۔ میں نے بہت ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں دکھ ہوا تھا اقتدار؟ اگر آپ کو اس سے محبت نہیں تھی تو پھر دکھی ہونے کی وجہ؟"

"میں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے اس سے محبت نہیں، ہمدردی ہے۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"ہمدردی۔" میں ہنسی۔ "پہلے ہمدردی ہوتی ہے، پھر یہ حد عبور ہو کر محبت۔ اور یہ حد عبور ہو چکی ہے۔"

"مجھے آپ بہت پیاری ہیں، نور!....... میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں، آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔" اقتدار احمد نے کہا۔

"اس بات کا اعتراف آپ بار بار کر چکے ہیں، اقتدار! یہی خوب صورت لفظوں کا جال ہی تو ہے جس میں جکڑی ہوئی ہوں۔ اور میں نے آپ پر حد درجہ اعتماد کیا۔ طاہر بھائی کچھ بھی کہتے رہے، میں نے ان کی ہر بات آپ کو بتا دی۔ بے شک آپ ان سے لڑے بھی اور وہ بار بار مجھے کہتے....... اب میں تجھے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تُو ہر بات اقتدار کو بتا دیتی ہے اور پھر وہ میرے پیچھے پڑ جاتا ہے....... مجھے تو آپ پر اعتبار تھا، اقتدار! یا پھر میں یہ چاہتی تھی کہ آپ پر واضح رہے، میں ہر بات جانتی ہوں۔ مگر آپ تو لفظوں کی ایسی ہیرا پھیری کرتے کہ مجھے طاہر بھائی جھوٹے لگتے اور آپ سچے۔ اقتدار! آپ نے پورے چار ماہ تک مجھے بے وقوف بنایا اور اس دھوکے پر آپ کو ذرا دکھ نہ ہوا۔ میں نے تو کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا اور......."

"نور! سچ پوچھیں تو میں آپ کو بتانا چاہتا تھا۔"

"پھر بتایا کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔

"بس یونہی کہ اس کا نام سنتے ہی آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا اور میں کہتے کہتے رک جاتا تھا۔" اقتدار احمد نے کہا تو میں مسکرا کر رہ گئی۔

کتنا بودا سا جواز تھا کہ میرے چہرے کے رنگوں کی خاطر اس نے مجھے اس آفت کا نہیں بتایا تھا، جس نے مجھ پر تو قیامت ہی توڑ ڈالی تھی۔

ہم چپ رہے، ہم ہنس دیے
منظور تھا پردہ تیرا

میں بھی ہنس کر رہ گئی۔

"اچھا......اب مجھے اجازت۔" اقتدار احمد ایک دم ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مرضی ہے آپ کی۔" میں نے کہا۔ پہلے میں روکتی تھی، پر آج نہ روکا۔

"میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی......مگر اقتدار! آپ ......آئیں چاہے نہ آئیں لیکن میں آپ کا انتظار ضرور کروں گی، اپنے مخصوص وقت پر۔" میں نے اسے جتا دیا۔

اقتدار نے ایک لحظہ کو مجھے دیکھا اور پھر پلٹ گیا۔ آج حسب معمول اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر اور مسکرا کر اللہ حافظ بھی نہیں کہا تھا۔

اور جب دل بدلتے ہیں تو انداز بھی تو بدل جاتے ہیں نا۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہو ہی گیا تھا۔

اقتدار احمد کے جانے کے بعد میں نے گیٹ بند کیا اور اندر آ گئی۔ نانو سوئی ہوئی تھیں اور مائی وزیراں کچن میں شاید برتن دھو رہی تھیں۔ میرا دم بے تحاشا گھٹنے لگا تو میں اوپر ٹیرس پر آ گئی۔

ادھر سے گرمی کا حبس۔

اور پھر میرے اندر بھی تو ایسی ہی گرمی تھی، اتنا ہی حبس تھا کہ مجھے لگ رہا تھا، جیسے میرے حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔ تاحدِ نظر اُڑتی ہوئی گرم ریت نظر آ رہی تھی، جو میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

ریلنگ پر سر ٹکا کر میں نے ڈھیر سارے آنسو بہا ڈالے۔

"ہائے اقتدار احمد! تم نے مجھے اتنا بے وقوف بنایا۔ تم جو میرے کزن تھے، تم سے میرا مستقبل وابستہ تھا۔ اگرچہ باقاعدہ اس بات کا اعلان نہیں ہوا تھا، لیکن نانو سے تم نے بات کر لی تھی اور نانو نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے والدین جو امریکہ میں تھے، آئیں گے تو ہمیں ایک بندھن میں باندھ دیا جائے گا۔ لیکن تم ایک طرف مجھ سے اظہار محبت کرتے رہے اور دوسری طرف ثمینہ بیگم سے محبت کی پینگیں بڑھاتے رہے۔

ابھی صرف ایک ہفتہ قبل ہی جب میں نے کہا تھا، "اقتدار! مجھے اپنا اعتبار واپس دے دیں۔"

میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اس نے اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"لو......اپنا اعتماد۔"

میں ہنس دی تھی اور ہاتھ تھام لیا تھا۔

کتنی محبت تھی اُس کے لہجے میں۔ میری خوشی کی تو انتہا ہی نہ رہی تھی۔ اور پھر اس کے صرف تین روز بعد ہی میرے اعتبار کی دھجیاں بکھر گئیں۔ مجھے لگا تھا، جیسے میں عرش سے فرش پر آ گئی ہوں۔

میں تو بالکل ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

بکھر گئی تھی۔

ریزہ ریزہ سمیٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اقتدار احمد میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا، جسے میں نے پہلی بار دیکھا تو حیران رہ گئی تھی۔ میرے آئیڈیل کے عین مطابق۔ بارعب اور چوڑے شانوں والا اقتدار احمد، میرے دل کے تاروں کو ہولے سے چھو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی کی چمک دیکھ لی تھی۔ اور وہ عورت کتنی خوش قسمت ہوتی ہے، جو جسے چاہے وہ بھی اسے چاہتا ہو۔ اقتدار احمد سے میری ملاقات طاہر بھائی کے ہاں ہوئی تھی۔

طاہر بھائی میرے ماموں زاد ہوتے تھے، البتہ ان کی بیگم نجمہ کو تو میں بہت بری لگتی تھی۔

اقتدار احمد پولیس میں ایس۔ پی تھے۔ ان دنوں ان کی پوسٹنگ ہمارے ہی شہر میں تھی۔

اقتدار احمد سے ہماری بھی رشتہ داری ہوتی تھی۔ وہ میرا ننھیالی رشتہ دار تھا۔

میں نے اقتدار احمد کو گھر آنے کی آفر بھی کر دی تھی اور اس نے کہا تھا۔

"جس روز بھی وقت ملا، میں ضرور آؤں گا۔"

میں نانو کے ساتھ رہتی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے ابا اور امی میں بن نہ سکی۔ میں بھی ان دونوں کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی اور انہوں نے آپس کا بندھن توڑ ڈالا۔ ابا میاں نے اپنی پسند سے دوسری شادی کر لی۔ وہ پنڈی میں تھے۔ جب کہ امی کی بھی دوسری شادی کر دی گئی اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کوئٹہ میں رہتی ہیں۔ میں نانو کے حصے میں آئی۔ صرف تین سال کی عمر ہی سے نانو نے مجھے اپنی ذمہ داری بنا لیا۔ میری ہر خواہش کا احترام نانو نے کیا۔ نانو میرے لئے بیک وقت ماں، باپ اور دوست بھی رہی ہیں۔ میں نے جو کہا، انہوں نے مانا۔ تبھی تو میں امی اور ابا کے پاس نہ رہی۔

امی بہت کہتی تھیں، میں ان کے پاس آ کر رہوں مگر میں کبھی نہ گئی کہ وہاں کبھی بھی ایڈجسٹ نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے گریجویشن لاہور سے کیا۔ اور اب گزرے ڈھائی برس سے فارغ ہی تھی۔ میرے تین ماموں ہیں اور تینوں ہی بہت پیار کرنے والے۔ ایک

مظہر ماما تو ان دنوں کویت میں ہوتے ہیں بمعہ اپنے بچوں کے۔ اطہر ماموں کراچی میں بزنس کرتے ہیں۔ جبکہ فخر ماموں اسی شہر میں رہنے کے باوجود ہمارے ساتھ نہیں رہتے کہ ان کی بیگم اپنے میکے والوں کے ساتھ رہنا پسند کرتی تھیں۔ اسی لئے فخر ماموں نے اپنے سسرال والوں کے ساتھ ہی کوٹھی بنوالی اور بوڑھی ماں کو دو ملازموں کے آسرے پر تنہا چھوڑ دیا۔ مگر میں نے نانو کو نہیں چھوڑا....... بے شک ہم بڑے سے گھر میں اکیلی ہیں، مگر بہت خوش ہیں۔

ہاں، تو میں بتا رہی تھی کہ اقتدار احمد کو میں نے گھر آنے کا کہا تو ایک روز وہ طاہر بھائی کے ساتھ چلا آیا۔ مجھے جو خوشی ہوئی، وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

پھر تو اقتدار احمد کی جھجک نکل گئی۔ وہ اکثر آ جاتا۔ اور آخر ایک روز اس نے نہایت ہی شریفانہ طریقے سے زندگی کے سفر میں ساتھی بنانے کی خواہش کی تھی۔ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا کہ وہ تو اب کہہ رہا تھا اور مجھے تو اس سے اوّل روز سے محبت ہو گئی تھی۔

ہاں....... محبت اسی کا نام ہے کہ ہر وقت کوئی شخص ذہن میں گونجے۔

دھڑکنوں میں بولے۔

اس نے نانو سے بھی بات کر لی تھی۔ نانو کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ اس رشتے پر راضی تھیں۔

اور پھر اقتدار احمد بلا جھجک روز ہی شام کو میرے گھر آ جاتا، گھنٹوں مجھ سے خوب صورت باتیں کرتا۔ اس کا لفظ لفظ میری محبت میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ وہ بار بار مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا۔

''آپ نے پہلے کبھی محبت نہیں کی، اقتدار؟''

''نہیں.......'' اس نے سر کو نفی جنبش دی۔

''آپ کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں آئی۔ پتہ نہیں، آپ نے مجھے کیا کر دیا ہے، میں آپ سے محبت تو نہیں کرتا۔''

''پھر کیا کرتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''عشق....... ہاں، ایسا عشق، جس میں اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ بالکل نکما کر کے رکھ دیا ہے۔'' اور میں تو خوشی سے کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

اور جب میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گئی، حسب معمول (کہ وہ کہتا....... تم مجھے باہر نکال کر آؤ اور میں گیٹ تک جاتی۔ پھر وہ کار اسٹارٹ کرتا، میری آنکھوں میں دیکھ کر اللہ حافظ کہتا، پھر ایکسیلیٹر دبا دیتا)

اور اُس روز بھی جب وہ کار میں بیٹھا، اگنیشن میں چابی گھمائی تو کار میں لگا ٹیپ ریکارڈ چل پڑا۔ مغنیہ گا رہی تھی۔

مست ملنگ چا کیتا ای
ڈھاڈا دل تنگ چا کیتا ای

اقتدار احمد نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور میں نے جلدی سے گیٹ بند کر دیا کہ ایک دم ہی مجھے ڈھیر ساری شرم آ گئی تھی۔

نانو بہت جہاندیدہ عورت تھیں۔ وہ معاملہ جان گئیں۔ مجھے سمجھانا چاہا تو اقتدار احمد نے انہیں مطمئن کر دیا۔

نانو نے پھر اقتدار احمد کے آنے پر کوئی پابندی نہ لگائی۔ البتہ جب ہمارے ہاں مہمان آ جاتے تو پھر وہ نہ آتا۔ اور مجھے مہمانوں پر غصہ آتا کہ وہ کیوں آئے ہیں؟ یا پھر خود کو کوستی کہ فون کر کے اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔ آ جاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔

میری خوشی کی خاطر اقتدار احمد روز ہی شام ڈھلے میرے ہاں آ جاتا۔ ہم ملکی حالات پر، سیاست پر، موویز پر بحث کرتے اور وقت گزرنے کا پتہ نہ چلتا۔

میں شام ڈھلتے ہی اس کا انتظار شروع کر دیتی، بالکل اس طرح، جیسے کوئی پتی ورتا قسم کی عورت اپنے شوہر کا انتظار کرتی ہے۔ اور ایک روز میں نے اقتدار سے کہا بھی تھا۔

''آپ کو پتہ ہے، میں آپ کا ایسے انتظار کرتی ہوں، جیسے کوئی بیوی شوہر کا۔''

''اور آپ کو بھی پتہ ہے، میں جب آتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میں اپنی پیاری بیوی کے پاس جا رہا ہوں۔'' حد درجہ وارفتگی سے اس نے مجھے کہا اور میں سر جھکا کر رہ گئی۔

اقتدار احمد کبھی اپنے گاؤں چلا جاتا تو اس کی جدائی مجھے پریشان کر دیتی۔ مگر میں اسے منع بھی تو نہ کر سکتی تھی کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے نہ ملے۔

میں جو بہت سوشل تھی، اقتدار احمد سے محبت کرنے کے بعد میں نے اپنی ساری ایکٹیوٹیز ختم کر دی تھیں۔ مجھے اس کے خیالوں میں رہنا اچھا لگتا تھا۔

اقتدار احمد مجھے بتائے بغیر کبھی بھی تو غائب نہ ہوتا تھا۔ اور اس روز وہ نہ آیا تو میں نے برآمدے کے چکر لگا لگا کر اپنے پیر تھکا لئے۔ وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا۔

"خدا خیر کرے۔" میں بار بار دل پر ہاتھ رکھ لیتی۔

ان دنوں شہر میں ہنگامے بھی ہو رہے تھے اور مجھے اقتدار کی فکر لگی رہتی تھی۔ فون بھی ڈیڈ پڑا تھا۔

نانو بار بار کہتیں۔

"بھئی، وہ بچہ تو نہیں، آجائے گا۔"

اب میں نانو کو کیا بتاتی۔ ان کے دل کو لگی ہوئی ہوتی تو پتہ ہوتا۔ میں چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ سڑک پر آتے ہی مجھے رکشہ مل گیا۔ میں نے چوک پر ایک میڈیکل ہال پر رکشے والے کو روکا اور کہا۔

"سنو، مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

"اچھا جی۔" رکشے والے نے سر ہلایا۔

ہاسٹل کا نمبر میں نے ملایا۔ (بیچلر ہونے کی وجہ سے اقتدار ہاسٹل ہی میں رہتا تھا) اس کے ملازم خلیل نے فون اٹینڈ کیا۔

"صاحب تو جی شام سے گئے ہیں، وہاڑی۔ کچھ بندے آگئے تھے ان کے ساتھ۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کال کے پیسے دے کر میں واپس رکشے میں بیٹھ گئی۔

"اسے موقع نہ ملا ہوگا، اطلاع دے کر جاتا۔ ورنہ پہلے تو وہ مجھے بتا کر جاتا تھا۔"

میں گھر آئی تو صرف دس منٹ بعد ہی اقتدار آگیا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"پاگل ہوئی ہے؟" اقتدار احمد نے میرے آنسو اپنے پوروں سے چن لئے۔

"ساڑھے نو بج گئے ہیں۔ پتہ ہے، انتظار کی صلیب کتنی کٹھن ہوتی ہے؟ آپ نے انتظار کیا ہو تو پتہ ہو۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

مائی وزیراں نے اسے تفصیل بتا دی کہ میں ٹیلی فون کرنے چلی گئی تھی۔

"آپ کو جانے کی کیا ضرورت تھی؟" وزیراں چائے لینے چلی گئی تو اس نے کہا۔

"آپ آئے جو نہ تھے۔" میں بولی تو وہ ہنس دیا۔

"دیکھیں نور! آئندہ آپ گھر سے مجھے تلاشتی ہوئی نہیں نکلیں گی۔" اقتدار کا لہجہ سخت بھی تھا اور محبت سے بھرپور بھی۔

"کیوں؟" میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"سمجھا کریں۔ رات کے وقت رکشے پر جانا کوئی تک ہے؟"

"گاڑی ڈرائیو کرنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔" میں نے بتایا۔

"خیر، یہ میں بتا دوں کہ میں جہاں سے بھی لوٹوں گا، چاہے رات کے دو بج جائیں، میں آپ کو اطلاع دے کر جاؤں گا۔ آپ گھر میں رہیں گی۔ آئندہ بے وقوفی معاف نہیں کروں گا۔" اقتدار احمد نے میرے ہی دوپٹے سے میرے چہرے سے آنسوؤں کو صاف کیا۔

"پگلی ہیں بس۔" اسے مجھ پر پیار آتا تو "پگلی" ہی کہتا تھا۔ اور واقعی میں پگلی ہی تو تھی نا۔ اس کے عشق میں پاگل۔

پھر اس روز کے بعد اقتدار نے خود بھی احتیاط کرنی شروع کر دی تھی۔ کچھ بھی ہوتا، وہ وقتِ مقررہ پر آجاتا۔ اور کہیں جانا ہوتا تو مجھے بتا دیتا۔

اور میری محبت کو شاید میری ہی نظر لگ گئی تھی۔ میری دوست تابندہ کہتی (جو میری واحد رازداں تھی)

"نور!......اسے اتنا چاہ کر تم نے سر پر چڑھا لیا ہے۔"

"اس نے بھی مجھے بہت چاہا ہے۔" میں اٹھلا کر کہتی۔

اور پھر مجھے طاہر بھائی کے ذریعے ہی پتہ چلا کہ ان کے گھر ثمینہ بیگم آنے لگی ہے۔

ثمینہ بیگم میری ممانی کی فرسٹ کزن کی بیٹی ہوتی تھی اور میں اسے بہت قریب سے جانتی تھی۔ اس کی ماں نے اس کی شادی ایک بہت بڑے زمیندار سے کر دی تھی، جس کی جوان اولادیں تھیں اور وہ اللہ یار ڈوگر کی پانچویں بیوی نہایت خوشی سے بن گئی۔ اللہ یار ڈوگر کی عمر اسی سال سے کم نہ تھی۔ اللہ یار ڈوگر اُسے بے حد چاہتا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اچھا پہننا اور اوڑھنا اسے نصیب تھا۔ پھر خدا نے اسے دو بچے بھی دے دیئے تھے۔ اور ثمینہ کا پاؤں اس گھر میں مضبوطی سے جم گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ کچھ بھی کرتی رہتی، اللہ یار ڈوگر میں سکت نہ تھی کہ وہ اسے منع کرتا۔ سب کو اس سے ہمدردی تھی۔

اور بھائی طالب حسن بھی ایسے مردوں میں تھے، جنہیں اس سے ہمدردی رہی تھی۔ واقعی اس کی بے جوڑ شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ مگر جب انہیں پتہ چلا کہ ان کے علاوہ بھی ثمینہ بیگم مختلف دوستیاں نبھا رہی ہیں تو انہوں نے کسی کے کہنے پر بھی اعتبار نہ کیا، مگر جب خود آنکھوں سے دیکھا تو یقین کیا اور پھر بھی شاید یہ ان کی محبت تھی کہ انہوں نے ثمینہ کو ہر طریقے سے سمجھایا۔ مار پیٹ بھی کی، مگر وہ جن

راستوں پر چل رہی تھی، واپس نہ لوٹ سکتی تھی۔

اللہ یار ڈوگر کی بڑی اولاد بھی نالاں تھی اور اس کے بیٹے، باپ سے شکوہ کرتے کہ بیوی کو لگام دے۔ ظاہر ہے کہ چاند چڑھتا ہے تو سب دیکھتے ہیں۔ اور وہ بوڑھا شخص صرف اسے سمجھاتا۔ مگر ثمینہ بیگم سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ سنا گیا تھا کہ اللہ یار ڈوگر نے اپنے بیٹوں کے مجبور کرنے پر اسے دو بار طلاق بھی دے دی تھی، پھر عدت اور حلالہ کے بعد اسے گھر میں رکھا تھا کہ آمنہ اور آفتاب کو تو ماں کی ضرورت تھی۔

میں بھی ایک بار اس کے ہاں گئی تھی، مگر وہ مجھے اسی روز اچھی نہ لگی تھی کہ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ سکینہ ممانی اور رضیہ باجی بھی ساتھ ہی تھیں اور ہم اس سے ملنے گئے تھے۔ ان دنوں میں بی۔اے کر رہی تھی۔ اس کے ہاں اور بھی مہمان آئے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ بڑے کمرے میں سب ہی موجود تھے۔ سکینہ ممانی تو اس سے نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھیں، مجھے نیند آنے لگی تو میں وہیں چارپائی پر سو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر میں سوئی رہی۔ تب شور کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔

اللہ یار ڈوگر نے تو شور ڈالا ہوا تھا۔

میں نے ممانی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں....... چپ رہو۔" ممانی سکینہ نے مجھے جھڑک دیا۔

"پھر یہ فساد، ہنگامہ؟" میں جاننا چاہتی تھی۔

"مجھے بہر صورت دس ہزار چاہئیں۔" اللہ یار ڈوگر چلا رہا تھا۔

"تُو جتنے پیسے لایا تھا، لے گیا ہے۔ تیری اولاد میں سے کسی نے رکھ لئے ہوں گے۔" ثمینہ نے نہایت بدتمیزی سے اللہ یار ڈوگر کو جھڑک دیا۔

اور پھر وہ بکتا جھکتا چلا گیا۔

"اوئے فریدا!" ثمینہ نے اپنے ملازم کو آواز دی اور ننگے پاؤں فرید جھاڑن اٹھائے آ گیا۔

"ایہہ لے۔ ایہہ ٹیچی کیس میں رکھ دے۔" ثمینہ نے گریبان میں سے نوٹوں کی گڈی نکال کر ملازم کو دی۔ سکینہ ممانی اور رضیہ باجی مسکرا رہی تھیں۔

اور مجھے لگا، جیسے چوری کا الزام میرے سر آ گیا ہو۔

"اینویں تو بہت دنوں بعد دیتا۔ اب کہے گا بیٹوں کو۔" اپنی کامیابی پر وہ بہت خوش

تھی۔

اور اس معاملے کی تفصیل یہ تھی کہ اللہ یار ڈوگر کو باغ کی آمدنی ایک لاکھ روپے ملے تو وہ خوشی خوشی ثمینہ کے پاس لے آیا۔ چارپائی پر جہاں وہ بیٹھی تھی، اس نے نوٹ بکھیر دیئے اور اسے پتہ بھی نہ چلا، ثمینہ نے دس ہزار پار کر لئے۔ پھر وہ اسی طرح سمیٹ کر بغیر گنے لے گیا۔ جب منشی نے گنے تو دس ہزار کم تھے۔ وہ واپس آیا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ براہِ راست اس نے ثمینہ پر الزام تو نہ لگایا کہ اتنی جرأت نہ تھی۔ مگر وہ بار بار ایک جملہ کہتا تھا۔

"یہ جو آئی ہوئی ہیں، ان سے پوچھ۔"

اور وہ کیا پوچھتی کسی سے کہ خود تو لیے بیٹھی تھی۔ جب کہ میں نے دیکھا ہی نہ تھا کہ کب وہ آیا اور کب اس نے ثمینہ کے سامنے نوٹ رکھے اور کب اس نے پار کئے۔

"مگر اسے نوٹ لانے کی ضرورت کیا تھی یہاں؟" میں نے زِچ ہو کر رضیہ باجی سے پوچھا۔

"بھئی ثمینہ کئی روز سے اسے کہہ رہی تھی، رقم چاہئے کہ مری جانا ہے اور وہ کہہ رہا تھا، ابھی نہیں ہے رقم کہ زمینداروں کی آمدنی تو گندم اور کپاس کے سیزن میں ہوتی ہے یا پھر باغوں کی آمدنی آتی ہے تو ان کی چاندی ہوتی ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ دیکھو اب رقم آئی ہے تو دوں گا۔"

"اور انہوں نے پہلے ہی دس ہزار پار کر لئے۔" میں نے کہا۔

"ان بڈھوں سے رقم نکالنا کوئی آسان کام ہے؟" رضیہ باجی ہنس کر بولیں اور میں خاموش سی انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

مگر مجھے دکھ ضرور ہوا تھا کہ میری موجودگی میں یہ بات ہوئی، پہلی بار میں آئی اور اللہ یار ڈوگر بھلا کیا سوچتے ہوں گے۔ ممانی سکینہ اور رضیہ باجی کے لئے تو یہ نئی بات نہ تھی، مگر میرے لئے شرم کا مقام تھا۔ میں نے نانو کو بتایا تو وہ صرف اتنا بولیں۔

"بیٹا! ایسی عورتیں کبھی قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں، جو گھر کے مرد سے چوری کریں۔"

اور پھر یونہی وقت گزر گیا اور ایک روز اللہ یار ڈوگر کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اٹھارہ برس کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ثمینہ بیگم آزاد تھی، مزید آزاد ہو گئی۔

اللہ یار کی موت کے بعد عدت کا انتظار کئے بغیر اس نے اپنے ایک رشتہ دار سے شادی کر لی۔ رشید اختر پولیس میں حوالدار تھا۔

اور رشید اختر نے اس سے شادی ہی اس لالچ میں کی تھی کہ چار کنال کی کوٹھی ثمینہ کے نام ہے۔ مگر ایسا تو نہ تھا۔ اللہ یار ڈوگر جیسا کائیاں آدمی، جس نے دنیا میں ایک صدی گزاری تھی، وہ بھلا ثمینہ بیگم پر یہ التفات کر سکتا تھا؟ اس نے تو ایک مرلہ بھی اس کے نام نہ کیا تھا۔ شاید اگر وہ شریفانہ طرز زندگی اختیار کرتی تو وہ اسے کچھ نہ کچھ دے جاتا۔ بیٹی اور بیٹے کے نام البتہ اس نے جائیداد کی تھی۔ وہ بھی انہیں ان کے بالغ ہونے پر ملنی تھی، جو ابھی بالترتیب پندرہ اور سترہ برس کے تھے۔ ابتدا میں تو ثمینہ نے رشید اختر سے اپنے نکاح کو چھپا رکھا، لیکن آخر کار اللہ یار ڈوگر کے بیٹوں کو پتہ چل گیا اور ایک روز انہوں نے اسے گھر سے بے دخل کر دیا۔ آمنہ اور آفتاب کو لے کر چلے گئے۔ اور ثمینہ بیگم اپنے نئے شوہر نامدار کے ساتھ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ کچھ ماہ بعد پھر وہ تذکروں میں آنے لگی۔

سنا یہ گیا کہ رشید اختر اسے اپنے گاؤں چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔

ایک تو رشید اختر، ثمینہ سے یوں نالاں تھا کہ نکاح سے پہلے وہ یہی بتا رہی تھی کہ چار کنال کوٹھی اس کے نام ہے مگر یہ عقدہ تو بعد میں کھلا تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ ثمینہ بیگم کی جو کشش تھی، وہ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ رشید اختر لالچی آدمی تھا، وہ چاہتا تھا کہ زیور، پیسہ لائے۔ ثمینہ کی بیٹی آمنہ اس کی مدد کرتی بھی تھی، مگر لالچی کا پیٹ تو کبھی نہیں بھرتا۔ رشید اختر کو پتہ تھا کہ طالب حسن سے اس کی دوستی رہی ہے۔ طالب حسن کی اپنی آئل مل تھی اور کاٹن کا بزنس تھا۔ ثمینہ سے علیحدگی کے بعد اس نے اپنے کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ رشید اختر کے کہنے پر ثمینہ نے پھر طالب حسن سے رابطہ قائم کیا۔ کہ

''میں نے جو تمہیں اچھے وقتوں میں پینتیس ہزار روپے دیئے تھے، اب واپس کر دو۔''

ثبوت تو کوئی نہ تھا، ثمینہ کے پاس۔ بس یہ ثبوت تھا کہ اس کی دوستی تھی۔

ثمینہ اور رشید اختر نے بہت چاہا کہ طالب حسن انہیں رقم دے دے مگر اس نے نہ دی۔ تب رشید اختر نے وہی پولیس والوں والی چال چلی اور طالب حسن کے خلاف تھانے میں رپٹ درج کرا دی۔ طالب حسن کو تھانے طلب کیا گیا۔ اور ظاہر ہے، ایس۔ ایچ۔ او نے تفتیش کی تو طالب حسن کے خلاف ثمینہ کوئی ثبوت نہ دے سکی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ پھر بھی وہ اور رشید اختر باز نہ آئے اور رشید اختر نے اپنے ایک دوست سے مل ملا کر شہر کے دوسرے تھانے میں طالب حسن کے خلاف درخواست دے دی۔ طالب حسن نے پھر یہ معاملہ نمٹا لیا۔

ثمینہ بیگم اور رشید اختر نے Try again کے مصداق ڈی۔ ایس۔ پی (لیگل) کو درخواست دی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے دونوں تھانوں سے رپورٹ طلب کی تو ان کا ایک ہی موقف تھا۔

''ثمینہ بیگم ایک آوارہ اور بدچلن عورت ہے۔ وہ شریف مردوں کو بلیک میل کر کے ان کی شہرت خراب کرنا چاہتی ہے۔''

یہ رپورٹ ڈی۔ ایس۔ پی کے حوالے کر دی گئی۔ جب ڈی۔ ایس۔ پی نے شنوائی نہ کی تو ایس۔ ایس۔ پی کو ثمینہ نے درخواست دی اور وہاں سے بھی اس کے خلاف فیصلہ ہوا تو ثمینہ نے سیشن کورٹ میں اللہ یار ڈوگر کی بیوہ بن کر مقدمہ دائر کیا تھا اور یہ موقف اختیار کیا تھا کہ طالب حسن اس کے مرحوم شوہر اللہ یار ڈوگر کا دوست تھا اور آئل مل میں اس کا شیئر تھا۔ طالب حسن کو اس کے مرحوم شوہر نے ایک لاکھ روپے دیئے تھے، جس کا منافع وہ چند ماہ تک چار ہزار روپے دیتا رہا اور مرحوم شوہر کی وفات کے بعد اس نے یہ رقم دینی بند کر دی اور اب اصل رقم بھی نہیں دیتا۔

سیشن کورٹ میں مقدمہ چلا اور جلد ہی خارج ہو گیا۔ آخر ثمینہ کو بھی جنون چڑھ گیا۔ اس نے ہائی کورٹ میں رٹ کر دی۔ ان دنوں وہ ماہ بننے والی تھی۔ بڑی سی چادر میں خود کو چھپا کر وہ کورٹ جایا کرتی تھی۔ ہر تاریخ پر حاضر ہوتی، مقدمے میں جان بھی نہ تھی اور جھوٹ پر مبنی مقدمہ کس طرح چل سکتا تھا۔ صرف دس ماہ بعد ہی مقدمے کا فیصلہ طالب حسن کے حق میں ہو گیا اور ثمینہ بیگم کو عدالت نے فراڈ قرار دیا۔ تب کہیں جا کر طالب حسن کا پیچھا چھوٹا۔

یہ تفصیل مجھے طالب حسن نے بتائی تھی کہ نانو کا وہ بیٹا بنا ہوا تھا اور مجھے بالکل بہنوں کی طرح سمجھتا تھا۔ طاہر بھائی سے بھی اس کی دوستی تھی۔ پھر ثمینہ کا بیٹا پیدا ہوا۔ سب کا خیال تھا کہ اب سدھر جائے گی۔ مگر ایسا تو نہ ہوا تھا۔ بھلا پرانی عادات کب ختم ہوتی ہیں۔ اس کا وہی انداز تھا۔ شوہر سے لڑ جھگڑ کر ماں کے پاس آ جاتی اور بچے کو ماں کے پاس چھوڑ کر اپنی دلچسپیوں میں مصروف رہتی۔ اور ثمینہ بیگم کے بارے میں، میں نے اتنا کچھ سنا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اقتدار احمد اس کی جھلک بھی دیکھے۔

مگر ایسا ہو کر رہا۔ مظہر ماموں بمعہ اپنی فیملی کے چھٹیاں گزارنے کویت سے آئے تو امی بھی کوئٹہ سے آ گئیں۔ گھر میں اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں اقتدار احمد نے میرے ہاں آنا ختم تو نہ کیا، البتہ کم ضرور کر دیا۔

اب وہ اکثر طاہر بھائی کے ہاں جانے لگا تھا۔ امی اور مظہر ماموں کی وجہ سے طاہر بھائی روز شام کو ہمارے گھر آ جاتے۔ کبھی کبھی اقتدار احمد بھی ان کے ساتھ آ جاتا۔ بقول اس کے، نورا! اب میں آپ کو دیکھنے آتا ہوں۔ کب نہ جانے آپ کے ماموں کی چھٹیاں ختم ہوں گی اور جائیں گے۔

میں سوچتی، یہی تو میری بھی سوچ ہے۔ انہی دنوں طاہر بھائی نے مجھے بتایا۔

''آج کل ثمینہ ہمارے ہاں آتی ہے۔'' (ثمینہ رشتے میں اس کی خالہ زاد تو لگتی تھی، مگر وہ اس کا نام لیتا تھا) مجھے لگا، جیسے خطرے کی بے شمار گھنٹیاں میرے اندر بج اُٹھی ہوں۔

''اقتدار کو اس بلا سے بچانا۔''

''نورا! جب سے آپ مجھے ملی ہیں نا، میرا کسی عورت کی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ چاہے وہ کتنی ہی حسین ہو۔''

میرے ذہن میں اس کا محبت آمیز جملہ گونجا اور میں مطمئن ہو گئی۔

طاہر بھائی کی بیوی نجمہ بھابی تو یوں بھی میری مخالفت کرتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ طاہر بھائی مجھ پر توجہ دیتے تھے۔ مجھے بالکل بہنوں کی طرح چاہتے تھے۔ اور کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر کسی اور پر توجہ دے۔ میں ان کے لئے ''اور'' ہی تو تھی نا۔ اور انہوں نے ثمینہ سے اقتدار احمد کی دوستی کروا دی۔

اقتدار احمد اب بھی میرے گھر آتا، مگر کم کم اور تھوڑی سی دیر کے لئے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی ڈیوٹی بھگتاتا تھا۔ مگر اب اس کا رویّہ بدلنے لگا تھا۔

اُس کے انداز میں تبدیلی آئی اور میرے اندر کی عورت نے تو سسکنا شروع کر دیا۔

میں اپنی محبت کے چراغ کی لَو تیز آندھیوں میں بچانے کی اپنی سی کوشش میں لگ گئی۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی اور عورت آ گئی ہے۔

وہ طاہر بھائی جو اقتدار احمد کے کردار کی گواہی میں قسم کھانے کو تیار تھے، اب کہتے تھے۔

''اب میں قسم نہیں کھا سکتا۔''

میرے دل میں تو پنکھے لگ گئے۔ میں خوف کی سرحد کے قریب تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے اقتدار کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

اقتدار احمد کی وہ وارفتگی اور محبت کی شدت ہی معدوم ہو گئی تھی۔ مظہر ماموں اور امی

چلے گئے تھے۔ اب تو لائن پہلے کی طرح کلیئر ہی تھی، مگر اقتدار تھوڑی سی دیر کے لئے آتا۔ میں روکتی رہ جاتی مگر وہ کام کا بہانہ کر کے کھسک لیتا۔ یوں جاتا، جیسے گائے رسہ تڑوا لے۔

میرے ہاتھ خالی رہ جاتے۔ ایک تابندہ ہی تو تھی، جس کے کندھے پر میں سر رکھ کر ڈھیر سارے آنسو بہا لیتی اور وہ مجھے سمجھاتی۔

''مردوں سے زیادہ جھوٹی قوم کوئی نہیں۔ پتہ نہیں، تُو نے اعتبار کیوں کر لیا اقتدار پر۔''

''اپنی محبت پر بھلا کون اعتبار نہیں کرتا؟''

''لعنت ہے، اس محبت پر۔ تُو بھی رویّہ بدل لے، جس طرح اُس نے بدلا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اگر میں نے کھو دیا اُسے تو؟'' مجھے خدشے گھیر لیتے۔

''بعد کے رونے سے بہتر ہے کہ ابھی رو لو۔ ایسے بے اعتبار شخص کا کیا بھروسہ۔ آج نہیں تو کل اسے کھو دو گی۔ ابھی سے بھولنے کی ریہرسل کر لو۔ یار! دنیا ایک ہی منزل پر تو بس نہیں ہے نا۔'' تابندہ نے مجھے سمجھایا۔

''نہیں تابندہ! میں سمجھتی ہوں، اقتدار احمد میری منزل ہے، اس سے آگے مجھے صرف اور صرف دیوار نظر آتی ہے۔''

''میرا مشورہ مانو تو بھول جاؤ اسے۔ آئے تو جی بسم اللہ، نہ آئے تو بھاگو مت پیچھے اس کے۔'' مشورہ تو معقول تھا۔ مگر میں کیا کرتی۔

''کیسے بھولوں؟'' میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''دیکھو، جب کسی کو بھولنا ہو نا تو اس کی برائیاں یاد کر لیا کرو۔ خود ہی نفرت ہو جاتی ہے۔'' تابندہ نے کہا۔

''میری یادوں کی پٹاری میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جسے اقتدار احمد کی برائی سے تشبیہ دی جائے۔''

''یہ برائی کیا کم ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے اس نے ایک اور جگہ دوستی کر لی ہے۔'' تابندہ غرّائی۔

''میں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا نا۔'' میں نے پھر اپنی محبت کو سہارا دیا۔

''سنا تو ہے نا اور جانم! کوئی بات ہوتی ہے تو افسانہ بنتا ہے۔ ایسے تو نہیں بنتا۔''

"یار تابندہ! تُو میری حالت سے واقف نہیں ہے۔ میں اب واقعی اُسے بھولنا چاہتی ہوں، مگر نہیں بھول پا رہی۔ وہ سامنے آتا ہے تو میں پانی ہو جاتی ہوں۔ سارے شکوے بھول جاتی ہوں۔" میں نے مجبوری بتائی۔

"میں تجھے بی بی جی سے چینی پڑھوا دیتی ہوں، تم وہ صبح شام کھاؤ۔ یقین کرو کہ تمہیں خیال ہی نہیں آئے گا۔ آزمودہ نسخہ ہے، میں نے اشرف کو بھلانے کے لئے یہی کیا تھا اور دیکھو بھلا، اب اتنے عرصے میں مجھے کبھی وہ یاد آیا ہے؟" وہ نہایت فخر سے کہہ رہی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں یادوں کی نمی اُتر آئی تھی۔ میں نے نظریں چرا لیں۔ مبادا وہ شرمندہ نہ ہو جائے۔

اشرف سے تابندہ کا تقریباً تین سال افیئر چلا تھا، مگر پھر وہ والدین کے مجبور کرنے پر اپنی خالہ زاد رخسانہ کا ہو گیا، جو پینڈو سی لڑکی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ پھر تابندہ اور اشرف کبھی ایک دوسرے سے نہ ملے تھے۔ چھوڑے ہوئے راستوں پر چلنا تو بہادری نہیں ہے نا۔ اشرف سے بچھڑنے کے بعد ہی تو تابندہ نے ایل ایل بی کیا تھا اور وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ سرو قد اور لمبے بالوں والی تابندہ میں بڑی اٹریکشن تھی۔ ہمارے کتنے ہی کلاس فیلو اس پر فدا تھے اور وہ اپنے آپ میں مگن رہتی اور کہتی۔

"مردوں سے بڑھ کر جھوٹی قوم اور کوئی نہیں ہے۔ بہت دعوے کرتے ہیں محبتوں کے، ایثار کے، خلوص و سچائی کے۔ ان دعوؤں کے جال میں وہ عورت کو جکڑ لیتے ہیں اور پھر جب تعلق توڑنا ہو تو مجبوریوں کی ایک داستان سنا کر قطع تعلق کرتے ہوئے ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔ دنیا کی بے اعتبار قوم مرد ہے۔"

تابندہ نے ایسی ٹھوکر کھائی تھی کہ وہ اپنا اعتبار گنوا بیٹھی تھی۔ لاء کرنے کے بعد پریکٹس کر رہی تھی، جبکہ میں گھر میں بیٹھی تھی۔ بس، دلچسپی کا سامان صرف اور صرف اقتدار احمد کی محبت تھی، جو اب آہستہ آہستہ مجھ سے چھن رہی تھی۔

"چڑھتی ندیاں اسی طرح اُترتی ہیں، نور فاطمہ!" تابندہ مجھے سوئیاں چبھو رہی تھی۔

"اقتدار احمد کی محبت بھی ایسی ہی ندی تھی، جو اُتر رہی ہے۔ آنسو مت بہاؤ، نور! اس چیز کے لئے آنسو بہانے سے فائدہ جو تمہارے لئے آنسو نہ بہا سکے۔"

تابندہ کی بات معقول تھی مگر میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ میں تو اپنا پور پور، اقتدار احمد کی محبت میں ڈبوئے بیٹھی تھی۔ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

اُس روز شام کو جب اقتدار احمد آیا تو میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں، پوچھیں۔"

"آپ طاہر بھائی کے ہاں جاتے ہیں؟"

"ہاں۔" اقتدار احمد نے کہا۔

"میں چاہتی ہوں، آپ وہاں نہ جایا کریں۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ میری خواہش ہے۔" میں نے نہایت نرمی سے کہا۔

"مگر وجہ بھی تو ہو گی۔" اقتدار احمد جاننا چاہتا تھا۔

"آج کل آپ کا نام ثمینہ بیگم کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔"

"کون ثمینہ......؟" اقتدار احمد کے چہرے پر پُراسرار ہنسی پھیل گئی، جیسے کہ وہ انجان بن رہا ہو۔

"آپ نہیں جانتے؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نہیں تو۔" چہرہ اس کا اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"آپ نے دیکھا بھی نہیں؟"

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"پھر آپ کے ساتھ نام کیوں لیا جا رہا ہے اس کا؟" میں نے کہا۔

"کس نے لیا ہے نام؟" اقتدار احمد نے پوچھا۔

"جہاں آپ جاتے ہیں، انہوں نے ہی بتایا ہے۔ اور کون بتائے گا؟" میں نے نہایت سچائی سے بتا دیا کہ طاہر بھائی نے بتایا ہے۔

"نور! ایک بات یاد رکھیں کہ لوگ جلتے ہیں ہماری دوستی سے۔ طاہر کی بیوی آپ کی مخالف ہے۔ آپ کے ماموں کی فیملی سے بھی آپ کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں، طاہر چاہتا ہے کہ ہم لوگ آپس میں لڑ پڑیں۔" اس نے مجھے طاہر بھائی کے خلاف بہکایا۔

"طاہر بھائی ایسا کیوں چاہیں گے؟"

"بس، سمجھا کریں نا۔"

"پھر بھی۔" میں جاننا چاہتی تھی۔

"جن کی بہنیں ہوتی ہیں، وہ اچھے رشتوں پر نظر رکھتی ہیں۔ آئی سمجھ؟"

اقتدار احمد نے لفظوں کے جال میں مجھے ایسا اُلجھایا کہ مجھے بس اُسی کی بات یاد رہی۔ باقی تو میں سب کچھ بھول گئی۔

مگر باتیں تو روز ہی ہوتی تھیں۔ اقتدار احمد کو میں نے خود طاہر بھائی کے ہاں آتے جاتے دیکھا تھا اور وہ دن میری زندگی کا سیاہ ترین دن تھا، جب خاندان کی شادی کی تقریب میں رضیہ باجی نے مجھے اقتدار احمد اور ثمینہ بیگم کے تعلق کے بارے میں بتایا تھا۔ بات کچھ یوں تھی کہ طاہر بھائی اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ الگ رہتے تھے۔ اور عید کے روز طارق بھائی کی بیوی پروین جیٹھانی سے ملنے ان کے گھر گئی اور پروین نے ثمینہ اور اقتدار احمد کو باتیں کرتے دیکھا تھا اور مجھے اقتدار کہہ گیا تھا کہ وہ عید پر گاؤں جا رہا ہے۔ میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ مگر رضیہ باجی کا کہا جھوٹ نہیں ہوسکتا تھا۔

میرے ذہن کی پھرکی گھومی کہ اقتدار تو عید کے دوسرے روز شام کو میرے گھر آیا تھا اور بتا رہا تھا کہ عید پر میں اسے بہت یاد آئی۔ یا خدا! یہ کیا اسرار ہے؟

شادی کے فنکشن میں بھی میرا دل نہ لگا اور میں نانو سے ضد کر کے گھر آ گئی۔ اتفاق ہے کہ اقتدار بھی تھوڑی دیر بعد آ گیا۔

"اقتدار!....... مجھے سچ سچ بتائیں آپ کہ آپ نے ثمینہ کو نہیں دیکھا؟" میں پھٹ ہی تو پڑی۔

"نہیں دیکھا بھئی۔" وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

"میری قسم کھا کر کہیں۔"

"کیا عورتوں کی طرح مجھ سے قسمیں اُٹھوا رہی ہیں۔" اقتدار نے تڑخ کر کہا۔

"میں بھی عورت ہوں، جس کی محبت کے آپ دعویدار ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے آپ سے محبت ہے نور! اور ہم نے جب محبت کی تھی تو قسمیں قرآن نہیں اٹھائے تھے۔" اقتدار احمد نے ترشی سے کہا۔

"یہ تو کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے سچ بولیں گے۔"

"اچھا، آپ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیں کہ آپ نے ثمینہ کو نہیں دیکھا۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"یہ بھی ایک طرح کی قسم ہی ہوتی ہے۔" اقتدار احمد نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور میں اسے دیکھے گئی تھی کہ پہلے تو مجھے اس نے کسی بات کا اعتبار دلانا ہوتا تھا تو فوراً میرے ہاتھ

پر ہاتھ رکھ کر وہ بات کہہ دیتا تھا اور آج کتنا بدلا ہوا تھا۔

تو جھوٹ بولتے ہوئے انسان یونہی مٹھیاں بھینچتا ہے۔

"اقتدار احمد! میری بات آپ یاد رکھ لیں کہ اس عورت کے ساتھ آپ کا نام آ رہا ہے نا۔ آپ بے حد خوار ہوں گے۔"

"ہر بات جھوٹ ہے نور! آپ یقین کریں میرا۔" وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

"کرتی ہوں یقین۔" میں دکھ سے مسکرا دی۔ "اس کے باوجود بھی کہ اب طاہر بھائی آپ کے کردار کی بابت قسم نہیں کھاتے، پھر بھی میں یقین کرتی ہوں، اقتدار! کہ مجھے میری محبت مجبور کرتی ہے، آپ پر اعتبار کرنے کے لئے۔ آپ نے ایک بری عورت کو مجھ پر ترجیح دی ہے نا۔"

"پھر وہی بکواس۔ میں یہاں پر سکون کے لئے آتا ہوں۔ اور آپ کے پاس صرف یہی ایک موضوع ہے۔" اقتدار احمد نے تنک کر کہا اور دندناتا ہوا چلا گیا۔ میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ آنسو تھے کہ میری آنکھوں سے بہتے چلے گئے۔ یعنی وہ ثمینہ کو میرا "بری عورت" کہنا برداشت ہی نہ کرسکا تھا۔

دو روز اسی طرح گزر گئے۔ اقتدار احمد نے پھر مجھے آ کر منا لیا تھا اور میں محبت کی ماری اس سے راضی ہو گئی تھی۔

"کیا خبر، طاہر بھائی اور رضیہ باجی جھوٹ ہی بولتے ہوں۔" میں نے دلیلوں سے خود کو تسلی دی۔

⊛......⊛......⊛

وہ کیوں نہ رُوٹھتا، میں نے بھی تو خطا کی تھی
بہت خیال رکھا تھا، بہت ہی وفا کی تھی

ہاں، شاید میری غلطی ہی تھی کہ اقتدار احمد مجھ سے دُور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور میں اس دوری کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

میں چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے شکوہ کرے، جو اس کے دل میں ہے، مجھ سے کہے کہ اس کا تلخ رویّہ، اس کی بدلی ہوئی نظریں مجھے سنگسار کرتیں۔ مجھے اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔ اس محبت نے مجھے بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔ نانو کے خوف سے میں کھانا بھی زہر مار کرتی، مگر میرے حلق میں نوالے اٹکتے رہتے۔ راتوں کو جاگنے سے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہو گئے تھے اور ہر وقت میری آنکھوں کی سطح گیلی رہنے لگی تھی۔

اُس روز چھٹی کا دن تھا، باہر کڑکتی دھوپ تھی اور میں اندر اپنے کمرے میں تکیوں میں چہرہ چھپائے صرف اقتدار احمد کے رویتے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بے اختیار ہی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور میں نہ جانے کب تک روتی رہتی کہ مخصوص ہارن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اقتدار احمد دن کے وقت بہت کم آتا تھا۔ اکثر چھٹی کے روز جب فرصت ملتی تو آ جاتا تھا۔ شاید میری پریشانی نے اسے بھی بے چین رکھا ہوا تھا۔ نانو کے پاس بھائی طالب حسن بیٹھے تھے۔

مائی وزیراں کے ہمراہ وہ میرے ہی کمرے میں آ گیا۔

"آج اس وقت؟"

"کیا نہیں آنا چاہئے تھا؟" وہ میرے بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے؟"

"دیکھیں نورا! یہ کمرہ، یہ گھر میرا ہے۔ میں یہاں جب چاہوں، جس وقت بھی چاہوں، آ سکتا ہوں۔" لہجہ ویسا ہی پتھر تھا۔

"بے شک۔ میں نے کب انکار کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور میں چاہتا ہوں، تمہاری نانو کے منہ بولے بیٹے نہ آئیں۔ طالب حسن یا الطاف وغیرہ۔"

"نانو کا دل بہلا رہتا ہے اور......"

"بس، میں پسند نہیں کرتا۔" اقتدار نے میری بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے، میں منع کر دوں گی۔" میں کسی مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"مجھے پانی پلائیں۔" اقتدار نے کہا تو میں جلدی سے اس کے لئے پانی لے آئی۔

گلاس اسے تھما کر میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"اقتدار! آپ میرا جرم تو بتائیں۔"

"کیا بتاؤں؟" وہ یونہی اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔

"مجھے بتائیں، آپ کیوں بدل گئے ہیں؟"

"میں اتنی دھوپ میں آیا ہوں، آپ سے ملنے، آپ کو دیکھنے، پھر بھی نورا! آپ کہتی ہیں، میں بدلا ہوا ہوں۔ میں نہیں بدلا۔ وہم ہے آپ کا۔ میں روز تو آتا ہوں، آپ کے پاس۔"

"یہ وہم نہیں ہے میرا۔ بخدا، اگر آپ مجھ سے دور ہونا چاہتے ہیں، قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں تو کہہ دیں۔ میں آپ کے راستے کی دیوار نہیں بنوں گی۔ پلیز اقتدار! مجھے برچھیاں مت ماریں۔" میں نے اقتدار احمد کے گھٹنے پر سر رکھ دیا اور میری آنکھوں سے ساون بھادوں برس گئے۔ مگر کتنی حیرت انگیز بات تھی کہ میں ہچکیوں سے روتی رہی اور اقتدار احمد نے مجھے چپ بھی نہ کرایا۔

پہلے کبھی میں رو پڑتی تھی تو کہتا تھا۔

"نورا! آپ رویا نہ کریں، میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ میں آپ کے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔"

اور آج میری آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ اقتدار احمد کے دل کو کچھ نہ ہوا تھا۔ اس نے مجھے اتنا بھی نہ کہا تھا کہ میں نہ روؤں۔ بلکہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں جا رہا ہوں۔"

میں کچھ بول ہی نہ سکی اور برستی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

اور وہ چلا گیا۔

مجھے یاد تھا کہ سردیوں میں جب میں ٹھنڈ لگ جانے کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھی تو اقتدار اپنے ڈرائیور کے ہاتھ میرے لئے فروٹ بھیجتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے فون کرتا اور شام کو حسبِ معمول گھر آ جاتا۔ محبت سے میرا سر تک دباتا رہتا اور میں شرمندہ بھی ہوتی، خوش بھی۔ بھلا اتنی محبت پا کر کون کافر خوش نہیں ہوتا۔

سچ کہتے ہیں کہ جب دل بدلتے ہیں تو انداز اور چہرے بھی بدل جاتے ہیں۔ اور اقتدار احمد کا دل بھی مجھ سے بدل گیا تھا۔ اب اس کے دل میں، میں نہیں، کوئی "اور" رہ رہی تھی۔ اور میں پسِ پشت چلی گئی تھی۔

اتفاق تھا کہ تابندہ اسی وقت آ گئی۔

"یہ ایس پی صاحب بڑی تیزی سے کار چلاتے جا رہے تھے۔ خیر تو تھی، کیا لڑ کر گئے ہیں؟" تابندہ نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی بغیر سلام دعا کئے یہ سوال داغا۔

"کہیں جلدی پہنچنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اتنی دھوپ میں؟"

"عشق میں دھوپ چھاؤں نہیں دیکھی جاتی۔" میں دکھ سے مسکرا بھی نہ سکی تھی۔

تابندہ کو دیکھ کر تو میرا جی چاہ رہا تھا، میں اس کے گلے لگ کر خوب روؤں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

"تجھے میں سمجھا چکی ہوں کہ تُو قطع تعلق کر لے اُس سے۔ ورنہ تُو تو رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔" وہ میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"میں نے اس سے کہا ہے، اگر وہ قطع تعلق کرنا چاہتا ہے تو کر لے۔" میں نے تابندہ سے کہا۔

"انتہائی بے وقوف ہے تُو۔ وہ تجھے رُلاتا رہے، تڑپاتا رہے، پھر بھی تُو اسے کہتی ہے، وہ تعلق توڑ لے۔ بھئی تُو کہہ دے کہ میں تم سے تعلق توڑتی ہوں۔" تابندہ نے بے نیازی سے کہا۔

"میں کہہ دوں؟" مارے حیرت کے میری آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔

"ہاں کہو اُسے کہ میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔"

"وہ پوچھے گا کیوں؟"

"صاف سی بات ہے۔ کہو میں بے اعتباریوں کے موسم میں نہیں جی سکتی۔ اور یوں بھی نورا! جب کسی پر اعتماد نہ رہے نا تو اُس کے ساتھ نہیں چلنا چاہئے۔ اس نے تمہارا اعتماد مجروح کیا ہے۔ تم خود سوچو، ایسے شخص کا کیا اعتبار کہ آگے چل کر تمہیں پھر دُکھ کی دلدل میں اتار دے۔ پھر تم اذیت برداشت کرو۔ بس اتنی ہی اذیت کافی ہے کہ وہ تم سے بچھڑ جائے۔" تابندہ مجھے سمجھا رہی تھی۔

"تم چاہتی ہو کہ اشرف اور تم نہیں ملے تو کوئی بھی نہ ملے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"بخدا، میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا۔ میں نے تو ابتدا ہی میں یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا کہ اشرف میرا مقدر نہ تھا اور پھر شاید میرے جذبوں ہی میں کمی تھی، جو وہ اپنے والدین کے فیصلے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میری خاطر وہ لڑ بھی نہ سکا۔ کیا میری اتنی اہمیت نہ تھی۔ اس کے نزدیک ایک بار تو میرے لئے لڑ سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنی بات نہ منوائی۔ پھر ایسا شخص میری محبت کا حق دار ہو سکتا ہے؟ نہیں........ کبھی نہیں۔" تابندہ کا لہجہ پتھریلا تھا۔ مجھے وہ کبھی بھی یاد نہیں آتا کہ بزدل مرد میری پسند نہیں۔"

"پھر تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟" میں نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"میں انتظار میں ہوں، اُس مرد کے، جو واقعی بہادر ہو۔ جسے دیکھ کر چھپر کا احساس

ہو۔ اور میں ضرور کروں گی شادی، مگر وہ مرد جو میرے دل کو نہیں، ذہن کو بھائے گا۔"

تابندہ کے پاس معقول جواب تھا۔ وہ مجھے پھر سمجھا رہی تھی۔

"اب تو اقتدار احمد کے سامنے رونا دھونا بالکل نہیں تھا بلکہ بہت ہی بہادری سے اسے کہہ دینا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔" تابندہ نے مجھے سمجھایا۔

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں پتہ تو چل جائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیا ارادے ہیں اس کے۔" اور تابندہ کی بات میری عقل میں آ گئی۔

اور پھر خلاف توقع اقتدار احمد شام کو آ گیا۔ ورنہ جس روز وہ دن کو آتا تھا، دوبارہ شام کو نہیں آتا تھا۔ سہ پہر کو مجھے رُلا کر جانے والا اب خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔

"کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ تابندہ کے کہنے پر خود کو بہت مضبوط ثابت کر رہی تھی۔ حالانکہ یہ بات تو نہ تھی۔ اقتدار احمد سامنے تھا اور میں تو اسے دیکھتے ہی موم ہو گئی تھی۔ مگر میں سر جھکائے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟........ خاموشی کیوں ہے بھلا؟"

"کہاں ہے خاموشی؟"

"ہم دونوں کے درمیان۔"

"بات ہی کوئی نہیں۔"

"پہلے تو آپ کبھی اتنی خاموش نہیں رہیں، نورا! کیا بات ہے؟" اقتدار احمد کا لہجہ وہی پرانا تھا، نرم اور محبت سے بھرپور۔ میری آنکھوں میں رُکے آنسو ساون کی بوندوں کی طرح ٹپ ٹپ بہہ نکلے۔

"پھر رونا؟"

"میں رو تو نہیں رہی۔"

"اچھا!" اقتدار مسکرایا۔ "مان لیتا ہوں کہ رو نہیں رہیں۔"

"میں کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"کہیں۔" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"میں........ میں مزید آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔" میں نے ایک دم ہی کہہ دیا۔

"آپ نہیں چل سکتیں؟" اقتدار احمد خان کا انداز پوچھنے والا تھا۔

"جی......" میں اب بھی ڈٹی ہوئی تھی۔

"مگر میں چلاؤں گا آپ کو اپنے ساتھ۔ مار مار کے چلاؤں گا۔ آئی سمجھ؟ اور دیکھوں گا کہ آپ کیسے میرے ساتھ نہیں چلتیں۔"

"مجھے...... مجھے آپ خود سے محبت کرنے کی سزا دے رہے ہیں؟" میں نے بھیگے لہجے میں پوچھا۔

"نور! آپ کیوں غلط بات سوچتی ہیں؟ میں صرف آپ کا ہوں، آپ یقین کریں۔ دوسروں کی باتوں میں آ کر بھی بھلا کوئی اپنی محبت سے دستبردار ہوتا ہے؟ آپ طاہر کی باتوں میں آ کر کیوں مجھ سے لڑتی ہیں؟ آپ کو پتہ نہیں، وہ ہمیں لڑوانا چاہتے ہیں تا کہ ہم ایک دوسرے سے متنفر ہو کر ایک دوسرے کو چھوڑ دیں۔ پہلے وہ اور اس کی بیوی میرے پیچھے لگے رہے کہ نور کو چھوڑ دو۔ وہ بہت اچھی سی لڑکی سے میری شادی کروانا چاہتے ہیں، بقول ان کے۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ میں نور کو صرف مرنے کے بعد ہی چھوڑ سکتا ہوں۔ ورنہ جب تک میرے اختیار میں ہے، میں اس سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے نجمہ بھابی کی ہر بات کے جواب میں یہی کہا ہے۔"

"جب وہ میری اتنی مخالف ہیں تو آپ ان کے گھر کیوں جاتے ہیں؟" میں سلگ کر بولی۔

"بھئی، آپ کی امی اور ماموں آئے ہوئے تھے۔ آخر میں نے کہیں تو وقت گزارنا تھا۔ طاہر میرا اچھا دوست ہے۔ بس اس کے ہاں تاش وغیرہ کھیل لیتا ہوں، وقت پاس ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی میں نہیں آ سکتا تھا۔"

"چلیں، پہلے تو امی اور ماموں تھے، اب تو آپ آ سکتے ہیں۔ طاہر بھائی کے ہاں جانا ضروری ہے؟"

"میں نہیں جاؤں وہاں؟" اقتدار احمد نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر طاہر بھی یہاں نہ آئے۔" وہ بولا۔

"وہ...... وہ میرا ماموں زاد ہے۔" میں نے اسے بتانا چاہا۔

"کچھ بھی ہے، وہ یہاں نہ آئے تو میں بھی اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔" اقتدار احمد کی شرط کڑی تھی۔

"میں اسے کیسے روکوں؟" میں نے کہا۔

"اس گھر کو میں اپنا گھر سمجھتا ہوں، نور فاطمہ! اور اگر میں اُس کے گھر نہیں جاؤں گا تو وہ بھی یہاں نہیں آئے گا۔" اقتدار احمد کا لہجہ حتمی تھا۔

"ٹھیک ہے، میں طاہر بھائی کو منع کر دوں گی۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ایک لحظہ کو اقتدار احمد نے مجھے حیرت سے دیکھا، مگر کہا کچھ نہیں۔ میں اس کے بہلاوے میں پھر آ گئی تھی۔ اور پھر دوسرے روز جب طاہر بھائی آئے تو میں نے انتہائی بدتمیزی سے انہیں کہہ دیا۔

"آپ آئندہ یہاں نہ آیا کریں۔"

"کیوں؟" طاہر بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

"طاہر بھائی! آپ کی ماں اور بیوی مجھے پسند نہیں کرتیں۔ میرے خلاف اقتدار احمد کو بھرتی ہیں۔ تو بہتر ہے، آپ نہ آیا کریں یہاں۔" میں نے سچائی سے کہا۔

"تم مجھے روک دو، سب کو روک دو، پھر بھی وہ میری بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لکھوا لو تم مجھ سے۔" طاہر بھائی نے کہا۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ ثمینہ بیگم سے میری بیوی کی زبردست دوستی ہے۔ اور ثمینہ، اقتدار احمد کی دوست ہے۔ وہ کبھی بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ تم خوامخواہ اس کی خاطر مجھ سے لڑ رہی ہو۔ اُس کی وجہ سے تم نے ہر ایک کو گھر آنے سے روک دیا ہے۔ طالب حسن، داؤد سے کس قدر محبت کرتا تھا۔ مگر اب اقتدار احمد اسے پسند نہیں کرتا تو تم نے اسے آنے سے منع کر دیا ہے۔"

"طالب حسن مجھے بھی پسند نہیں۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"تمہیں یقین ہے، اقتدار احمد تمہاری اتنی قربانیوں کے بعد بھی تم سے وفا کرے گا؟" طاہر بھائی پوچھ رہے تھے۔

"تجھے پتہ ہے کہ ثمینہ کے کہنے پر اس نے ایک چپڑاسی اور ڈرائیور بھی رکھوایا ہے؟" طاہر بھائی نے اطلاع دی۔

"ایسا نہیں ہے۔ اس نے ثمینہ کو دیکھا بھی تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو اُس کی بجائی ہوئی ڈفلی پر سر دُھنتی رہ۔" طاہر بھائی تمسخر سے بولے۔

"بس، آپ آئندہ نہ آیا کریں۔" میں نے پھر وہی بات کر دی اور طاہر بھائی

خاموشی سے مجھے بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ میرا دل دُکھا ضرور، مگر میں نے انہیں نہ روکا کہ مجھے ان سے زیادہ اقتدار احمد کی محبت عزیز تھی۔

⊛......⊛......⊛

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی ایک بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

ہاں....... اقتدار احمد میں یہی بات تو اچھی تھی۔ کہیں بھی سفر پر جاتا تو واپس جب شہر میں آتا تو پہلے میرے ہاں آتا۔ بقول اُس کے کہ آپ کو دیکھ کر ساری تھکن اُتر جاتی ہے۔

اُس روز بھی جب شام کے سائے ڈھل چکے تھے تو وہ آ گیا۔ رات اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی سرکاری کام کے سلسلے میں ساہیوال جا رہا ہے اور واپسی نجانے کب ہو۔ مگر واپسی تو ہو گئی تھی۔ اور اب وہ میرے سامنے صوفے پر نہایت ایزی ہو کر بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میں نے سرور کو آج گاڑی ڈرائیو نہیں کرنے دی۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بس، میں جلد از جلد آپ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ پتہ ہے، ایک سوتیں، ایک سو چالیس کی اسپیڈ سے آیا ہوں۔"

"اتنی تیز گاڑی چلانے کی کوئی تک تھی؟"

"یار! اب نو بجے ایک میٹنگ ہے۔ اگر اتنی تیز گاڑی نہ چلاتا تو پھر یہاں نہیں آ سکتا تھا۔ اور یہاں حاضری بے حد ضروری تھی۔"

اس کی یہی باتیں تو تھیں، جو میرے اندر روشنیاں بھر دیتی تھیں اور میرا پورا وجود محبت کی دودھیا روشنی میں نہا جاتا۔

"لیٹ جائیں، بہت تھکے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اُتر گئی ساری تھکن۔" اقتدار احمد نے میری طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پاؤں میز پر رکھ دیئے۔

مسلسل چار گھنٹوں کی ڈرائیو کی وجہ سے اس کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ اقتدار احمد نے صوفے کی ٹیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اُس کے روم روم سے تھکن ٹپک رہی تھی۔

میں جلدی سے گرم پانی میں نمک ڈال کر لے آئی۔ بڑے تسلے میں پانی انڈیلا، اقتدار احمد کے پاؤں اس میں رکھ دیئے۔

"یہ کیا؟" اقتدار نے پوچھا۔

"اس طرح گرم نمکین پانی میں پاؤں ڈبوئے رہیں، سوجن بھی اُتر جائے گی اور تھکن بھی۔" میں نے بتایا۔

"سوجن اُتار دیں۔ تھکن تو اُتر گئی۔" اس نے میری ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے پاؤں دھونے لگی۔ پھر انہیں تولیے سے خشک کیا اور یہ سب کرنا مجھے بے حد ہی اچھا لگا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا، جیسے یہ میرا فرض ہو۔

"طاہر تو نہیں آیا؟" اقتدار نے پوچھا

"میں نے انہیں منع کر دیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اور وہ منع ہو گیا؟" بے یقینی، اقتدار احمد کے لہجے سے عیاں تھی۔

"آپ اعتبار کریں۔"

"چلیں، آپ کہتی ہیں تو اعتبار کر لیتا ہوں۔ اور کوئی نئی تازی؟"

"ہاں، یاد آیا۔" میں نے کہنا چاہا، پھر ایک دم ہی رک گئی۔

"کیا یاد آیا تھا؟ کہیں، رک کیوں گئیں؟"

"اس بار آپ عید پر گاؤں نہیں گئے تھے؟"

"گیا تھا........ کیوں؟"

"مجھے پتہ چلا ہے کہ عید کے روز آپ طاہر بھائی کے ہاں تھے اور........"

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

"پوری بات کریں۔" اقتدار احمد اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"رضیہ باجی ملی تھیں مجھے، ایک شادی کی تقریب میں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ پروین بھابی نے بھی وہاں آپ کو دیکھا تھا، ثمینہ بھی وہاں موجود تھی اور........"

"اب یہ نیا ہتھکنڈا ہے، مجھے بدنام کرنے کا۔" اقتدار احمد نے کہا۔

"اگر آپ بدنام ہوتے ہیں تو پھر وہاں کیوں جاتے ہیں؟ میں نے آپ کو منع بھی کیا ہے۔"

"اچھا! پروین کا یہ دعویٰ ہے نا کہ اس نے مجھے ثمینہ کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں دس بندوں میں کھڑا ہو جاتا ہوں، وہ مجھے پہچان لے تو میں سارے قصور مان لوں گا، بس۔"

اقتدار احمد نے اتنے اعتماد سے یہ بات کہی تھی کہ مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔

"پھر رضیہ باجی کو پروین بھابی نے جھوٹ کہا ہوگا۔"

"دیکھو، میرا اور تمہارا تعلق کہاں تک پھیل گیا ہے۔" اقتدار نے کہا۔

"آپ نہ ان کے گھر جاتے، نہ یہ بات ہوتی۔"

"یقین کرو، میں نے تو ثمینہ کو دیکھا ہی نہیں۔ لیکن اب میں دیکھنا چاہتا ہوں، کیسی ہے وہ۔"

"جیسی ہوتی ہیں، چلتر باز عورتیں۔" میں نے تنک کر کہا۔ "البتہ قد اس کا بہت خوب صورت ہے۔" میں تو وہ تھی، جو دشمن کی تعریف کرتے ہوئے بھی بخل سے کام نہ لیتی تھی۔

"خوب صورت قد کیسا ہوتا ہے.......؟" اقتدار کے چہرے پر وہی پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سرو قد، جو متناسب جسم کے ساتھ ہو۔" میں نے کہا تو اقتدار احمد نے سگریٹ سلگانے کے لئے ماچس جلائی اور میں نے صاف محسوس کرلیا کہ وہ مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اسے دیکھے گئی۔ سگریٹ سلگا کر تیلی اس نے ایش ٹرے میں ڈالی اور بولا۔

"لمبا قد، خوب صورتی کی نشانی ہے؟"

"اُس پر جو لوگ مرتے ہیں، شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

مگر میرے دل میں ایک ایسی پھانس چبھ گئی تھی، جو نکل نہیں رہی تھی، مگر تکلیف بے حد پہنچا رہی تھی۔ آخر اقتدار تسلیم کیوں نہیں کرتا۔

اور پھر صرف چار روز گزرے تھے کہ جب شام ڈھل رہی تھی تو رضیہ باجی آ گئیں۔ ان کے ساتھ پروین بھابی بھی تھیں۔ پروین بھابی نے نہایت اشتعال انگیز طریقے سے مجھے اقتدار اور ثمینہ کے قہقہوں اور نوک جھوک کے بارے میں بتایا۔ میں آنسو پیتی رہی۔ میرے دل کی حالت تو بہت غیر تھی۔ میں نے ان سے تو یہ کہہ دیا۔

اقتدار کہیں بھی پھرتا رہے، کسی کے ساتھ بھی ہنسے بولے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

پھر وہ جانے لگیں تو میں نے کہا کہ میں انہیں گھر چھوڑ دوں گی، انہیں گھر چھوڑ کر میں نے سوزکی اپنے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ مین روڈ سے میں ذیلی سڑک پر آئی تو

اقتدار احمد کی پولیس جیپ بھی میرے آگے آگے تھی۔ میں نے جان لیا کہ وہ میرے گھر ہی جا رہی ہے۔ نہایت آہستہ روی سے میں اس کے پیچھے چلتی آئی۔ گھر کے گیٹ پر ہم نے آگے پیچھے گاڑیاں روکی تھیں۔

"ہوں.......تو میرا پیچھا ہو رہا تھا۔" وہ گاڑی لاک کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے پیچھا کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ اتفاقاً راستہ ایک ہی تھا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اندر چلی آئی۔ اقتدار احمد بھی اندر آ گیا۔

"کہاں سے آ رہی ہیں؟" وہ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"میں نے کبھی آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"پوچھیں۔" بہت خوشگوار موڈ تھا اس کا۔

"مجھے کیا حق ہے؟"

"آپ کو پتہ ہے، نور! کہ آپ کو سارے حق حاصل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ مجھ سے اس پتھریلے لہجے میں بات نہ کرتیں۔" اقتدار احمد کا لہجہ آج خلاف توقع کچھ نرم تھا۔ "مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، مگر میں نے کسی بھی بات پر یقین نہیں کیا، حتیٰ کہ آپ سے پوچھا بھی نہیں۔"

"تو پوچھیں آپ مجھ سے، جو بات آپ کے ذہن میں ہے۔" میں نے تنک کر کہا۔

"دیکھیں نور! میں آپ کو بہت چاہتا ہوں، بے حد احترام کرتا ہوں میں آپ کا اور میری زبان نہیں کھلتی۔"

"مجھے بتائیں آپ کہ بات کیا ہے؟" میرے تو دل میں پنکھے لگ گئے تھے۔ اور وحشت زدہ سی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔

"میں نہیں کہہ سکتا۔" وہ بولا۔

"اقتدار! آپ کے دل میں میری طرف سے شک آ گیا ہے نا، آپ اس شک کو باہر نکال دیں۔ بخدا، مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ مجھے اس الزام کی صفائی کا موقع تو دیں نا، جو مجھ پر عائد کیا گیا ہے۔"

"تنویر بٹ کو آپ جانتی ہیں نا؟" اقتدار احمد نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، جانتی ہوں۔" میں نے بے دھڑک کہا۔

"اس کے ساتھ آپ کا کیا تعلق تھا؟"

’’جو ایک کلاس فیلو کا دوسرے کلاس فیلو سے ہوتا ہے۔‘‘
’’آپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟‘‘ لہجہ شک سے بھرپور تھا۔
’’کیسی دلچسپی؟ آپ کھل کر بات کریں۔‘‘
’’ویسی، جو میرے ساتھ ہے۔‘‘
’’اقتدار! آپ........آپ ایسا سوچ سکتے ہیں؟‘‘ میں نے ترشی سے کہا۔
’’میں تو نہیں سوچ سکتا، مگر مجھے تو بتایا گیا ہے کہ آپ اُس کے ساتھ گھومتی رہی ہیں، اس کے ساتھ شاپنگ کرتی رہی ہیں اور........اور ثمینہ کے گھر اس سے ملتی رہی ہیں۔‘‘
اقتدار احمد ایک ایک کر کے میرے جرائم کی فہرست بتا رہا تھا اور میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو گیا تھا۔ میرے دماغ کی رگیں تن گئیں، مگر میں نے ان رگوں کو ٹوٹنے نہ دیا اور نہایت تحمل سے کہا۔
’’اقتدار! آپ بتائیں، آپ کے ساتھ میں کتنا گھومی پھری ہوں، شہر میں؟ کہ آپ کو ہر پل، ہر ساعت یہ خوف رہتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ جبکہ میرا پورا خاندان اور برادری یہاں ہے۔ مجھے بھی یہی خوف رہتا ہے۔ رہی تنویر بٹ کے ساتھ شاپنگ کی بات تو کوئی یہ ثابت کر دے، میں نے اس کے ساتھ ایک رومال بھی خریدا ہو تو ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔ جب میں اس کے ساتھ گئی ہی نہیں تو خریدنا تو دور کی بات ہے۔ رہی ثمینہ بیگم کے گھر ملنے کی بات تو اوّل تو میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنے عاشق سے اپنے ہی کسی رشتہ دار کے گھر میں ملوں، وہ بھی ثمینہ جیسی کرپٹ عورت کے گھر۔‘‘
’’وہ تو کہتی ہے۔‘‘ اقتدار احمد نے کہا۔
’’یہ بات وہ میرے سامنے کرے نا۔ آپ سے کیوں کہتی ہے؟‘‘
’’نجمہ بھابی سے کہا ہے۔ مجھے تو ملی ہی نہیں۔‘‘ اقتدار نے پھر اپنا دفاع کیا۔
’’مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ آپ کو کس نے کہا ہے۔ مگر اتنا تو ہے کہ آپ جھوٹ سچ کی پہچان تو کر سکتے ہیں نا؟ میں وہ لڑکی ہوں اقتدار! کہ جو جس راستے پر ایک بار آگے بڑھے نا تو پھر وہ پلٹ آنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ میں اپنے پیر کاٹ سکتی ہوں، پر واپس نہیں مُڑ سکتی۔ اگر میں تنویر بٹ کو چاہتی تو مجھے کون روک سکتا تھا؟ میں خود مختار تھی اور اب بھی ہوں۔‘‘
’’میں نے تو سنا ہے کہ شادی کا سلسلہ بھی چلا تھا۔‘‘ اقتدار نے کہا تو میں ہنس دی۔
’’تنویر بٹ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا، جب وہ لاء کالج میں آیا۔ آپ تنویر کو

بلا کر بات کر لیں کہ وہ مجھے کیا سمجھتا اور کہتا ہے۔ اس کی بیوی مجھے اور تابندہ کو اپنی نند کہہ کر متعارف کرواتی ہے۔ تنویر کے بچے ہمیں پھپھو کہتے ہیں۔ اور اقتدار! میں کچھ کروں یا نہ کروں، رشتوں کی پاسداری ضرور کرتی ہوں۔ اور جس سے جو رشتہ قائم کر لیا، خدا کے فضل سے اُس پر قائم رہتی ہوں۔‘‘
’’میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔‘‘
’’اپنا رویہ نہیں دیکھا؟‘‘
’’نور! دُکھ تو ہوتا ہی ہے نا۔ یقین کریں، جس روز مجھے آپ کے اور تنویر بٹ کے بارے میں بتایا گیا، شکر ہے میں پاگل نہیں ہو گیا۔ مجھے لگا تھا، جیسے کسی نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔‘‘ اقتدار احمد نے دکھ سے کہا۔
’’آپ نے مجھ سے اسی وقت کیوں نہ پوچھا؟‘‘
’’میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔ بارہا میں نے پوچھنا چاہا، مگر میری زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔‘‘
’’اور زبان تبھی لڑکھڑاتی ہے، اقتدار! جب ہمیں کسی بات پر یقین نہ ہو۔‘‘ میں نے کہا۔
’’آپ تو بے دریغ ہر بات داغ دیتی ہیں۔‘‘ اقتدار بولا۔
’’مجھے ثبوت دیئے جاتے ہیں، میرا دل مانتا ہے۔ اور پھر اقتدار میں دل میں بغض رکھ کر کسی سے نہیں مل سکتی۔ آپ جو میرا سب کچھ ہیں۔ بھلا میں دل میں کوئی بات رکھ کر آپ سے کیسے بات کروں؟ میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ بقول طاہر بھائی کے کہ میں تو آپ کو یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ دوپہر یا رات کو میں نے کھایا کیا تھا۔ اب تو آپ میری طرف سے مطمئن ہیں نا؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ہاں، میں نے تو اعتبار ہی نہیں کیا۔‘‘
’’آپ تنویر بٹ سے مل لیں۔‘‘ میں نے مشورہ دیا۔
’’کیوں؟‘‘ اقتدار احمد نے ابرو چڑھا کر مجھے دیکھا۔
’’تاکہ اس سے بھی آپ کو تصدیق ہو جائے۔‘‘
’’بے وقوفی کی باتیں مت کریں۔‘‘ اقتدار نے جھنجلا کر کہا۔ ’’اب میں اس سے پوچھنے جاؤں، مجھے آپ کی بات پر اعتبار ہے۔‘‘
’’اقتدار! میری زندگی میں آنے والے آپ پہلے مرد ہیں۔ یہ تو آپ کو اندازہ ہو

جانا چاہئے، بے شک میں تعلیم کی غرض سے ہاسٹلز میں رہی۔ گھر سے دُور رہنے کے باوجود میں نے کبھی نانو کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ جس قدر بھی میں خودمختار تھی، تقریبات میں شرکت میرا شوق تھا، دیگر ایکٹیوٹیز میں، میں شرکت کرتی تھی، میں تو بہت سوشل تھی، اُڑتا پنچھی۔ آپ کی محبت کے حصار میں آ کر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ یہ قید میں نے اپنی خوشی سے قبول کی ہے۔ کسی کا زور تو نہیں ہے، اقتدار! میں تو اب بازار بھی نہیں جاتی کہ کہیں کسی مرد کا کندھا مجھے نہ چھو جائے کہ یہ بھی آپ سے بے وفائی ہے۔ اور بعض پابندیاں اچھی لگتی ہیں، یہ کسی پر احسان نہیں ہے۔"

میں خود پر لگائی گئی اپنی ہی پابندیاں اسے بتا رہی تھی۔

"آپ کتنی اچھی ہیں، نور؟" اقتدار احمد نے بے اختیار ہی میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ بہت منفرد ہیں، بہت پیاری ہیں نور! آپ جیسا تو اس کائنات میں کوئی نہ ہوگا۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔"

"تبھی رسّہ تڑا گئے تھے۔"

"یار! میں کہاں گیا ہوں، یہیں تو ہوں۔"

"جانا تو چاہا نا؟" میں ہنی۔

"اگر جانا چاہتا تو مجھے کون روک سکتا تھا؟"

"شاید میری محبت میں اتنی طاقت ہے، کچھ بھی کہیں، اقتدار! آپ مجھ سے بدلے ضرور ہیں۔"

"ہاں، بدلا ہوں۔ اور اس کی وجہ ہے۔" آج اُس نے اپنا بدلنا تسلیم کر لیا تھا۔

"کیا......؟" میں نے پوچھا۔

"میں چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس لئے کہ آئندہ مہینے میں تین ماہ کے لئے ٹریننگ کے سلسلے میں سہالہ جا رہا ہوں۔" اس نے اطلاع دی۔

"اور سہالہ جانے سے نفرت کا کیا تعلق؟" میں نے کہا۔

"ہے تعلق۔" اقتدار احمد نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے، آپ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ مجھ بن رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں اور یہ تین ماہ کیسے گزاریں گی۔ اس لئے میں نے چاہا کہ کچھ دُوری ہو۔ میرے رویے کی وجہ سے آپ بددل ہو جائیں۔"

"اور آپ سے نفرت کرنے لگوں۔" میں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

"ہوں۔" اقتدار نے سر ہلایا۔

"فرض کریں، میں آپ سے نفرت کرنے لگتی......پھر؟"

"پھر ٹھیک تھا۔ میں بھی مطمئن رہتا کہ آپ میرے بغیر خوش رہ رہی ہیں۔ پھر میں آتا تو آپ کو منا لیتا۔"

"منا لیتے؟" میں ہنسی۔

"بالکل۔" وہ وثوق سے بولا۔

"نہیں اقتدار احمد! پھر منانا بہت مشکل ہوتا۔ میں اگر ایک بار آپ سے تعلق توڑ لوں نا تو پھر......پھر کبھی بھی وہ تعلق نہیں جوڑ سکتی۔ چاہے میں مر ہی کیوں نہ جاؤں۔"

"پیارے لوگ دعوے نہیں کرتے۔" اقتدار مسکرایا۔

"آزما کر دیکھ لیں۔" میرے لہجے کی مضبوطی نے اقتدار احمد کو خاموش کر دیا۔

"ایک بات کہوں؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ہوں......کہیں؟" اقتدار احمد نے کہا۔

"اقتدار احمد! آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں آپ سے نفرت کروں، کیونکہ کوئی بھی فرد یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس کا محبوب اس سے نفرت کرے۔ آپ کی بات میں نہیں مانتی۔ مگر یہ ضرور مانوں گی کہ اصل میں آپ مجھ سے نفرت کرنا چاہتے تھے، جو نہ ہو سکی تو آپ لوٹ آئے ہیں۔" میں نے نہایت وثوق سے کہا۔

"آپ کی ذہنی رو ٹھیک ہو جائے تو بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟" اقتدار احمد نے سر جھٹک کر کہا۔

"آپ یہ تسلیم کر لیں کہ آپ کا ثمینہ سے تعلق ہے تو میری ذہنی رو نہیں بھٹکے گی۔" میں پھر اپنی بات پر ڈٹ گئی۔

"یار! میں ایک غلط بات کیسے تسلیم کر لوں؟"

"پھر آپ طاہر بھائی کے ہاں کیوں جاتے ہیں؟ جبکہ میں نے انہیں منع کر دیا ہے۔"

"وہ میرا دوست ہے۔" اقتدار بولا۔

"ہو۔ مگر آپ آئندہ وہاں نہیں جائیں گے اور......اور اگر آپ وہاں گئے تو......"

میں کہتے کہتے رک گئی۔

"تو کیا؟" اقتدار احمد نے وارفتہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"میرے پاس نہیں آئیں گے۔"

"یہ فیصلہ ہے آپ کا؟"

"جی......اور بالکل اٹل فیصلہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گا۔" ایک دم ہی اس نے فیصلہ سنا دیا اور میرے قلب و ذہن پر چھائی کائی چھٹنے لگی۔

طاہر بھائی کہتے تھے، اقتدار میرے گھر آنا نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اب کس قدر آسانی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ وہاں نہیں جائے گا۔

"مگر ایک بار جاؤں گا ضرور۔" مجھے خوش فہمی کے چمن سے اس کی آواز نے نکالا۔

"وہ کیوں؟" میں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"بھئی اس کے بیٹے کی سالگرہ ہے اور عمر کی سالگرہ میں......"

"کوئی ضرورت نہیں ہے، سالگرہ میں جانے کی۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کے بغیر اس کی سالگرہ نہیں ہو سکتی کیا؟"

"یہ بری بات ہے۔ وہ سمجھے گا کہ میں گفٹ دینے کی وجہ سے نہیں آیا۔" اقتدار احمد نے مجھے سمجھانا چاہا۔

"آپ گفٹ کسی کے ہاتھ بھیج دیجئے گا، مگر وہاں نہیں جائیں گے۔ اگر گئے تو دیکھ لیں، بہت بڑی سزا دوں گی۔"

"اچھا چلو، اُس روز صبح چلا جاؤں گا اور کہہ آؤں گا کہ میں نہیں آ سکتا۔"

"یہ بھی نہیں ہوگا۔ بس اُس روز آپ میرے پاس ہوں گے۔ نانو نے جانا ہے، اپنی بھانجی کے ہاں۔ صغریٰ خالہ بیمار ہیں نا تو اس لئے۔ آپ میرے ہاں آ جایئے گا۔"

"چلو، صبح کام ہیں ایک دو، وہ نمٹا کر میں تین بجے تک آ جاؤں گا۔ اور جب تک آپ کہیں گی، میں رہوں گا۔" وہ ایک دم ہی مان گیا۔

"یہ نہ ہو کہ آپ صبح وہاں ہو لیں۔"

"شک نہ کیا کریں۔ جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا کروں گا۔ اب نہیں سن پائیں گی کہ میں وہاں گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں مطمئن ہو گئی کہ اقتدار احمد نے کچھ اس انداز سے مطمئن کیا تھا کہ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔

⊛......⊛......⊛

چھٹی کا دن تھا۔ نانو تو سویرے سویرے ہی طارق بھائی کے ساتھ دین پور چلی گئی تھیں۔ میرے پاس مائی وزیراں تھی اور میں آس و نراش کے چکر میں اُلجھی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں، اقتدار احمد آتا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے اسے خود ہی یہ اجازت دی تھی کہ وہ صبح میں کام نمٹا کر آ جائے۔ اور وہ وعدے کا پابند، اپنا اعتبار قائم رکھنے کے لئے کڑکتی سہ پہر میں تین بجے آ موجود ہوا۔ رکشے سے اُتر کر وہ اندر آیا۔

"رکشے پر آئے ہیں......گاڑی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی نے مانگی تھی، سرور ڈرائیور لے گیا ہے۔ ویسے سرور شام کو آئے گا۔ مجھے یہ بتائیں کہ میری کال کوٹھری کہاں ہے؟ سخت نیند آ رہی ہے مجھے، میں سوؤں گا۔"

"آپ میرے کمرے میں سو جائیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی، سزا جو ہوئی۔" اقتدار احمد نے مسکرا کر کہا اور میرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اس کے لئے اسکوائش بنا کر لائی تو وہ میرے بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ مجھے وہ اس سے بہت ہی پیارا لگا۔ یوں بھی اگر کوئی ہماری بات مان لے تو وہ پیارا لگتا ہی ہے۔ میں اسے یوں دیکھ رہی تھی، جیسے ذرّہ آفتاب کی جانب نظر اُٹھائے۔ میں کمرہ بند کر کے باہر آ گئی، مگر اُسے یہ کہنا نہ بھولی کہ جاگ جاؤ تو مجھے بلا لینا۔

اقتدار احمد سے باتیں کرنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ذرا سا خاموش ہوتا تو مجھے اُس کی خاموشی کھلتی تھی اور میں کہتی۔

"مجھ سے باتیں کریں نا۔ چپ نہ ہوا کریں۔"

شام کو سرور آیا تو گاڑی کے مخصوص ہارن پر اقتدار احمد بھی جاگ گیا۔ سرور گاڑی لاک کر کے اندر آیا۔

"السلام علیکم باجی!" سرور نے کہا۔ وہ ادھیڑ عمر کا شخص تھا، نہایت اچھا اور سلجھا ہوا۔

"وعلیکم السلام!"

"صاحب ہیں جی؟"

"چھوڑ گئے تھے؟" میں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو کہہ رہے تھے، یہیں ہوں گے۔"

"اچھا جی۔ اگر آئیں تو بتا دینا، میں گاڑی ہاسٹل چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" سرور مؤدب انداز میں بولا۔

"اندر میرے کمرے میں ہیں۔ آؤ۔" میں نے اسے کہا اور وہ میرے ساتھ اندر چلا آیا۔ اقتدار پلنگ کی ٹیک سے ٹکا سگریٹ پی رہا تھا، مسرور کو دیکھتے ہی بولا۔

"دیکھا مسرور! قید ایسی بھی ہوتی ہے۔ باندھ رکھا ہے، تمہاری باجی نے۔"

"مسرور! کوئی رسی نظر آ رہی ہے، جس سے یہ بندھے ہوئے ہوں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ جی، محبت کی ڈوریاں نظر نہیں آتیں، مگر بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ بندہ تڑا نہیں سکتا۔" مسرور آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مگر کوشش ضرور کرتا ہے۔" میں نے کہا تو اقتدار احمد ہنس دیا۔

"تم بیٹھو مسرور! میں چائے لاتی ہوں۔" میں نے اسے کہا مگر وہ مؤدب کھڑا رہا۔

"بیٹھو یار! اس وقت تم اپنی باجی کے گھر میں ہو۔ جب میں اس کا حکم مانتا ہوں تو تم بھی مانو۔" نہایت خوشگوار موڈ تھا، اقتدار کا۔ مسرور کرسی پر ٹک گیا اور میں ہنستی ہوئی کچن میں آ گئی۔

یونہی تابندہ کہتی ہے، مرد کا کوئی اعتبار نہیں۔ اب ہر مرد تو اشرف جیسا نہیں ہوتا نا۔

اُس روز اقتدار احمد رات کے ساڑھے نو بجے میرے پاس سے گیا تھا اور میرے اعتماد کے رنگ مزید پکے ہو گئے تھے۔ مجھے ساری باتیں جھوٹ لگنے لگی تھیں۔ سچ صرف وہ تھا، جو اقتدار احمد کے لبوں سے نکلا تھا۔

اقتدار احمد کے جانے کے بعد میں بڑے ہی خوشگوار سے سپنے بنتی رہی۔ اور پھر دو روز بعد ہی رضیہ باجی سے ملاقات ہوئی۔

"کیسی رہی، عمیر کی سالگرہ؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔"

"کون کون آیا تھا؟"

"اقتدار احمد اور ثمینہ بیگم نہیں آئے۔"

"اچھا!" میں نے آہستگی سے کہا۔ رضیہ باجی تو نانو سے باتوں میں معروف ہو گئیں اور میں جو دو روز سے خوشی کے ہنڈولوں میں جھول رہی تھی، ایک دم ہی زمین پر آ رہی۔

آخر ثمینہ وہاں کیوں نہیں گئی؟ کیا اقتدار احمد نے اسے منع کیا تھا؟ یا کوئی اور وجہ؟

میں جس قدر بھی سوچتی، اُلجھتی ہی چلی جاتی اور آخر میں نے اپنی اُلجھن اقتدار احمد کے سامنے رکھ دی۔

"یار! اگر وہ نہیں آئی تو میرا کیا قصور ہے؟ میں تو نہیں گیا۔ اب میں ذمہ دار تو نہیں کسی کا۔ ہو گی کوئی وجہ۔" حسب سابق اقتدار کی بات مجھے مطمئن کرنے کو کافی تھی۔

⊛......⊛......⊛

تُو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے اُلجھ جاتی ہیں

حسب معمول میں اقتدار احمد کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ مخصوص وقت پر آ گیا۔ مگر بہت جلدی میں تھا۔

"میں رحیم یار خان جا رہا ہوں، ضروری میٹنگ ہے کل۔"

"میٹنگ تو کل ہو گی، ابھی رات کو جانے کی کیا تک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ذرا بہاولپور ٹھہروں گا، ملک سلیم کے پاس، پھر صبح وہاں سے رحیم یار خان چلا جاؤں گا۔" اقتدار احمد کے چہرے پر اس قدر رونق تھی کہ اس کا رواں رواں کھلا جا رہا تھا۔

میں حیرت سے اس کے چہرے کو تکے گئی۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

مجھ سے محبت کے ابتدائی دنوں میں بھی اقتدار احمد کا چہرہ یونہی بارونق ہوتا تھا۔

"یہ گاڑی اور کیوں ہے؟" میں نے کھڑکی سے نئے ماڈل کی وائٹ ٹویوٹا کرولا کو دیکھا۔

"یہ میں نے اپنے دوست سے مانگی ہے۔ میری گاڑی پٹرول بہت کھا رہی تھی، وہ ورکشاپ دے آیا ہوں۔"

"مسرور کہاں ہے؟" ڈرائیور نہیں تھا، اس لئے میں نے پوچھا۔

"آج وہ چھٹی پر ہے۔" اقتدار احمد نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"آپ ڈرائیور کے بغیر جائیں گے؟"

"رانا حمید سے میں نے ان کا ڈرائیور مانگا ہے، اب جاتے جاتے اُسے پک کر لوں گا۔ اچھا، اب مجھے اجازت۔"

اقتدار احمد ایک دم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے روکنا چاہا مگر اسے تو بے حد جلدی تھی۔ اور وہ چلا گیا۔ میں دروازے کے پٹ سے ٹیک لگائے وسوسوں کے اندھے غاروں میں اُتر گئی۔

میری چھٹی حس مجھے بار بار کچھ کے دے رہی تھی۔

ضرور کوئی بات ہے، میری محبت تبھی تو سسک رہی تھی۔ دل میں دھڑ کے تتے طرح

طرح کے۔

وہ رات میں نے جس طرح کاٹی، میں جانتی ہوں یا پھر میرا خدا۔ بستر پر بھی مجھ سے نہ لیٹا جا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کانٹے اُگ آئے ہوں، جو میرے وجود کو چھید رہے تھے۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور دماغ کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

کب صبح ہوئی، مجھے خبر نہ تھی میرے لئے تو رات ہی سیاہ ناگن بن کر آئی تھی، جس نے لحہ بہ لحہ مجھے ڈسا تھا۔

ٹھیک دس بجے اقتدار احمد کا فون آ گیا۔

پہلے کبھی کہیں جا کر اُس نے مجھے فون نہ کیا تھا اور گزرے ڈیڑھ برس میں پہلی بار اس نے مجھے فون کیا اور جہاں وہ موجود تھا، وہاں کا فون نمبر بھی دیا۔

شاید وہ جان گیا تھا کہ میں اس کی طرف سے غیر مطمئن ہوں اور وہ مجھے مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ اس کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں تو میں بہت کچھ جاننے لگی تھی۔ کائنات کے چھپے ہوئے راز افشا ہوئے تھے اور وہ باتیں، جن کی مجھے بھی خبر نہ ہوئی تھی۔

میں، جو بات سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتی تھی، کبھی اُس کی گہرائی اور گیرائی کا نہ سوچا تھا۔ مگر اب تو اقتدار احمد کے لبوں سے کوئی جملہ نکلتا اور میں تجزیہ کرتی کہ اب یہی ایک مشغل رہ گیا تھا، مجھے۔

اقتدار احمد کے بتائے ہوئے نمبر پر میں نے خود رنگ کیا تو ایس پی طلعت علی نے فون کیا۔ وہ اقتدار احمد کے اچھے دوستوں میں سے تھے اور ایک بار میری ان سے اقتدار احمد کے آفس میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔

"اقتدار احمد سے بات کروا دیں۔"

"بھئی، مان گئے آپ کو، مس نورا!" طلعت علی بولے۔

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنی دُور بھی اقتدار کی خبر گیری بالکل بیویوں کی طرح رکھ رہی ہیں۔ ہولڈ کیجئے، میں بات کرواتا ہوں اس سے۔"

طلعت علی کے اس جملے پر میں سرخ پڑ گئی۔ کچھ بولا ہی نہ گیا۔

چند منٹ بعد اقتدار احمد کی بھاری اور چھا جانے والی آواز ایئر پیس کے ذریعے میری سماعتوں میں اُتری۔

"ہیلو!"

"واپسی کب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا ٹھنڈا دن ہو تو نکل چلوں گا۔"

"گاڑی میں تو اے سی ہے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہے۔"

"شام کو آئیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ نے کہیں جانا ہے؟"

"نہیں تو۔ یونہی کہہ رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، تو آپ تصدیق کرنا چاہ رہی تھیں کہ میں یہاں موجود بھی ہوں کہ نہیں۔"

"اب یہ بات بھی نہیں ہے۔"

"آپ طلعت سے پوچھ لیں کہ میٹنگ کتنی دیر رہی۔ کل نیوز پیپرز میں بھی خبر آئے گی۔"

"دیکھ لوں گی۔" میں نے کہا اور پھر لائن کٹ گئی۔ میرے دل کو اب تسلی ہو گئی تھی اور دل مطمئن کیا ہوا کہ میں بستر پر لیٹی اور نیند نے دبوچ لیا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، ایسی سوئی کہ خبر ہی نہ رہی۔ جاگی تو نہ جانے کب کی شام بھی ڈھل چکی تھی۔ میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا، جو دس بجا رہا تھا۔

میں فوراً باہر آئی۔ مائی وزیراں مجھے دیکھ کر بولی۔

"آج تو جی بہت سوئے ہو۔"

"مجھے جگا دیتیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے منع کر دیا تھا۔" نانو نے جواب دیا۔

"اقتدار تو نہیں آئے، نانو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" نانو نے جواب دیا۔

میں باتھ روم میں گھس گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو وزیراں کھانا لگا چکی تھی۔ میں اقتدار کا انتظار کرتے ہوئے کھانا کھانے لگی۔ مجھے یقینِ واثق تھا کہ وہ ضرور آئے گا کہ ہمیشہ سفر سے واپسی پر وہ میرے پاس سے ہو کر جاتا تھا۔ اب بھلا یہ روٹین کیسے بدلتی؟ مگر روٹین بدل چکی تھی۔

میں رات کے آخری پہر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ آسمان کے تارے بھی ڈوبنے لگے تھے........ مگر وہ نہ آیا اور مجھے تو وحشتوں نے گھیر لیا۔

ڈھیر ساری میں نے دعائیں مانگ لیں۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ سارے خیالوں پر ایک خیال حاوی تھا۔

کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔

یہ سوچ کر ہی میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہاسٹل بھی فون کیا، مگر کوئی رسپانس نہ ملا۔ میری حالت غیر تھی۔ صبح صادق نماز کے بعد میں نے پھر فون کیا تو پہلی بیل پر ہی ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

"ہیلو......!" اقتدار احمد کی نیند میں ڈوبی آواز میرے کانوں میں اُبھری۔

"تھینکس گاڈ!" میں نے اطمینان کی سانس لی اور کچھ کہے بنا ریسیور رکھ دیا کہ اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے سوچا، شاید آتے آتے بہت دیر ہو گئی ہو گی، اس لئے میری طرف نہیں آ سکا۔ انسان کیسی کیسی دلیلوں سے خود کو بہلاتا ہے نا۔ اور یوں بھی محبت کرنے والے تو ازحد بے وقوف ہوتے ہیں اور اپنی بے وقوفی کا احساس مجھے اس وقت ہوا، جب شام کو اقتدار احمد میرے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میں آ تو شام سات بجے ہی گیا تھا، مگر اس قدر تھکا ہوا تھا کہ آنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔"

مجھے لگا جیسے خوش گمانیوں کے سارے گلدان میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر کرچی کرچی ہو گئے ہوں۔

وہ، جو کہتا تھا۔

"نورا! میں کتنا ہی تھکا ہوا ہوں، آپ کے پاس آ کر، آپ کو دیکھ کر میری ساری تھکن اُتر جاتی ہے۔" اور آج وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تھکن کی وجہ سے نہ آ سکا۔

کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ...... کہ پہلے بھی جو کچھ کہا تھا، اسی نے کہا تھا۔ اور آج بھی جو کچھ کہا تھا، اسی نے کہا تھا۔ میں کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلا گیا اور میں اُسے روک بھی نہ سکی۔ مگر میرے دل میں پھانس چبھ گئی۔

اور پھر اقتدار احمد ٹریننگ کے سلسلے میں سہالہ چلا گیا۔ مگر جانے سے پہلے مجھ سے مل کر جانا نہ بھولا۔

پتہ نہیں، اس کی یہ کیسی محبت تھی، جو مجھے بھی مٹھی میں رکھتا تھا اور، اور جگہ بھی پینگیں بڑھاتا تھا۔

"تم نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا نا۔" میرے دل نے ہمیشہ کی طرح اُس کی طرف داری کی تھی اور میں پھر کچھ سوچ ہی نہ سکی تھی۔

⊛......⊛......⊛

اقتدار احمد کیا گیا کہ میری شامیں ہی بے رونق ہو گئیں۔ میں روز ہی دن اُنگلیوں پر شمار کرتی کہ اُن کی واپسی کی میں منتظر تھی۔ وہ اکثر فون پر بات کر لیتا اور مجھے لگتا جیسے مجھے زندگی مل گئی ہو۔

رضیہ باجی کبھی کبھار آ جاتی تھیں اور انہی سے ثمینہ کے بارے میں پتہ چلتا رہتا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اقتدار احمد سہالہ جانے سے پہلے طاہر بھائی کو کہہ گیا تھا۔

"ثمینہ کا خیال رکھنا۔"

مگر میں نے یقین نہ کیا کہ طاہر بھائی اُس سے ملتے ہی نہ تھے تو یہ بات بھلا اقتدار اُن سے کس طرح کہہ سکتا تھا؟

میں نے وقت گزاری کے لئے فلاور میکنگ کے کورس کی کلاسز لینی شروع کر دیں کہ اقتدار احمد کی غیر موجودگی میں وقت ہی نہ کٹتا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ کون سا میرے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ مگر پھر بھی میں اس کے آنے کا انتظار تو کرتی تھی۔ اور جب وہ ہو کر چلا جاتا تو مجھے پھر اسی وقت سے انتظار ہوتا، آنے والی شام کا۔ کتنے عجیب سلسلے ہوتے ہیں، عشق و محبت کے یہ تو اب خبر ہوئی تھی۔ اقتدار احمد کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی اور اتفاق تھا کہ اُس کی پوسٹنگ پھر ہمارے ہی شہر میں ہوئی تھی۔ اقتدار نے یہ خبر مجھے فون پر سنائی تھی۔ ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور دو روز وہاں رہ کر واپس آیا تو اسی شام میرے ہاں بھی آ گیا۔

دُوری نے محبت میں اتنا نکھار پیدا کر دیا تھا کہ مجھے لگا، جیسے اب پھر ہماری محبت کا ابتدائی دور شروع ہوا ہو۔

وہ مجھے بتاتا رہا کہ میں اُسے کتنی یاد آئی۔ اُس کا ایک ایک لفظ سچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

بہت خوش گوار موڈ میں تھا وہ اور میں وہ پھانس نکالنا چاہتی تھی، جو میرے دل میں چبھی گزرے تین ماہ سے مجھے تکلیف پہنچا رہی تھی۔

"اقتدار! آپ ایک بات سچ سچ بتائیں گے؟"

"جان! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولتا۔" وہ محبت سے بولا۔

"اچھا۔" میں نے کہا۔

"ہوں۔ بھلا اپنے پیاروں سے بھی کوئی جھوٹ بولتا ہے؟"

"میرے دل سے ایک بات نہیں نکلتی۔"

"پوچھیں۔" اس نے کھلے دل سے کہا۔

"اقتدار! آپ جس روز رحیم یار خان گئے تھے، اُس روز آپ کے ساتھ کون عورت گئی تھی؟" میں نے سوال داغا۔

"عورت.....؟" حیرت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ہاں۔" میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھیں، جھوٹ نہیں بولئے گا۔" میں نے کہا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"میرے ساتھ ثمینہ گئی تھی۔"

مجھے لگا تھا، جیسے چھت میرے سر پر آ گئی ہو۔ میں وحشت زدہ نظروں سے اقتدار احمد کو دیکھے گئی۔

"بس یہی کچھ سننا چاہتی تھیں نا آپ؟"

"پھر......پھر آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا؟" میری گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"یار! میں مذاق کر رہا تھا۔" اقتدار احمد نے کہا۔

"اتنا سنگین مذاق؟" مارے دکھ کے میری آواز نہ نکل رہی تھی۔

"میں آپ کو کبھی بتاؤں گا کہ سچ کیا ہے۔"

"پھر یہ بھی بتائیں گے کہ طاہر بھائی کو آپ کہہ کر گئے تھے کہ وہ ثمینہ کا خیال رکھے۔"

"ہاں، ہے نا وہ بہت بڑا لینڈ لارڈ، جس سے میں کہوں گا۔" اقتدار احمد کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ میں چپ ہو گئی۔ مگر میرے دل میں ایسا درد اُٹھا تھا، جو میرے پورے وجود پر مسلط ہو گیا تھا۔

"آپ تو کہتے ہیں کہ آپ نے اسے دیکھا تک نہیں۔"

"یہ تو اب بھی میں کہتا ہوں۔ وہ تو آپ تنگ کر رہی تھیں تو میں نے کہا، چلو کہہ دوں۔ چہرہ دیکھا ہے، جیسے کسی نے موت کی اطلاع دے دی ہو۔"

"میرے لئے یہ موت کی اطلاع سے کم بھی نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔

"میں ذرا سیٹ ہو جاؤں، پھر آپ کو ساری تفصیل بتا دوں گا کہ مجھے طاہر کیا کہتا تھا اور نجمہ بھابی کیا چاہتی تھیں۔ مطمئن رہیں آپ نورا! کہ اقتدار احمد صرف آپ کا ہے۔"

میرا ہاتھ تھام کر پھر وہ مجھے اعتبار کا امرت پلانے لگا اور میں نے ڈبڈبائی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تو صرف اتنا۔

"اقتدار! آپ میرا اعتبار مجھے واپس دے دیں۔"

"آپ کا اعتبار........آپ کے پاس ہے، نورا! یقین کریں، میرا۔ میں بدعہد نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو چاہا ہے، محبت ہی نہیں کی، عشق کیا ہے۔ کوئی بندہ در محبوب کے اتنے طواف نہیں کرتا، جس قدر میں نے کئے ہیں، پیاری لڑکی! اعتبار کرو میرا۔" اقتدار احمد کہہ رہا تھا اور میرے اعتبار کی نیا ہچکولے کھا رہی تھی۔

اقتدار احمد اب ایک دم ہی معروف ہو گیا تھا۔ اُسے اپنا ریذیڈنس بھی مل گیا تھا۔ مصروفیت کے باعث میری طرف کم ہی آتا تھا، مگر فون پر ضرور بات کر لیتا۔ میرا جی اسے دیکھنے کو بہت چاہتا تو میں اس کے آفس چلی جاتی، جو میرے فلاور میکنگ سینٹر سے بہت ہی قریب تھا۔ یونہی دو ہفتے گزر گئے۔

اُس روز بھی میں نے بہت خوب صورت سا گلدستہ بنایا تھا۔ ٹہنیوں پر چھوٹے چھوٹے پھول اور پتے تھے۔ میرا جی چاہا کہ یہ اقتدار احمد کی میز پر سجا دوں۔ اور راستے میں سے اس کے لئے گلدان بھی لے لیا۔ میں اس کے آفس چلی آئی۔ وہ خود ڈی۔سی کی طرف گیا ہوا تھا۔ اُس کے پی۔اے نے مجھے اُس کے آفس میں بٹھا دیا۔

"آپ بیٹھیں، صاحب آنے ہی والے ہوں گے۔" صادق مجھے بٹھا کر چلا گیا۔ میں نے پرس میں سے گلدان نکالا، اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی ٹہنیاں اس میں سجائیں اور اقتدار احمد کی بڑی سی میز کے دائیں جانب رکھ دیا۔ اور پھر واقعی تھوڑی دیر میں اقتدار احمد آ گیا۔

"میرے دفتر کی رونق آ گئی ہے۔" مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ تبھی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اقتدار نے ہاتھ بڑھا کر چونگا اُٹھایا۔

"اقتدار احمد اسپیکنگ۔"

"ہاں جی........خیریت تو ہے؟" وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"بس جی، لوگ کام کے لئے آتے ہیں نا۔"

"اچھا، طبیعت خراب ہے........ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟"

"معدے میں زخم...... اویں جی، ڈاکٹر غلط کہتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر تابش کو دکھائیں۔"

"ہاں، ہاں۔"

میں نے محسوس کیا تھا کہ اقتدار بہت سنبھل کر بات کر رہا ہے، اور میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا کہ دوسری جانب یقیناً کوئی عورت ہی ہے، ورنہ اس طرح کی گفتگو۔

"اچھا، آپ ایک بجے فون کریں۔" اقتدار نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اُدھر سے یقیناً یہ کہا گیا تھا کہ کیا کوئی بیٹھا ہے؟ تبھی تو اقتدار احمد نے کہا تھا۔

"ہاں۔" اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

"کس کا فون تھا؟"

"ایک دوست کا تھا۔ اور آپ سنائیں۔" اقتدار نے ایک دم ہی بات پلٹی۔

"اس جمعہ کو آپ فارغ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"آپ مجھے چناب پر لے چلیں۔"

"یار! بہت گرمی ہوتی ہے، اور......"

"میں جانا چاہتی ہوں۔ پھر آج کل تو بادل بھی چھائے ہوئے ہیں۔"

"پھر کبھی چلیں گے۔ یوں بھی اس جمعہ کو آئی جی صاحب یہیں ہوں گے، شام کی فلائٹ سے لاہور جائیں گے۔ اور ہمیں الرٹ رہنا پڑتا ہے۔"

"چلیں پھر اگلے جمعے۔" میں مان گئی۔

"ہاں...... اگر مصروفیت نہ تو۔" اس نے صادق کی لائی ہوئی فائل دیکھنی شروع کر دی۔ پیون میرے لئے چائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔

اقتدار نے کہا۔ "یار! یہ وقت تو کھانے کا ہے۔"

"پھر کھلا دیں کھانا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ وہ آرڈر دینا چاہتا تھا، مگر میں نے منع کر دیا کہ بھوک تو تھی ہی نہیں۔

اقتدار احمد بار بار وال کلاک کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے اُس کی بے چینی بہت کچھ سمجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

اور پھر ٹھیک ایک بجے اقتدار کے فون کی گھنٹی بجی۔ اقتدار نے لپک کر فون اٹھایا، جیسے کہ شدت سے انتظار ہو اس کال کا۔

"آپ ذرا آدھ گھنٹے بعد فون کریں۔"

"ہاں جی۔"

"نہیں، نہیں...... ضرور کرنا۔ میں آدھا گھنٹہ بیٹھا ہوں، انتظار کروں گا میں۔" اقتدار احمد نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"آپ بات کر لیتے۔ میں باہر چلی جاتی ہوں۔"

"اونہوں، اتنی اہم بات نہیں۔"

"اہم بات ہوگی، تبھی تو آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ضرور فون کرے۔" میرا لہجہ نہ جانے کیوں سخت ہو گیا تھا۔

"بھئی ایس ایچ او تھا۔ وہ چاہتا ہے، ایک مجرم کو چھوڑنا اور......"

"ایک معمولی ایس ایچ او سے اتنی محبت سے بات ایس پی کرے، دل نہیں مانتا۔" میں نے اقتدار احمد کی بات کاٹ کر کہا۔

"آپ بس شک ہی کرتی رہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ پھر میں مزید بیس منٹ اور بیٹھی اور اجازت لے کر باہر آ گئی۔ اقتدار احمد حسب سابق مجھے باہر تک چھوڑنے نہیں آیا۔ اور کیسے آتا؟ اُسے تو فون کال کا انتظار تھا۔ میں اُس کے پی۔اے صادق کے آفس میں آ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

"میں یہاں بیٹھنا چاہتی ہوں، مگر اقتدار صاحب کو پتہ نہ چلے۔"

"بہتر جی۔" اس نے کرسی جھاڑ دی۔

"صاحب کے ذاتی فون کی ایکسٹینشن ہے یہاں؟" میں نے صادق کی میز پر سجے چار عدد ٹیلی فونز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی، ہے۔" اس نے سفید فون کی طرف اشارہ کیا۔ بس مجھے اتنا پتہ کرنا تھا۔ میں وہیں بیٹھ گئی۔ مجھے انتظار تھا، اُس کال کا، جس کا اندر اقتدار بھی منتظر تھا۔

اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے دوسری گھنٹی بجنے کا انتظار کیا، مگر بے تابی اس قدر تھی کہ اندر اقتدار نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھا لیا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"کیا حال ہیں جناب؟"

"ٹھیک ہوں...... یہ کیا کہ ہر وقت بندے بیٹھے رہتے ہیں۔" دوسری نسوانی آواز اور لہجہ میں نے پہچان لیا تھا۔ نہایت اِٹھلا کر اس نے کہا تھا۔

"بس کیا کریں، مصروفیت ہی ایسی ہے۔ اور سنائیں، کیا حال چال ہیں؟"

"بس، چنگے حال ہیں۔ دل بہت اُداس تھا، میں نے کہا ذرا آواز سن کر ہی خوش ہو لوں۔"

"اچھا......" اقتدار احمد ہنسا۔ میں نے خون کا گھونٹ بھرا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "پھر جمعہ کا پروگرام پکا ہے نا؟"

"وہ میں نے بتایا تھا نا کہ آمنہ بیمار ہے، اسے میں لے کر حکیم کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

"مجھے بتا۔ دیکھ، میرا دن ضائع نہ کر۔"

"تم نے نور فاطمہ کی طرف جانا ہوگا۔" وہ بولی۔

"میں کہیں جاؤں، اگر آنا ہو تو بتا دے۔ میں نو بجے پہنچ جاؤں گا۔" اقتدار احمد کے لہجے کی بے چینی عیاں تھی۔

'مجھے کہا تھا کہ آئی جی شہر میں ہوگا، فرصت نہیں ہے۔' میں نے کپکپا کر سوچا۔

"ہاں......کوشش کروں گی۔"

"نہیں، وعدہ۔" اقتدار اس سے وعدہ چاہتا تھا۔

"کیا لڑنا ہے؟" وہ ہنسی۔

"لڑتی تو تُو ہے نا، تیرے تو لڑنے کا وقت مقرر ہے۔" اقتدار ہنسا۔

"میں لڑتی ہوں؟" وہ ادا سے بولی۔

"ہاں بہت۔ چل پھر جمعہ کو صبح نو بجے میں آ جاؤں گا۔ جتنا لڑنا ہو، لڑ لینا۔ جو کہنا ہو، کہہ لینا۔" اقتدار احمد نے نہایت بے تکلفی سے کہا اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ مجھے تو ساری کائنات گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگا تھا، جیسے میں عرش سے فرش پر آ گئی ہوں۔

کیسا دھوکا دیا تھا، اقتدار نے مجھے......میرا اعتبار کیا ٹوٹا، لگا جیسے میں ٹوٹ گئی ہوں۔

میری رگ رگ میں دکھ اُتر گیا تھا۔ میں ضبط نہ کر سکی اور اقتدار احمد کے آفس میں پہنچ گئی۔ وہ فائل دیکھ رہا تھا، مجھے دیکھ کر بولا۔

"آپ گئی نہیں؟"

"ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں، آپ کی زندگی سے۔"

"نورا کیا بات ہے؟" وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر میری طرف آیا۔

"اقتدار! اس جمعہ کو تو آئی جی صاحب کی موجودگی کے باعث آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔" اور میری آنکھوں میں مارے ضبط کے آنسو آ گئے اور آواز بھرّا گئی۔

"نورا! پلیز، رونا نہیں۔"

"اب میں نہیں روؤں گی، اقتدار!" میں نے ہونٹ کچلے۔

"ٹیک اِٹ ایزی، نورا! میں شام کو گھر آؤں گا تو سب کچھ بتا دوں گا۔" اقتدار احمد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا بتائیں گے؟ سب تو سن چکی ہوں، اقتدار! اب کیا رہ گیا ہے بتانے کو؟"

"آپ کو کچھ پتہ نہیں؟"

"مجھے سب علم ہے اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تو پھر شام کو میں نہ آؤں؟"

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں اُسے منع بھی نہ کر سکی اور ایک دم پلٹ کر اس کے آفس سے نکل آئی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں کس طرح کار ڈرائیو کر کے گھر پہنچی۔

میری محبت کی عمارت اعتبار، خلوص، سچائی اور احترام پر کھڑی تھی۔ یہ چار ستون میری محبت کی مضبوطی کے گواہ تھے اور سچائی کا ستون کیا گرا کہ پوری عمارت ہی ڈھے گئی۔ اب تک تو اقتدار احمد مجھ سے جھوٹ ہی بولتا رہا۔ اب جبکہ میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا تو سب کچھ بتانے پر راضی ہو گیا۔

"یا خدا!...... مجھے موت دے دے۔" دیوار سے سر ٹکراتے ہوئے میں بے حد، بے حساب روئی تھی۔ بھلا کوئی اس طرح بھی کرتا ہے؟ میں نے تو اقتدار احمد کو اپنا سب کچھ جانا تھا۔ میں نے کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں نے اُسے پوجنے کی حد تک چاہا تھا اور میری چاہت کا اُس نے اس طرح مذاق اُڑایا تھا۔ ایک کرپٹ عورت کو مقابلے میں لا کر مجھے دھوکا دیا، اس عورت کو مجھ پر ترجیح دی۔ آخر مجھ میں کس چیز کی کمی تھی؟

لوٹا ہے وہ پچھلے موسموں کو
مجھ میں کسی رنگ کی کمی تھی

ہاں......شاید کمی تھی۔

اقتدار احمد تو مجھے کہتا تھا۔

"نورا! آپ بہت خوب صورت ہیں، آپ میری ہیر ہیں، میری سوہنی ہیں۔"

"یہ آپ کا حُسنِ نظر ہے۔" میں ہنس کر کہتی۔

اور وہ مجھے جو حسین کہتا تھا، پتہ نہیں کون سے رنگوں کی خاطر؟ وہ ثمینہ بیگم کی طرف

بڑھا تھا اور مجھے اس بات کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

میں اس قدر روئی تھی کہ مجھے لگتا تھا، جیسے میرا وجود ہی آنسوؤں میں بہہ جائے گا۔

میرے جسم کی بوٹی بوٹی دُکھ رہی تھی۔

شام کو وہ آیا تو میں اُٹھ کر دروازہ کھولنے بھی نہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔ وہ سیدھا ہی میرے کمرے میں چلا آیا کہ اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نانو نے میری پسند اور ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ میں دیوار کی طرف چہرہ کئے لیٹی رہی۔

''نور! خفا ہیں آپ؟''

میں نے کوئی بھی جواب نہ دیا کہ میرے پاس تو سوائے آنسوؤں کے کوئی جواب نہ تھا۔

''نور......!'' نہایت دھیمے لہجے میں اس نے کہا۔ ''سوری نور! مجھے معاف نہیں کریں گی آپ؟'' آہستہ سے اس نے مجھے چھوا۔

''مت چھوئیں مجھے۔'' میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور ایک کونے میں سمٹ گئی۔

''نور! پلیز۔'' اقتدار احمد میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''مت بات کریں، مجھ سے۔'' میری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

''میں......میں وہی اقتدار ہوں۔ آپ کا اقتدار۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''نہیں، آپ میرے نہیں ہیں۔ اگر آپ میرے ہوتے تو ثمینہ بیگم سے اتنی بے تکلفی سے بات نہ کر رہے ہوتے۔''

''اچھا، میرا اُس سے لہجہ وہی تھا، جو آپ سے بات کرتے ہوئے ہوتا ہے؟'' اقتدار احمد نے پوچھا۔

''اتنی بے تکلفی سے تو آپ نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔''

''اس لئے کہ میں آپ کا احترام کرتا ہوں نور! اور آپ سے بے تکلف ہونے کی مجھ میں جرأت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو جس قدر چاہا ہے نا، نور! اتنا کسی مرد نے بھی کسی عورت کو نہ چاہا ہوگا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

پھر دُکھ بھی تو اتنا ہی دیا ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''میں کئی بار آپ کو بتانا چاہتا تھا نور! کہ اسے طاہر نے مجھ سے ملوایا تھا۔ کام تھا اس کا۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کیا کام تھا؟'' میں غرائی۔

''وہ چاہتی ہے، واپس اپنے بچوں میں جانا۔ اور وہ اللہ یار ڈوگر کی زندگی میں جس کوٹھی میں رہتی تھی، وہ اسی کے نام ہے اور وہ لینا چاہتی ہے۔ میں نے کہا کہ مدد کروں گا۔''

''اوّل تو یہ جھوٹ ہے کہ وہ کوٹھی اس کے نام ہے۔ ایک مرلہ زمین بھی اللہ یار ڈوگر نے اس کے نام نہیں کی کہ وہ اس کے کرتوت جانتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا تو دوستی کرنی ضروری تھی؟''

میرا لہجہ اور انداز خاصا تیکھا تھا اور اقتدار احمد بھی ضبط کر رہا تھا کہ سارے قصور اس کے جو نکل آئے تھے، ورنہ پہلے تو بھڑک اٹھتا تھا۔

''مگر میں نے وعدہ کیا ہے، اس کی مدد کروں گا۔'' وہ ڈٹا ہوا تھا۔

''آپ اس کی مدد نہیں کریں گے، اس کے اور دوست مر تو نہیں گئے نا۔ آپ ہی رہ گئے ہیں؟''

''میں نے وعدہ کیا ہے۔''

''تو پھر کریں مدد اُس کی۔ مگر مجھ سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔'' میں نے بھی فیصلہ سنا دیا۔

''نور! جذباتی نہ بنیں۔'' اقتدار نے مجھے سمجھایا۔

''نہیں اقتدار! میں......میں یہ برداشت کبھی بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے بتائیں آپ، جو مجھے اپنی زندگی، اپنی روح کہتے تھے، اس کی جانب کیوں بڑھے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟......مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے؟......کیا وہ مجھ سے زیادہ شریف ہے؟''

''وہ آپ کے پیروں کی خاک بھی نہیں ہے، نور!'' اقتدار نے کہا۔

''پھر اُس خاک کو آپ نے سینے سے لگا لیا۔''

''ایسی بات بھی نہیں۔''

''یونہی اُسے اپنے ساتھ رحیم یار خان لے گئے؟'' میں نے یاد دلایا۔

''میں اسے ساتھ لے کر یوں گیا تھا کہ اس نے منت کی تھی کہ اُس کی بہن خان پور میں رہتی ہے تو میں اُسے لیتا جاؤں۔ پھر اتفاقاً میٹنگ تھی، اور......''

''اُس کے فرشتوں کو پتہ چل گیا تھا کہ آپ رحیم یار خان جا رہے ہیں۔'' میں نے اقتدار احمد کی بات کاٹی۔

”نہیں، یہ پہلے طے ہو گیا تھا۔ اس نے ایک روز کہا تھا کہ وہ خان پور جانا چاہتی ہے اور میں نے کہا تھا کہ چھوڑ آؤں گا۔ پھر اتفاقاً میٹنگ کا بلاوا آ گیا تو میں اسے بھی لیتا گیا۔ مگر قسم لے لیں نورا! کہ وہ پیچھے سیٹ پر بیٹھی رہی تھی۔ میں کار ڈرائیو کرتا رہا اور میرے ساتھ ڈرائیور بیٹھا رہا۔“

”وہی ڈرائیور، جسے اُس کی سفارش پر آپ نے اپنے محکمے میں رکھوایا ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”پہلے تو آپ تسلیم نہیں کرتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”اب ہر بات میں کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ نے اس کا کہا کیوں مانا؟“

”یار! اس نے کہا تھا کہ ان لوگوں نے میری بہت خدمت کی ہے۔ آپ اس لڑکے کا اپائمنٹ کروا دیں، سو جگہ تھی، کروا دیا۔“

”آپ کا اس سے کیا رشتہ تھا، اقتدار! جو آپ نے اس کی بات مانی؟ ٹھیک ہے، ان لوگوں نے اس کی خدمت کی تھی تو آپ پر کون سا احسان تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اب قصور ہو گیا۔“

”کیوں ہوا قصور؟“

”میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں کہ پریشان لوگوں کی مدد میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ وہ کہتی ہے، وہ گزرے تین برس سے رُل رہی ہے، میاں کو بھی چھوڑ آئی ہے۔“

”اور بھی دنیا میں بہت سے پریشان لوگ ہیں۔ صرف وہی رہ گئی ہے؟“ میں تنک کر بولی۔ اب بھی آنسو میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

”صرف دو ماہ کی بات ہے نور! اس کا کام ہو جائے گا، اور.......“

”نہیں، نہیں اقتدار! دو ماہ نہیں، یہ دو صدیاں ہوں گی۔ بس آپ اُس کی مدد کریں اور مجھے چھوڑ دیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ اقتدار نے پوچھا۔

”تو پھر ثمینہ کو چھوڑ دیں۔“ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

”چلو، میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ کہہ دیتا ہوں اسے کہ آئندہ وہ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھے۔ میں اس کا کام نہیں کر سکتا۔“

اقتدار احمد نے میرے آنسو پونچھے۔

”میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، نورا! تجھ کو تو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

اقتدار نے میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور میں پلک پلک کر رو دی۔

”آپ.......آپ اُسے کہہ دیں گے؟“ میں سسکتے ہوئے بولی۔

”ہاں، کہہ دوں گا۔“

”میری قسم کھا کر کہیں۔“ میں نے کہا۔

”قسم نورا!“ اقتدار نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”مگر مجھے کیسے پتہ چلے گا؟“ میں اب بھی شک کے طوفان میں گھری تھی۔

”میرا انداز اور میرے اطوار آپ کو بتائیں گے۔“ وہ بولا۔

”نہیں.......آپ اس سے اب نہیں ملیں گے۔ فون پر کہہ دیں، میرے سامنے۔“

”اچھا چلیں، یونہی سہی۔ اور حکم؟“ اقتدار احمد نے میرے بہتے اشکوں کو اپنی پوروں سے صاف کیا۔ ”مت روؤ نورا! میرا دل پھٹتا ہے۔“

میں نے ضبط بہت کیا، مگر میرا دکھ اتنا بڑا تھا کہ میری آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں۔

”آپ مجھ سے لڑ لیا کریں، مگر رویا نہ کریں۔ اب رونا کاہے کا ہے؟ بھئی، کہہ تو دیا ہے کہ منع کروا دوں گا۔“

”اقتدار! میرا کوئی حق ہے نا آپ پر؟“

”ہاں سارے حق ہیں آپ کو۔ اگر حق نہ ہوتا تو یوں میں آپ کا فیصلہ مانتا اور نہ آپ مجھ پر فیصلے مسلط کرتیں۔ حق میں نے آپ کو دیا ہے، جبھی تو آپ میرا خون سُکھا دیتی ہیں، بے ایمان کہیں کی۔“

”پتہ ہے، مجھے کس قدر دکھ ہوا ہے۔“ میں نے ناک رگڑی۔

”احساس ہے مجھے۔ اور یوں بھی میں چاہتا تھا، آپ کو پتہ چل جائے۔“

”اگر خود بتا دیتے تو!“ میں نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا۔

”چلو، اب خاموش۔“ اقتدار نے میرے لبوں پر انگلی رکھ دی اور بولا۔ ”مسکراؤ۔“

تب میں دھیرے سے مسکرا دی اور پھر میں نے اقتدار احمد سے وعدہ کیا کہ وہ جمعہ کے روز نو بجے صبح میرے پاس آ جائے گا۔ اقتدار نے میری بات مان لی۔

دو روز بعد جمعہ تھا۔ جب کہ اقتدار احمد نے ثمینہ کو وقت دیا تھا اور جب جمعہ کی رات وہ میرے ہاں آیا تو میں نے سر جھکا کر اسے کہا۔

”آپ کل ثمینہ سے مل لیں۔“

”کیوں؟ ابھی پرسوں تو رو دھو کر منع کیا ہے۔ اور احمد کے مطابق کل صبح نو بجے مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔“ اقتدار نے کہا۔

”یہ درست ہے، مگر اقتدار! آپ کل نہیں جائیں گے، پرسوں چلے جائیں گے۔ اس سے اگلے روز چلے جائیں گے۔ میں کہاں تک آپ پر پہرہ دوں گی؟ میں دوبارہ اپنے اعتبار کی عمارت بنانا چاہتی ہوں، اور پہلی اینٹ رکھوں گی۔ آپ کہہ رہے تھے نا کہ اسے خود جا کر منع کر دیں گے تو ایسا ہی کریں۔“

”سوچ لیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، آپ جائیں۔“ میں نے کھلے دل سے کہا اور اقتدار احمد مسکرا دیا۔

اگلے روز جمعہ تھا اور اقتدار احمد نے ثمینہ سے ملنے جانا تھا۔ اور جب نو بجے تو مجھے لگا تھا، جیسے کسی نے میرا دل نوچ لیا ہو۔ بے اختیار ہی میرے آنسو تکیوں میں جذب ہو رہے تھے کہ خود ہی اجازت دے کر میں آنسو بہا رہی تھی۔

تبھی نانو چلی آئیں۔

”میں تابندہ کے ہاں چلی جاؤں، نانو؟“

”جاؤ، دل بہل جائے گا۔“ انہوں نے مجھے خوشی سے اجازت دے دی۔ میں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اپنی سوزوکی کی چابی اٹھائی اور کپڑے بدلے بغیر ہی تابندہ کی طرف چل دی۔ مین روڈ پر ہی مجھے وائٹ کرولا میں اقتدار احمد نظر آیا۔ میں نے وقت دیکھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ اقتدار نے مجھے نہ دیکھا۔

تو اس کا مطلب ہے، اقتدار اب واپس آ گیا ہے۔ مگر اتنی جلدی؟...... میں تابندہ کی طرف چلی آئی مگر دل کو ذرا اطمینان تھا کہ وہ واپس تو آ گیا ہے۔

تابندہ کو بھی ساری تفصیل میں نے بتا دی تھی کہ مجھ پر کیا پہاڑ ٹوٹا ہے۔

”دیکھ نور! اسے واقعی تجھ سے محبت ہے۔“ تابندہ نے کہا۔

”اچھا یار! چھوڑو، مجھے اچھی سی چائے پلاؤ اور عطاء اللہ کا وڈیو کیسٹ منگوا کر دکھاؤ۔“ میں نے موضوع بدلا۔

”دونوں چیزیں ابھی حاضر کرتی ہوں۔“ تابندہ کورنش بجا لائی۔ میری دوست مجھے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر عطاء اللہ نیازی کے گیتوں نے تو مجھے اور بھی دُکھی کر دیا۔ اس کے گیت کا ایک بول مجھے اندر، بہت اندر تک رُلاتا رہا۔ اور جب میں تابندہ کے ہاں

سے اُٹھی تو شام کے سوا چھ بج چکے تھے۔ گلی کا موڑ مڑی ہی تھی کہ سامنے رکشہ کھڑا تھا۔ میں نے ہارن دیا تو رکشہ سے اُترنے والی خاتون نے گردن ترچھی کر کے مجھے دیکھا۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مکمل کِٹ میں میک اپ کئے ہوئے وہ ثمینہ تھی جو کہ سفید گیٹ والے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ رکشہ والے نے مجھے رستہ دیا اور میں نے کار آگے بڑھا دی۔

کیا یہ رُلنے والی عورتوں کی شکل ایسی ہوتی ہے؟

اقتدار احمد نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ تین برس سے رُل رہی ہے۔ میری سوچوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ گھر آنے کے بعد میں نے نہا کر اپنا بہترین جوڑا زیب تن کیا، ہلکا ہلکا میک اپ بھی کیا اور اقتدار احمد کا انتظار کرنے لگی۔ اندھیرا پھیلنے پر وہ آ موجود ہوا۔ نہایت پژمردہ سا وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ نہایت خاموش سا اور میں اسے دیکھے جا رہی تھی کہ کب بات شروع کرتا ہے۔ آخر میں نے خود ہی کہا۔

”آپ مل آئے ثمینہ سے؟“

”ہاں...... آپ نے مجھ سے بہت بڑا ظلم کروایا ہے۔“

اور پھر اقتدار احمد نے بہت کچھ کہا۔ وہ تو ثمینہ کے رونے پر دُکھی تھا، میرے آنسوؤں کا تو اُسے دکھ نہ تھا۔ کس قدر دوغلا ہوتا ہے مرد۔ اور پھر جاتے جاتے مجھے کہہ بھی گیا کہ آئندہ نہیں آؤں گا۔ تو...... تو اقتدار احمد! تمہیں دُکھ ہوا ہے نا، اُس سے قطع تعلق کرنے کا؟ جبھی تو تم نے مجھ سے بھی تعلق توڑنا چاہا ہے۔ میرے گھر نہیں آؤ گے، اس کا مطلب تو یہی ہے نا؟

ہاں اقتدار! میں تمہیں دُکھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں تمہیں اپنی محبت کے حصار سے آزاد کر دوں گی۔ میں ٹیرس سے نیچے اپنے کمرے میں آئی اور رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر پہلی بار اقتدار احمد کو میں نے خط لکھ ڈالا۔

”اقتدار احمد!

وہ تعلق اور وہ رشتہ، جو آپ نے اپنی خواہش پر جوڑا تھا، مجھ سے دوستی کی آپ نے درخواست کی تھی، میرے ساتھ چلنے کے آپ آرزومند ہوئے تھے۔ میں جو محبت کے جذبے سے ناآشنا تھی، آپ نے مجھے اس جذبے سے آگہی دی اور آگہی عذاب ہے، محبت اس سے بڑا عذاب جو صرف آگ ہی آگ ہے۔ پتہ نہیں، کن لوگوں کے لئے یہ گلزار ہوئی ہو گی۔ انجام تو صرف آگ ہے کہ بندہ

جلتا رہے، جھلستا رہے۔ رات آپ کہہ رہے تھے کہ میں نے آپ سے ظلم کروایا ہے۔ شاید ایسا ہو، لیکن آپ جو کہتے تھے کہ مجھے آپ پر سارے حق اور سارے اختیار ہیں، میں نے تو وہی اختیار استعمال کیا اور آپ کے نزدیک ظلم کروایا۔ تو اقتدار! میں ظالم نہیں بننا چاہتی۔ میں صدقِ دل سے آپ کو اجازت دیتی ہوں کہ آپ ثمینہ کی طرف لوٹ جائیں۔ یہ نہ ہو، تاعمر اس کا لہجہ آپ کے کانوں میں گونجتا رہے۔ اس کے آخری الفاظ آپ کے دل کو چھیدتے رہیں۔ آپ کہتے ہیں، آپ کو اس سے محبت نہیں ہے، تو پھر یہ دُکھ کیسا؟ ہمیں دُکھ اُس شخص کی تکلیف پر ہوتا ہے، جس کے لئے ہم اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہوں۔ انسانیت ونسانیت صرف فرضی باتیں ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ سے آئندہ میری وجہ سے مزید ظلم ہوں، اس لئے اقتدار! میں آپ کو اپنی محبت کے حصار سے آزاد کرتی ہوں۔ ہاں اقتدار! میں نے تو آپ سے ملنے کے بعد یہی سمجھا تھا، آپ میرا سب کچھ ہیں۔ اور آپ کے بعد صرف اور صرف دیوار ہے۔ اب بھی میں یہی کہتی ہوں، آپ نہیں تو کوئی اور بھی نہیں۔ آپ دس برس بعد بھی پلٹ کر دیکھیں گے تو نور فاطمہ یہیں کھڑی ہو گی، جہاں آپ نے اسے چھوڑا ہے۔ مگر وہ پھر بھی یہ نہ چاہے گی کہ اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد آپ واپس پلٹ آئیں۔

ہاں اقتدار احمد! میں نے آپ کو اپنی محبت کے حصار سے آزاد کیا۔
اپنی محبت کے حصار سے آزاد کیا۔

فقط۔ نور فاطمہ۔''

راستہ تو اقتدار بھی شاید بدلنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے وعدے اور دعوے شاید اس کی راہ کا روڑا تھے۔ اور اب میں نے خود ہی اسے آزاد کر دیا تھا۔ مگر میں نے اس کی محبت کا طوق اپنے گلے سے نہ اُتارا تھا اور نہ ہی اُتارنا چاہتی تھی کہ وہ بدلا تھا، میں تو نہیں بدلی تھی۔ اُسے اپنی محبت کے حصار سے آزاد کر کے میں بھی رو دی تھی۔ میں تو اقتدار احمد کو دُکھی نہ دیکھ سکتی تھی، کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ جبکہ وہ بھی تو میری محبت کا دعویدار تھا، پھر بھی مجھے دُکھ دے کر نہ جانے وہ کیسے مطمئن رہتا تھا۔

گھر آئی تو نانو نے بتایا، اقتدار احمد آیا تھا۔ میں نے کوئی توجہ ہی نہ دی۔
شاید اسے میرا پروانہ آزادی نہ ملا تھا، تبھی تو آ گیا تھا۔ اور پھر خود ہی تو اس نے کہا

تھا کہ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔

''اور تم نے بھی تو کہا تھا، بے شک آپ نہ آئیں، میں مخصوص وقت پر آپ کا انتظار کروں گی۔'' میرے قریب ہی سرگوشی اُبھری۔

''بکواس تھی۔'' میں نے اپنے دل کو ہی جھڑک دیا۔ اور وی سی آر لگا کر فلم دیکھنے لگی کہ جب سے اقتدار احمد میری زندگی میں آیا تھا، میں نے سارے شغل ہی چھوڑ دیئے تھے۔ نہ فلم دیکھتی تھی اور نہ ہی بازاروں میں رُل رُل کر شاپنگ کرتی تھی۔ تابندہ کہتی تھی، خود بھی خوار ہوتی ہے اور مجھے بھی کرتی ہے۔ وہ تھک جاتی تھی، جبکہ کبھی کچھ نہ خریدنا ہوتا تو میں تابندہ کے ہمراہ ونڈو شاپنگ ہی کر لیتی تھی۔ اقتدار احمد کی محبت میں تو میں نے خود کو ہی مٹا ڈالا تھا۔

نانو نے بتایا، اقتدا کا فون دو تین بار آ چکا ہے۔ میں نے کہا۔

''اب بھی آئے تو کہہ دیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔''

حالانکہ دل تو چاہا تھا کہ فوراً فون کروں۔ مگر یہ تو میری انا کی توہین تھی۔ اور....... اور پھر اقتدار احمد نے میری بے عزتی کی تھی۔ یعنی میرے ہوتے ہوئے اس نے اور جگہ کمند ڈالی تھی۔

وہ جملے جو وہ مجھ سے بولتا تھا، یقیناً اس سے بھی بولے ہوں گے۔

اور یہی سوچ سوچ کر تو میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ مجھے کس طرح بہلاتا رہا۔ یا خدا! کیا مرد اس طرح کے چلتر بھی کھیلتا ہے؟

میری محبت میں آخر کمی کیا تھی؟

کبھی میں نے اقتدار سے کوئی لالچ یا طمع نہ کیا تھا۔ اگر وہ کبھی لاہور جاتا تو میرے لئے سوٹ، پرس اور سینڈل لئے پھرتا اور میں منع کرتی رہ جاتی۔ مگر وہ میرے لئے گفٹ ضرور لاتا۔ جب بھی بہاولپور جاتا، میرے لئے کھُسّے لے آتا۔ اسے پتہ تھا، مجھے کھُسّے بہت اچھے لگتے ہیں۔ بے شک اس نے مجھے بے حد، بے حساب چاہا تھا۔ مگر اس نے دکھ بھی ایسا دیا تھا کہ میں بہت بلندی سے نیچے آ رہی تھی، مجھے لگتا تھا، جیسے میں ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔

مجھے افسوس تو یہ بھی تھا کہ وہ ثمینہ کے خلاف کوئی بات بھی نہ سنتا تھا۔ وہ سچی تھی اور میں جھوٹی۔

اُسی شام کو اقتدار احمد آ گیا۔ مخصوص ہارن کی آواز پر میرا دل بہت زور سے دھڑکا

اور جو دو روز سے میں اپنی انا کے مضبوط حصار میں خود کو جکڑے بیٹھی تھی، وہ تو ریت کی دیوار ثابت ہوا، فوراً ہی ڈھے گیا۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا کہ جب تک میں دروازہ نہ کھولتی تھی، وہ اندر نہ آتا تھا۔

''غصہ ختم کرو۔'' وہ مجھے دیکھ کر بولا۔

''ہر شے اپنی جگہ پر، گھر آئے مہمان کا استقبال تو کرنا ہوتا ہے۔'' میں راستے سے ہٹی۔

''یہ گھر میرا ہے، میں مہمان نہیں ہوں، یہ بات نوٹ کر لیں۔'' اس نے کہا۔

''کہاں غائب تھیں کل شام کو؟'' وہ میرے ساتھ ٹیرس پر آ گیا۔

''میں نے کبھی آپ سے پوچھا تھا، کہاں غائب رہتے ہیں۔ ہر چھٹی کے دن، عید کے روز بھی جب آپ نے کہا کہ گھر جاؤں گا اور آپ شہر میں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں آئے تھے۔ میں نے تو وضاحت نہ چاہی تھی۔'' میرا لہجہ تلخ تھا۔

''یار! ایک سلسلہ ختم ہو گیا اور آپ پھر بھی۔ پھر یہ کیا لکھا ہے مجھے؟'' اقتدار احمد نے وہ خط جیب سے نکال کر پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

''وہ بات جو آپ نہ کہہ سکے، میں نے کہہ دی ہے۔ آپ آزادی چاہتے تھے اور میں نے آپ کو آزاد کر دیا۔''

''مگر میں نے یہ کب کہا تھا کہ مجھے آزاد کریں؟'' اقتدار نے پوچھا۔

''کہا نہیں، یہ چاہا تو تھا۔ آپ مجھ سے چھپ چھپ کر اب کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ اب آپ آزاد ہیں۔ جائیں، ثمینہ کی طرف۔ وہ مجھ سے بہت اچھی ہے نا؟''

''نورا! یہ میں مانتا ہوں کہ میں نے آپ کو دکھ دیا ہے۔ میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا، اب پھر کہتا ہوں کہ اپنا موازنہ ثمینہ سے نہ کریں۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ آپ کے قدم بھی چھوئے۔ ایسی عورتیں بہتی ندیاں ہوتی ہیں۔ کہیں نہیں ٹھہرا کرتیں۔''

''یہ ڈائیلاگ کون سی فلم کا ہے؟'' میں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''ایک رسالے میں پڑھا تھا اور اپنی کتابِ محبت میں نوٹ کر لیا۔ بتائیں، کیوں آزاد کیا ہے مجھے، اپنی محبت کے حصار سے؟''

''میری مرضی۔ آپ کو مجھ سے محبت جو نہیں رہی۔''

''آپ کو پتہ ہے، مجھے آپ کی محبت کے حصار میں کس قدر سکھ ملتا ہے۔ میں یہاں یونہی تو نہیں آتا۔ اپنے سکھ چین کے لئے آتا ہوں۔ میں اگر کبھی نہ بھی آؤں،

چاہے شہر میں ہوں یا شہر سے باہر، شام کو میں یہیں ہوتا ہوں۔ جسمانی طور پر نہ سہی تو روحانی طور پر ہی سہی۔ کتنی بھی مصروفیت ہو، کتنے بھی اہم کام والے لوگ بیٹھے ہوں میرے پاس، میں اندھیرا پھیلنے پر انہیں جلد از جلد نمٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ یہ میری محبت نہیں، عشق ہے۔ اور آپ کہتی ہیں، محبت نہیں رہی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرا احساس نہیں کیا، میری بے عزتی کی ہے، ثمینہ سے دوستی کر کے۔''

''جان! آپ کا احساس مجھے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بس جان لو کہ میں پلٹ آیا ہوں۔'' وہ بولا۔

''اور اگر آئندہ گئے تو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہر سزا دے دینا، آپ کے اختیار میں ہوگا۔ اگر پتہ چل جائے تو۔ مگر ہاں، پہلے معافی تو مانگو۔''

''کیسی معافی؟'' میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کہ مجھے آزاد کیوں کیا؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''لو بھلا، معافی کیوں مانگوں؟ میں حق پر ہوں۔'' میں تنک کر بولی۔

''معافی تو آپ کو مانگنی پڑے گی۔'' وہ وثوق سے کہہ رہا تھا۔

''میں نہیں مانگوں گی معافی۔'' میں ڈٹی ہوئی تھی اپنی بات پر۔ ''فرض کریں، جیسی غلطی مجھ سے ہوتی تو؟''

''میں گولی مار دیتا۔'' بے ساختہ اقتدار نے کہا۔ ''مگر آپ اتنی اچھی ہیں کہ آپ غلطی نہیں کر سکتیں۔''

''فرشتہ ہوں نا؟'' میں چڑ کر بولی۔

''ویسے نورا! آپ ہیں پوری بلا، ایمان سے۔''

میں ہنس دی۔

پھر میں مقدمے کی نقل لے آئی۔ مگر اقتدار نے نہ پڑھی۔ بلکہ یہی پوچھا کہ کیا لکھا ہے اور میں نے اسے چیدہ چیدہ ساری بات بتا دی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموش رہا۔

پھر میں نے محسوس کیا تھا کہ اقتدار اب واقعی واپس لوٹ آیا ہے۔ اب ثمینہ اسے فون کرتی تو مجھے بتا دیتا کہ میں نے کس طرح اسے جھڑک دیا ہے۔

کبھی نہ آسکتا تو مجھے پوری تفصیل بتا دیتا کہ کہاں اور کیوں گیا تھا۔ اور میں دل ہی دل میں ہنستی رہتی۔

''میں نے کب پوچھا ہے آپ سے؟''

''میں نے اپنا اعتماد بحال کرنا ہے، نور! ویسے تو میں آزاد ہوں۔'' وہ مجھے چڑاتا۔

''آزاد ہیں آپ؟'' میں کہتی۔

''بالکل...... بڑا سنبھال کے وہ پروانۂ آزادی میں نے رکھا ہے، لاکرز میں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ کیا سکھ ہے آزادی کا۔'' اقتدار آنکھیں موند لیتا اور میں سوچتی، آزاد ہو کر بھی پابند سمجھنا اعلیٰ ظرفی ہے۔

اس روز چھٹی تھی اور اقتدا آ گیا۔ لنچ کا وقت تھا۔ میں اس کے لئے کمرے ہی میں کھانا لے آئی۔ تب کھانا کھاتے ہوئے اس نے کہا۔

''کل میں چوک بازار سے گزر رہا تھا تو نواز کلیار میری جیپ کے سامنے آ گیا۔''

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''کہہ رہا تھا، ثمینہ اس کے ہاں آئی تھی۔ رات کو رہی اور چار ہزار روپے چرا کر لے گئی۔''

''کیسے؟'' میں حیران تھی۔

''عورتوں کی عادت ہوتی ہے ناکہ تکیوں میں روپے رکھ دیتی ہیں۔ بس غلطی سے وہ تکیہ، نواز کی بیوی نے اسے دے دیا۔''

''پھر کیسے پتہ چلا؟''

''کہہ رہا تھا، صبح صبح اُٹھ کر چلی گئی۔''

''آپ کو بتانے کا مقصد؟''

''اس نے کہیں کہا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی۔ میری گواہی تو ایس ایس پی اقتدار احمد بھی دے سکتا ہے۔ اور یہ کہ کسی بینک میں اس کے ایک لاکھ دس ہزار روپے پڑے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے رقم دلوا دیں۔'' اقتدار احمد نے مجھے تفصیل بتائی۔

''پھر آپ نے کیا کہا؟'' میں نے اقتدار کو دیکھا۔

''میں نے کہہ دیا کہ میرا اس سے کیا تعلق؟ میں تو اس سے ایک بار ہی ملا ہوں۔ اور مجھے کیا پتہ کہ یہ کہانی سچ بھی ہے یا نہیں۔''

میرا جی چاہا، اقتدار احمد سے کہوں کہ ابھی تو آپ کو ایک چوک پر روکا گیا ہے، پتہ

نہیں کہاں کہاں آپ کو روکا جائے گا۔ اور رہی رقم کی بات تو یقیناً اس نے اٹھالی ہو گی کہ ایک بار جو شوہر کی چوری کر لی تھی تو یہ کون سی مشکل ہے۔ میرے ذہن میں تین چار سال پرانا واقعہ تازہ ہو گیا۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا کہ اقتدار نے کون سا اعتبار کرنا تھا۔

''آپ نواز کلیار کو جانتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آنا جانا ہے آپ کا؟'' اقتدار احمد مجھے کرید رہا تھا۔

''عرصے سے نہیں گئے ہم۔ تقریباً آٹھ دس ماہ پہلے اس کا بیٹا جل گیا تھا تو نانو گئی تھیں، پھر نہیں گئے۔ کیوں؟''

''یونہی میں نے پوچھا ہے۔'' اقتدار احمد ٹال گیا۔

اقتدار احمد چھٹی پر گاؤں چلا گیا تھا اور تین چار روز کا کہہ کر گیا تھا۔ مگر پورے ایک ہفتہ بعد لوٹا تو بے حد خوش تھا۔

''بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔'' اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر میں نے کہا۔

''تجھے جو دیکھ لیا ہے۔'' یہ انداز، یہ بے تکلفی جو میں چاہتی تھی، ہونی چاہئے تھی، ایک دم ہی ہوئی تو میں حیرت زدہ رہ گئی۔

''ہاں، نور جان! میں بہت خوش ہوں۔ وہ جنگ، جو میں مسلسل دو سال سے لڑ رہا تھا، جیت گیا ہوں۔''

''کیسی جنگ؟'' میں حیران تھی۔ تب اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔

''تم بہت اچھی ہو نور! کہ تم نے صرف مجھے چاہا ہے، باوجود اس کے کہ میں نے نانو سے بات کر لی تھی۔ تمہیں کبھی یہ نہ بتایا کہ میں شادی میں دیر کیوں کر رہا ہوں۔ نہ تم نے کبھی پوچھا کہ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی تھی۔ لیکن تم سوچتی تو ہو گی۔''

'کیوں نہیں سوچا، اقتدار احمد!' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

وہ کہہ رہا تھا۔

''میری پھپھوزاد مریم میری ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ ہمارے ہاں، خاندان سے باہر شادی کا تصور بھی نہیں ہے۔ میری دو چھوٹی بہنیں پھپھو کی بہوئیں ہیں اور ان دونوں کے بدلے میں پھپھو کی اکلوتی اور اَن پڑھ مریم میرے پلّے بندھی تھی اور مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر یہ تم سے ملنے سے پہل کی بات ہے۔ پہلے تو مجھے مریم قبول تھی، مگر...... ہاں نور! مجھے اعتراف ہے کہ تم سے ملنے کے بعد کوئی نظر میں جچا ہی نہیں۔ تمہارے انداز د

اطوار، تمہاری شرافت اور سب سے بڑھ کر تمہاری محبت نے مجھے جکڑ لیا اور میں نے اسی روز تم کو اپنی ہمسفر بنانے کا سوچ لیا۔ دن بہ دن میں تمہاری محبت کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ پھر میں نے تمہاری نانو کو بھی ساری بات بتا دی اور کہہ دیا کہ آخری سانسوں تک میں یہ جنگ لڑوں گا۔ کیونکہ میرا باپ کبھی بھی اپنی بھانجی پر تم کو ترجیح نہ دیتا۔"

"تبھی نانو، اقتدار کے آنے پر چڑتی نہ تھیں۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"میں نے گھر میں بس اتنا ذکر کیا تھا کہ مریم کو نہیں اپنا سکتا تو جو جھگڑے اور فساد ہوئے، وہ بیان سے باہر ہیں۔ میری تیز طرار پھپھو نے میری دونوں بہنوں کو ہمارے گھر بھیج دیا۔"

"پھر......؟" میں چونکی۔

"مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ میں نے کہہ دیا کہ اگر میری بہنوں کے لئے اپنے گھر کی خوشی اتنی ہی تھی تو میں مقدر سے تو نہیں لڑ سکتا۔ میں ساری زندگی بہنوں کو اور ان کے بچوں کو سپورٹ کرتا رہوں گا۔ نہ لے جائیں میرے بہنوئی انہیں۔"

"مجھے آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"فضول میں تم پریشان ہوتیں۔"

"اب کیسے مانے وہ؟"

"اب میں مریم سے ملا اور اسے صاف صاف کہہ دیا کہ کیا وہ چاہتی ہے کہ اسے گھر تو ملے اور گھر والے کی محبت کو وہ سدا ترستی رہے تو میں شادی کرتا ہوں۔ تب ہی میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنے والدین سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اگر اسے مجبور کیا گیا تو وہ خودکشی کر لے گی۔ تب میری پھپھو مان گئیں۔ وہ لوگ میری بہنوں کو پورے پونے دو سال بعد گھر لے گئے ہیں کہ میرے بہنوئیوں کی بھی خواہش تھی۔ مگر ماں سے کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور اب کی یہ تازہ خبر بھی سنو کہ میرے والدین آج میرے ساتھ ہی آئے ہیں، مریم بھی آئی ہے۔ کل شام کو وہ سب یہاں آئیں گے۔ خوب مدارات کرنی ہے تم نے۔" وہ نہایت رعب اور محبت سے بول رہا تھا۔

"نانو کو بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"جی جناب! انہیں میں نے گاؤں سے آتے ہی فون پر اطلاع دے دی تھی۔"

"مجھے تو نہیں بتایا انہوں نے۔" میں واقعی بے خبر تھی۔

"میں نے منع کیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ خوشخبری میں خود تمہیں سنا کر تمہارے چہرے کے وہ رنگ دیکھنا چاہتا تھا، جن کی عرصے سے مجھے خواہش تھی۔ تم خوش ہو نا نور؟"

"ہوں......" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک بات تو بتائیں۔" میں نے کہا۔

"پوچھو۔" وہ بہت خوش تھا۔

"آج اس قدر بے تکلفی سے آپ بات کر رہے ہیں۔ کیا اب آپ میرا احترام نہیں کرتے؟"

"جان! یہ بھی تیرا احترام ہے۔ بس، یہ بھی میں نے عہد کیا تھا خود سے کہ جب تک تجھے اپنانے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں تجھ سے بے تکلفی سے بات نہیں کروں گا۔ اس طرح ایک متانت آمیز فاصلہ بھی تو رہتا ہے نا۔ پھر نور! وہ کوئی بہتی ندی تو نہ تھی، جس سے تھکا مسافر پیاس بجھائے اور راہ لے۔ تُو تو آب حیات ہے، جسے پی کر زندگی ملتی ہے۔ اور میں زندگی چاہتا تھا۔" اقتدار احمد نے میرا ہاتھ تھپکا۔

"اقتدار! اب تو کہیں نہ جاؤ گے؟" میں نے اس کا ہاتھ لبوں سے لگایا اور اُس کی روشن روشن آنکھوں میں دیکھا۔

"ناں بھئی، توبہ۔ یہ بلا ہی ایسی چمٹی ہے کہ......مگر نہیں یار! میں تو آزاد ہوں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت ہی شرارت تھی۔

"کیا کہا؟...... مار ڈالوں گی تمہیں۔" میں نے مُکا لہرایا تو اقتدار احمد نے میری کلائی تھام لی اور مجھے لگا، جیسے اقتدار احمد نے وہ چار ماہ، جو مجھے دکھ دیئے تھے، شادی کے فیصلے سے سارے دُکھوں کا ازالہ کر دیا ہو۔

(تمت بالخیر)